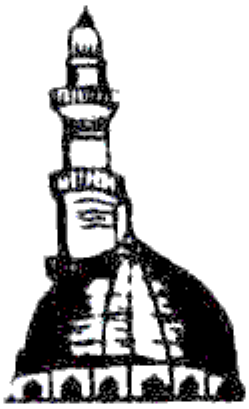
حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ کا مجموعہ

مواعظ اشرفیہ

حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مکتبہ تھانوی دفتر رسالہ الابقاء
مولوی مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱
فون: ۷۷۷۷۶۲۰، ۷۷۷۰۰۹۴

رسالہ الابقاء جلد ۷، نمبر ۱
جمادی الاولیٰ ۱۴۰۶ھ مطابق جنوری ۱۹۸۶ء



قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

التبلیغ

کا

وعظ مسمّٰی بہ

ذکر الرسول صلی اللہ علیہ وسلم

ملقب بہ

المرتع فی الربیع

منجملہ ارشادات حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ❁ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ۔ بندر روڈ۔ کراچی

فون: ۷۲۷۵۲۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ مسمّٰی بہ

ذکر الرسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

ملقب بہ

المربع فی الربیع

این	متی	کم	کیف	لما ذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد کانپور	۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ یوم جمعہ	۲ گھنٹہ	بیٹھ کر	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق کا بیان	حکیم محمد یوسف صاحب بجنوری	۵۰۰	

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ اما بعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰہُ لَہٗ رِزْقًا ○ (خدا تعالیٰ نے تمہارے پاس ایک نصیحت نامہ بھیجا وہ نصیحت نامہ دیکر ایک ایسا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھیجا جو تم کو اللہ تعالیٰ کے صاف صاف احکام پڑھ پڑھ کر

سُناتے ہیں تاکہ ایسے لوگوں کو جو ایمان لائیں اور اچھے عمل کریں تاریکیوں سے نور کی طرف آئیں جو شخص اللہ (تعالیٰ) پر ایمان لاویگا اور اچھے عمل کریگا خدا (تعالیٰ) اس کو ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بلاشک اللہ (تعالیٰ) نے بہت اچھی روزی دی) یہ ایک بڑی آیت کا ٹکڑا ہے اسی کی تلاوت پر اس لئے اکتفا کیا گیا کہ اس وقت اس جزوِ آیت ہی کا صرف بیان مقصود ہے حق تعالیٰ نے اِس آیت کے جزو میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے حقوق اور برکات بیان فرمائے ہیں وجہ اس بیان کے اختیار کرنے کی اس وقت یہ ہے کہ بعض محبین کی عادت ہے کہ وہ اس زمانہ میں تذکرہ کیا کرتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل کا۔ اور یہ بڑی خوبی کی بات ہے مگر اس کے ساتھ جو اُن کو غلطی واقع ہوتی ہے اس کا رفع کرنا بھی ضروری ہے۔ اِس آیت میں غور کرنے سے اور نیز دوسری نصوص میں غور و نظر کرنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے کچھ حقوق ہیں جن کا ادا کرنا واجب ہے۔ اور ادائے حق کے معنے یہ ہیں کہ تمام حقوق ادا کئے جاویں۔ ایک کیا اور ایک نہ کیا اس سے ادائے حق نہیں ہوتا علم کی کمی سے مختلف قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں اُن میں سے ایک غلطی یہ بھی ہے کہ بعض ایک حق کو اور بعض دوسرے کو اور بعض تیسرے حق کو ادا کرکے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ادائے حق کر دیا حالانکہ ادائے حق کے معنی یہ ہیں کہ تمام حقوق کی رعایت کی جائے مثلاً باپ کا حق یہ ہے کہ اُس کا ادب بھی کرے اطاعت بھی کرے اُس کے لئے دُعا بھی کرے اُس کی تعظیم بھی کرے اگر اس کو حاجت ہو خدمت بھی کرے اور مثلاً بادشاہ کا حق یہ ہے کہ اُس کا ادب کرے اُس کے احکام کو مانے اُس کی عظمت دل میں ہو اُس کی اطاعت کرے اب اگر کوئی شخص اُس کی تعظیم نہ کرے یا احکام کو نہ مانے تو اُس نے بادشاہ کا حق ادا نہیں کیا۔ مثلاً جب گفتگو کرتا ہے تو نہایت خلاف یا تعظیم و تکریم تو اس قدر کرتا ہے کہ پچھلے پاؤں ہٹتا جاتا ہے مگر قانون کے خلاف کرتا ہے قانون کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ ہاں زبان سے بادشاہ کی مدح و ثنا خوب ہی کرتا ہے اور اُس کے متعلق مختلف جلسوں میں خوب تقریریں کرتا ہے اور اگر کوئی کہتا ہے تو جواب میں یہ کہتا ہے کہ جو میں کر رہا ہوں میرے نزدیک ادائے حق یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص بھی اس عذر کو قبول نہ کرے گا بلکہ سب سے بڑا حق تو سلطان کا رعایا پر یہی ہے کہ اُس کی مخالفت نہ کی جائے۔ غرض یہ تو ادائے حقوق کی حقیقت ہے۔

اب سمجھئے کہ حقوق میں تفاوت ہوتا ہے۔ باپ کا اور حق ہے ماں کا اور بی بی کا اور بیٹے کا اور بہن کا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اور خدا تعالیٰ کا اور اور یہ قاعدہ سب میں مشترک ہے کہ ادائے حق اسی کو کہیں گے جو سب حقوق ادا کئے جائیں مثلاً باپ کا حق یہ تھا کہ اس کی تعظیم بجا لاتا اطاعت کرتا اس کی خدمت کرتا اس کی مدح کرتا دعا کرتا ادب سے گفتگو کرتا۔ مگر بیٹے کی حالت یہ ہے کہ نہ اس کی تعظیم بجا لاتا ہے نہ اطاعت کرتا ہے نہ دعا مگر ہاں مجمعوں میں باپ کی مدح و ثنا خوب کرتا ہے تو کیا اس کو کہا جاوے گا کہ وہ باپ کا حق ادا کرتا ہے۔ اگر باپ کہتا ہے کہ بیٹا اٹھ کر پانی دے دو تو یوں جواب دیتا ہے کہ میں نے آپ کی بہت سی تعریفیں کر دی ہیں اب مجھے ضرورت اطاعت کی نہیں رہی میں خدمت نہ کروں گا یہ کہاں کی علت لگائی کہ میں یہ باتیں بھی کروں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عاقل اس کو ادائے حق نہ کہے گا علیٰ ہذا اور حقوق کے بارے میں بھی ایسا ہی کہہ دے۔ ان مثالوں سے معلوم ہو گیا کہ بعض حق ادا کرنے سے حق ادا نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جو حقوق ہیں تو ان کا ادا کرنے والا وہی شخص سمجھا جائے گا جو سب حقوق ادا کرے اور کسی شخص کے اس طرز کو کافی نہ سمجھا جائے گا کہ ایک حق تو ادا کرے اور باقی کو چھوڑ دے۔ جب یہ سمجھ میں آ گیا تو اب ضرورت اس امر کی ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حقوق پہچانے جائیں۔ اس باب میں اس وقت تین جماعتیں ہو رہی ہیں۔ کثرت سے وہ لوگ ہیں کہ ان کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہے اور وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زبانی فضائل بیان کرنے کو کافی سمجھتے ہیں نہ اطاعت سے بحث ہے نہ ان کے دل میں حقیقی محبت ہے نہ تعظیم ہے۔ تین حقوق تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ ایک حق اطاعت ایک حق محبت ایک حق عظمت۔ سو زیادہ حصہ تو ان لوگوں کا ہے جو صرف زبانی محبت پر اکتفا کرنے کو کافی سمجھتے ہیں نہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی خبر نہ حقیقی محبت کی خبر نہ عظمت کی۔ بس اس کو کافی سمجھتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک کر لیا جاوے باقی جتنا اہتمام ذکر کا ہوتا ہے اطاعت کا نہیں ہوتا۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ اگر اطاعت کرتے تو علماء سے رجوع کرتے ان سے مسائل دین کے پوچھتے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کا طریقہ دریافت کرتے ان سے احکام کی تحقیق کرتے۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ

[illegible]

[illegible]

اُس کا ذکر بھی نہیں۔ سو زیادہ لوگ تو اسی قسم کے ہیں اس واسطے ضرورت اس کی ہوئی کہ اس غلطی کو رفع کر دیا جاوے۔ محبّت بیشک بڑا حق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اس کا مقتضٰے یہ بھی ضرور ہے کہ ذکر مبارک کیا جاوے مگر اسی کا مقتضٰے یہ بھی ہے کہ اطاعت کی جائے اسی کا مقتضٰے یہ بھی ہے کہ تعظیم کی جائے چنانچہ دنیا میں جس سے محبّت و خلوص ہوتا ہے اس کا کہنا مانا جاتا ہے اس کی عظمت قلب میں ہوتی ہے خود اس کی محبّت کا تقاضا ہے کہ اُس کی مرضی کے خلاف نہ کیا جائے خواہ اس کو خبر ہو یا نہ ہو مجھے خوب یاد ہے کہ مجکو ایک ادنیٰ اچکن میں رفو کرانے کی ضرورت تھی۔ ایک دوست سے میں نے کہا کہ کسی کاریگر سے رفو کرا دو اور اُجرت پوچھ کر بتلا دو۔ چنانچہ انھوں نے رفو کرنے کے لئے وہ اچکن کاریگر کو دیدی۔ جب رفو ہو کر آگیا تو میں نے اُجرت پوچھی تو کہا کہ اُجرت اُس نے بتلائی نہیں پھر میں نے تقاضا کیا تو کہا کہ وہ بتلاتا نہیں میں نے اصرار کیا کہ پوچھ آیئے مگر ٹالتے رہے بعد میں معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے پاس سے اُجرت دیدی تھی اور ظاہر تک نہیں کیا محبت سے تو غرض یہ ہوتی ہے کہ دل ٹھنڈا ہو محبوب کا اُسے راحت ہو اس لئے خبر ہونے کی ضرورت بھی نہیں۔ اور جہاں خبر بھی ہوتی ہو تو وہاں تو زیادہ اثر ہوگا زیادہ اہتمام ہوگا اور جب یہ بھی معلوم ہو کہ اُس کو اس طرح خبر ہوتی ہے کہ خلاف کرنے میں ایذا بھی ہوتی ہے تب ظاہر ہے جیسا کچھ اہتمام ہوگا اور یہ محبّت کیسی ہے کہ اپنے محبوب کو تکلیف پہونچائی جائے اب جیئے کہ سب جانتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے اعمال امت کے پیش ہوتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ کیا اور فلاں نے یہ کیا۔ کوئی شراب پیتا ہو رشوت لیتا ہو فسق و فجور میں مبتلا ہو سب کی حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اطلاع کی جاتی ہے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کتنی محبّت تھی اُمت سے یہ حالت تھی کہ رات رات بھر کھڑے کھڑے قدم مبارک ورم کر جاتے تھے صرف اُمت کے لئے دُعا کرنے میں۔ ایک بار ساری رات گذر گئی اس آیت کی تلاوت میں اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ (اگر آپ ان کو عذاب دیں تو آپکے بندے ہیں اور اگر بخش دیں تو آپ زبردست قادر ہیں) یعنی آپ زبردست[عہ]

عہ یہ ترجمہ صرف انت العزیز الحکیم کا ہے اس کی تقریر اس لئے کر دی کہ بعض نادان اس کا ارتباط ان تغفر لہم کیساتھ نہیں سمجھتے ۱۲ منہ

قادر ہیں کیا مشکل ہے آپ کو بخشنا۔ ساری رات اسی میں گذر گئی۔ ہمارا وجود بھی کہیں نہ تھا اور آپ کی حالت یہ تھی مولانا فرماتے ہیں ؎

ما نبودیم و تقاضا ما نبود لطف تو نا گفتۂ ما می شنود

نہ ہم تھے نہ ہماری طرف سے تقاضا تھا مگر بے کہے ہوئے درخواست پیش بھی ہوگئی اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اہتمام بھی شروع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کیا نفع۔ ہم کیا پیش کر رہے ہیں۔ کیا فیض تھا ہم سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو۔ اور ہم کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے ہزاروں قسم کا نفع پہونچتا ہے اگر کہو کہ ہم درود شریف پڑھتے ہیں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو نفع ہوتا ہے۔ تو میں کہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا نفع نہیں ہوتا جتنا آپ لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمیں ارشاد ہے حق تعالیٰ کا کہ یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (اے ایمان والو! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجو) اگر آپ اپنے نوکر سے کہیں کہ یہ ہزار روپیہ ہیں ہم سے کہو کہ ہم اپنے بیٹے کو دیدیں تو اُس نوکر کے مقبول بنانے کو اور اُس کی عزت بڑھانے کو یہ صورت تجویز کی ہے نہ کہ بیٹا روپے ملنے میں اس نوکر کا محتاج ہے۔ اگر نوکر نہ بھی کہے تب بھی روپیہ بیٹے کے لئے تجویز کر لیا گیا ہے صرف نوکر کی عزت افزائی کے لئے ایسا کیا ہے یہی حال درود شریف کا ہے کہ حق تعالےٰ کا یہ فرمانا کہ رحمت کی دعا کرو رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے۔ رحمت بھیجنا تو منظور ہی ہے (خواہ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں) چنانچہ اس کے قبل اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ (بے شک اللہ تعالےٰ اور اس کے فرشتے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجتے ہیں) موجود ہے مگر ہماری قدر بڑھانے کو ہمیں کہدیا کہ درود بھیجو کہ تمہارا ابھی بھلا ہو جاوے۔ ورنہ کوئی شخص کیا منہ لیکر کہہ سکتا ہے کہ آپ ہمارے محتاج ہیں اور اس کہنے سے آپ پر رحمت ہوگی۔ یہ شبہ شاید کسی خشک مزاج کو ہوتا اس لئے رفع کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو معاملہ حق تعالیٰ کا ہے وہ ہماری درخواست پر موقوف نہیں اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ علماء نے لکھا ہے کہ اور عبادات بعض دفعہ مقبول ہوتی ہیں اور بعض دفعہ مردود لیکن درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا ہے۔ سو اگر ہمارے عمل کا آپ پر رحمت نازل ہونے میں کوئی اثر ہوتا تو جیسے اور اعمال ہیں یہ بھی ہمارا عمل ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا (کبھی مقبول اور کبھی مردود) سو ہمیشہ مقبول ہونا دلیل ہے اس کی کہ

درود شریف ہمیشہ مقبول ہوتا ہے

معلوم ہوا کہ ہمارے عمل کا اس میں کوئی اثر نہیں۔ حق تعالیٰ ضرور رحمت بھیجتے ہیں۔ ہم درود بھیجیں یا نہ بھیجیں اس لئے (درود شریف) کبھی غیر مقبول نہیں ہوتا پس خدا تعالیٰ کو رحمت بھیجنا تو ہے ہی ہم کو جو حکم دیا تو صرف ہماری عزت بڑھانے کے لئے۔ نیز ہمارے اعمال ظاہر ہے کہ مقبول ہونے کے قابل ہی نہیں اور جو عمل مقبول نہ ہو وہ کالعدم ہے پھر ہمارا درود پڑھنا کالعدم ہوا مگر پھر بھی آپ پر رحمت ہوتی ہے کوئی شخص یہ احسان نہ سمجھے کہ میں درود بھیجتا ہوں تب ہی رحمت ہوتی ہے۔ اگر ہم آفتاب کے سامنے ہو گئے تو آفتاب نے ہم کو منور کر دیا آفتاب ہمارا محتاج شعاع میں نہیں پس علماء کے قول سے اس کی بھی تائید ہو گئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے نفع کے محتاج نہیں البتہ اس مقام پر ایک شبہ اور ہو سکتا ہے وہ یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دین کی تعلیم کی ہے اور ہمارے عمل کرنے سے آپ کو بھی ثواب پہنچتا ہے تو اگر ہم عمل نہ کریں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ ثواب کیسے ملے گا پھر ہمارے عمل کو اس میں دخل ہوا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جب اس نیت سے تعلیم فرمائی کہ اُمتی عمل کریں اور نیت پر اجر ملتا ہے پس جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی نیت فرمائی تو آپ ہر حال میں ماجور تو ہو گئے۔ اب ہمارے عمل کرنے کا اثر اتنا رہا کہ عمل کرنے سے آپ کا جی خوش ہوتا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوتی ہے کہ فلاں اُمتی نے یہ عمل کیا تو آپ خوش ہوتے ہیں بہر حال حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہم سے کوئی نفع نہیں مگر پھر بھی آپ کو ہم سے کتنی محبّت اور ہماری یہ کیفیت کہ زبانی دعویٰ محبت کا بہت اور خیر بعض میں کسی قدر زبانی سوز و گداز بھی ہے۔ چنانچہ جب اس قسم کی مجالس میں شعر اشعار پڑھے جاتے ہیں تو ہائے ہو بہت کرتے ہیں مگر اس کی پرواہ نہیں کہ جس سے محبت کا دعویٰ ہے اعمال ناشائستہ کا ارتکاب کر کے اُن ہی کو ایذا پہونچا رہے ہیں تو صاحب ایسے سوز و گداز سے کیا نتیجہ۔ مجھے اس پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک شاعر آزاد منش تھے۔ بعض کا دل رقیق ہوتا ہے وہ بھی ایسے ہی تھے اس لئے ان کے کلام میں سوز و گداز تھا ایک شخص اُن کا فارسی کلام دیکھ کر کلام سے اُن کو صوفی سمجھ کر ایران سے چلے۔ آ کر کیا دیکھا کہ ایک حجام خلیفہ اُن کے سامنے ہے اور اُن کا چہرہ استرے سے صاف کر رہا ہے اُس شخص نے جھلّا کر کہا کہ آغا ریش می تراشی (آغا کیا ڈاڑھی منڈواتے ہو) شاعر صاحب نے کہا کہ بلے ریش می تراشم مگر دل کسے نمی خراشم یعنی داڑھی تو ترشواتا ہوں مگر کسی کا دل نہیں دکھاتا بڑا گناہ دل دُکھانا ہے۔ اُس نے بیساختہ جواب دیا کہ آرے دل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی (یہاں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا دل رنجیدہ کرتا ہے) مطلب یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو جب یہ اطلاع ہو گی کہ فلاں شخص سنت کے خلاف کر رہا ہے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو کیسی ایذا ہو گی۔ یہ سُنکر شاعر کی آنکھیں کھل گئیں اور زبان حال سے یہ شعر پڑھتے تھے ؎

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جانِ جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور مجھ کو محبوب کا ہمراز کر دیا)

یعنی تم کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے میں تو اندھا تھا آج معلوم ہوا کہ مجھ سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دل کو تکلیف پہونچ رہی ہے۔ غرض یہ محبت کیسی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کو ایذا پہونچ رہی ہو یہ تقریر تو اس پر مبنی تھی کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تین حق ہیں۔ عظمت۔ اطاعت۔ محبت۔ لیکن اگر کوئی شخص تینوں حق کو جُدا جُدا نہ سمجھے بلکہ صرف ایک محبت ہی کو حق سمجھے تو میں کہتا ہوں کہ خود محبت ہی ایک ایسا حق ہے کہ اور حقوق کو مستلزم ہے یعنی محبت مستلزم ہے عظمت کو بھی اطاعت کو بھی یعنی جب سچی محبت ہو گی تو عظمت بھی ہو گی اطاعت بھی ہو گی۔ مگر لوگوں نے صرف یہ یاد کر لیا ہے کہ ہم عاشق ہیں رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے۔ بس اپنے زعم میں اور کسی بات کے مکلف ہی نہیں رہے بلکہ اگر سچ مچ بھی سوز و گداز ہوا اور اُس سے چیخنا چلانا رقت کا طاری ہونا یہ آثار پیدا ہوتے ہوں تو گو ظاہر نظر میں یہ کمال معلوم ہوتا ہے مگر محققین کے نزدیک خود یہ ضعیف محبت ہے اور ضعیف اس وجہ سے کہ محل محبت کا ہے قلب اور یہ علامتیں ہیں ضعف قلب کی تو جب قلب ہی ضعیف ہے تو جو اس کی صفت ہو گی وہ بھی ضعیف ہو گی اس کو محبت کامل نہیں کہیں گے۔ محبت کامل وہ ہے کہ رگ رگ عشق سے چور ہو مگر پھر بدحواس نہ ہو۔ سب جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ سے کیسی محبت تھی صحابہؓ کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسی محبت تھی۔ کسی صحابی کا قصہ ایسا بتلاؤ کہ محبت میں بدحواس ہو گئے ہوں۔ سب میں زیادہ چاہنے والے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ آپ کی یہ حالت تھی محبت میں کہ جب آپ غار میں چھپے ہیں تو حضرت ابو بکرؓ نے یوں عرض کیا کہ پہلے مجھے جانے دیجئے شاید کوئی چیز موذی ہو۔ جب غار میں پہونچے تو اُس میں بہت سے سوراخ تھے آپ نے اپنے کپڑے

عشق چیزے دیگر است

پھاڑ کر ان کو بند کیا دو سوراخ باقی رہ گئے اور کوئی چیز بند کرنے کو رہی نہیں تو آپ نے دونوں پاؤں اُس میں اڑا دیئے اور کہا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ تشریف لے آیئے۔ کیا انتہا ہے اِس عشق و محبت کی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لائے اور نیند غالب ہوئی تو حضرت صدیق رضؓ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرمایا۔ وہاں اُس سوراخ میں ایک سانپ تھا اُس نے حضرت ابوبکر رضؓ کے پاؤں میں ڈسا۔ مگر پاؤں محض اس لئے نہ ہٹایا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم بےچین نہ ہوں۔ آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے اور چہرۂ مبارک پر آنسو گرنے سے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی آنکھ کھل گئی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا کر دی اثر جاتا رہا۔ مگر اُنھوں نے تو اس بھروسہ پر پاؤں نہ دیا تھا کہ اگر کچھ ضرر ہو پہنچے گا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم دُعا کر دیں گے۔ مگر باوجود اس (محبت) کے کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا جس میں ابوبکر رضؓ مغلوب ہو گئے ہوں۔ سب سے بڑا واقعہ وفات کا تھا ایسے عشاق کو تو جس بھی نہ رہنی چاہیے تھی مگر وہ ہی ہیں کہ ثابت قدم رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کس قدر پریشان ہو گئے اسی میں ان کو اجتہادی غلطی ہو گئی وہ غلطی یہ تھی کہ بعض صحابہ رضؓ وفات ہونے کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا زندہ ہونا سمجھتے تھے کہ یہ ایسا ہی ہو گا جیسے معراج میں (کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جا کر واپس آ گئے تھے اسی طرح یہاں بھی ہو گا کہ گو وفات ہو گئی مگر پھر زندہ ہو جاویں گے) اس وقت ایک عارضی غیبت ہے اس کے مرتفع ہونے پر آپ زندہ ہو جاوینگے یہ خیال تھا بعض صحابہ رضؓ کا یہی حال تھا حضرت عمر رضؓ کا یوں کہتے تھے کہ اگر کوئی کہیگا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی تو تلوار سے اس کے دو ٹکڑے کر دوں گا۔ اسی حالت میں حضرت ابوبکر رضؓ گھر میں تشریف لے گئے اور چہرۂ مبارک سے چادر اُٹھا کر پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا طِبْتَ حَیًّا وَّمَیِّتًا یعنی آپ حیات و موت دونوں حالت میں پاک ہیں اور یہ بھی فرمایا کہ آپ اس سے منزہ ہیں کہ حق تعالےٰ آپ پر دو موتیں جمع کریں۔ نہیں کبھی نہیں ایسا ہو گا۔ اور باہر آ کر فرمایا عمر رضؓ سے اے بھلے مانس بیٹھ پھر جا کر خطبہ پڑھا مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَاِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ کَانَ یَعْبُدُ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ حَیٌّ لَا یَمُوْتُ (جو شخص تم میں سے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی عبادت کرتا تھا وہ مر گئے اور جو شخص اللہ تعالےٰ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ تعالےٰ زندہ ہیں نہیں مریں گے) اور یہ آیت پڑھی انک میت وانہم میتون (آپ کو بھی مرنا ہے اور ان کو بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے) اور یہ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ

عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ (سو آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید ہو جاویں تو کیا تم لوگ اُلٹے پھر جاؤ گے) اور بعض صحابہؓ کا جو یہ خیال تھا تو اُس کی وجہ یہ ہے کہ محبت میں محبوب کی موت کا خیال بھی لانا گوارا نہیں ہوتا اس لئے صحابہؓ کبھی سوچتے بھی نہ تھے کہ موت حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہو گی۔ مجھ کو اس پر تعجب ضرور ہوتا تھا مگر ایک واقعہ دیکھ کر یقین ہو گیا قریب کا واقعہ ہے ایک بی بی کی شادی ہوئی ایک عالم سے وہ عالم مر گئے شدید صدمہ ہوا جس کی وجہ سے یہ تحقیق ہوئی کہ اُس بی بی کا گمان یہ تھا کہ عالم مرا نہیں کرتے اور یوں کہا کرتی تھی کہ میں بڑی خوش قسمت ہوں جو ان سے شادی ہوئی کہ کبھی مریں گے نہیں۔ اُن کا طاعون میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ بی بی کہتی تھیں کہ میں نے سُنا ہی نہ تھا کہ مولوی مرتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے اب موجود ہیں جو علماء پر موت کے ورود کو بعید سمجھتے ہیں تو صحابہؓ کا مرتبہ حال ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایسا خیال ہو تو کیا بعید ہے مگر حضرت ابوبکرؓ باوجود کمال عشق کے مستقل رہے تو حقیقت میں کمالِ عشق وہ ہے جو کمالِ عقل کے ساتھ ہو سو ایسا شخص مغلوب ہو گا اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے احکام نہیں چھوڑ یگا۔ ہمارے مجمع میں ایک مجذوب ہیں اللہ او راہل اللہ کا نام سنکر اس قدر چلاتے ہیں کہ تاب نہیں رہتی مگر نمازیں کبھی چیخ نہیں نکلتی آہ بھی نہیں نکلتی۔ یہ کمال اتباع کی دلیل ہے شیخ عبدالحق ردولوی اس قدر مغلوب الحال تھے کہ جامع مسجد میں تیس برس تک نماز پڑھنے پر بھی مسجد کا راستہ یاد نہ ہوا مگر جماعت ایک وقت کی بھی قضا نہ ہوئی۔ مخدوم صابرؒ بارہ برس تک مستغرق رہے مگر کبھی نماز قضا نہ ہوئی۔ نماز پڑھی پھر مستغرق ہو گئے یہ کمالِ عقل کی علامت ہے اور عقل جس قدر زیادہ کامل ہو گی اُتنی ہی زیادہ محبت ہو گی جیسے یہ حضرات اہل محبت تھے کہ خدا کے احکام کے اندر مغلوب نہ ہوئے اور اس کا راز یہ ہے کہ محبت بڑھتی ہے معرفت سے اور معرفت ہوتی ہے عقل سے۔ جتنی عقل کامل ہو گی اُتنی ہی معرفت ہو گی اور جتنی معرفت ہو گی اتنی محبت ہو گی جتنی عقل کم ہو گی معرفت کم ہو گی۔ پس کامل العقل وہ ہے جس کی شان انبیاء علیہم السلام کی سی ہو۔ انبیاء علیہم السلام کو کتنی محبت تھی مگر مغلوب نہیں ہوتے تھے سو کمالِ محبت تو یہ ہے کہ اضطرارًا بھی احکام میں اختلال نہ ہو لیکن اگر ایسا اختلال بھی ہو گیا تو گو کمال نہیں مگر صدق تو ہے اور جہالۃً اختیارًا و قصدًا اختلال ہو جیسے یہ لوگ (مدعیان محبت) کھاتے پیتے زراعت کرتے ہیں۔ رشوت، سود بیٹا دیتے لیتے ہیں پھر عاشق۔ یہ اچھے

کمالِ عشق وہ ہے جو کمالِ عقل کے ساتھ ہو

کامل العقل وہ ہے جس کی شان انبیاء کی سی ہو

عاشق ہیں کہ سارے احکام ان سے ٹل گئے۔ ظاہر ہے کہ جب مغلوب نہ ہوگا تو تمام احکام اس پر ہوں گے سوا ایسے لوگوں کے متعلق تو کہاں سے قطع نظر کرکے محبت ہی میں کلام ہے۔ دوسرے محبت کی خاصیت یہ ہے کہ اِذَا جَاءَتِ الْاُلْفَةُ رُفِعَتِ الْکُلْفَةُ (جب ہوگئی الفت اٹھ گئی کلفت) یعنی وہ شخص محبِ رسوم کا پابند نہیں ہوتا تکلف جاتا رہتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ ان مدعیوں میں تکلف اور زیادہ ہے۔ صحابہؓ کی شان تھی کہ وہ اکثر اوقات ذکر کرتے تھے رسم کی اس میں کوئی قید نہ تھی چار آدمی بیٹھے ہیں بجائے اس کے کہ اور کوئی ذکر کریں بس حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے تھے ہماری یہ کیفیت ہے کہ کسی کو سال بھر کے بعد یاد آتا ہے کسی کو مہینہ کے بعد گیا وہ اس کے منتظر رہتے تھے کہ مجمع کریں شیرینی منگائیں اب یہ کیا بات ہے کہ کبھی بلا اس کے ذکر ہی نہیں ہوتا۔ خصوص جبکہ تکلف آپ کی سنت کے بھی خلاف ہو جن کی محبت کا دعویٰ ہے۔ پس گو ایک لیمپ کافی ہو مگر بیس بیس جلائیں گے کیا یہ اسراف نہیں ہے واعظ کے لئے مسند بچھایا گیا ہے خواہ ریشمین ہی ہو اس کا استعمال کہاں جائز ہے۔ داڑھی ترشوائی ہے۔ یہ ادب ہے محفل ذکر شریف کا۔ اور جہاں ایسا تکلف نہ ہو اور کوئی شخص محفل منعقد کرے تو کوئی بھی نہ آئے۔ یہیں کا نپور کا واقعہ ہے کہ ایک شخص نے اشتہار دیا کہ فلاں مسجد میں میلاد ہے مگر اخیر میں مٹھائی نہ بانٹی تو برا بھلا کہنے گئے کہ بڑا دھوکا دیا۔ محبوب کا ذکر سنکر بھی مٹھائی کی سوجھ رہی ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے ذکر کے سامنے ہفت اقلیم کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ یہ محبت تو کیا ہوتی نقل محبت بھی نہیں اگر نقل ہوتی تو کم از کم صورت تو ویسی بنا لیتے وہ ہی ہیئت بنا لیتے۔ اس پر عالمگیر کی حکایت یاد آئی جب عالمگیر کی تخت نشینی کا جلسہ ہوا تو کام کے لوگوں کو عطایا دیئے گئے ایک بہروپیہ بھی مانگنے آیا مگر عالمگیر عالم تھے اس کو کس مد سے دیتے اور ویسے صاف انکار کرنا بھی آداب شاہی کے اعتبار سے نازیبا معلوم ہوا حیلہ سے ٹالنا چاہا۔ اس سے کہا کہ انعام کسی کمال پر ہوتا ہے۔ تمہارا کمال یہ ہے کہ ناشناسا صورت میں آؤ مگر وہ جب کبھی بھیس بدل کر آیا بادشاہ نے پہچان لیا کبھی دھوکا نہیں کھایا کہ جس روز دھوکہ دیدے گا انعام کا مستحق ٹھیرے گا اتفاق سے عالمگیر کو سفر دکن کا درپیش تھا۔ بہروپیہ داڑھی بڑھا مقدس لوگوں کی صورت بنا رستہ میں کسی گاؤں میں جا بیٹھا کچھ روز کے بعد شہرت ہوگئی۔ عالمگیر کی عادت تھی کہ جہاں جاتے تھے علماء اور فقراء سے برابر ملتے تھے چنانچہ جب اس مقام پر پہونچے وہاں شہرت سنکر اوّل وزیر کو اُس کے پاس بھیجا۔ وزیر نے کچھ مسائل تصوف کے پوچھے اُس نے سب کے

جواب معقول دیئے۔ بات یہ تھی کہ اُس وقت بہروپئے ہرفن کو قصداً حاصل کرتے تھے۔ وزیر نے آکر عالمگیر سے بہت تعریف کی۔ عالمگیر خود ملنے گئے۔ آپس میں خوب گفتگو رہی اور خوب سمجھ گئے کہ شاہ صاحب کامل شخص ہیں۔ چلتے وقت ایک ہزار اشرفیاں بطور نذر پیش کیں۔ اُس نے لات ماری اور کہا کہ تو اپنی طرح ہم کو بھی سگِ دنیا خیال کرتا ہے۔ اِس سے اور بھی اعتقاد بڑھا۔ واقعی استغنا عجیب چیز ہے۔ عالمگیر لشکر میں واپس چلے آئے پیچھے پیچھے بہروپیہ صاحب پہونچے کہ لائیے انعام خدا تعالیٰ حضور کو سلامت رکھے۔ بادشاہ نے کہا ارے تو تھا۔ غرض انعام دیا مگر کم دیا اور کہا کہ اُس وقت جو پیش کیا تھا اُس کو کیوں نہیں لیا تھا وہ تو اس سے بہت زیادہ تھا اور میں اس کو واپس تھوڑا ہی لیتا۔ اُس نے کہا کہ حضور اگر میں لیتا تو نقل صحیح نہ ہوتی کیونکہ وہ فقیری کا روپ تھا اور فقیر کے شان کے خلاف تھا وہ لینا۔ نقل تو اس کو کہتے ہیں کہ ہم لوگ مدعیانِ محبت نے شکل تو بنائی ہوتی اہلِ محبت کی سی۔ اگر شکل بناتے تو ظاہر ہی میں رسم اور قیود کی پابندی نہ ہوتی۔ عرب میں پھر یہاں سے تفاوت ہے یہ حالت ہے کہ چھوارے بانٹنے شروع کئے اگر کچھ آدمی بچ رہے اور چھوارے ختم ہو گئے تو کہہ دیتے ہیں (خلاص) یعنی اب نہیں رہا۔ یہاں یہ کیفیت ہے کہ اگر مٹھائی آنے میں دیر ہو تو پڑھنے والے ہی کہہ دیتے ہیں کہ ذرا تھام تھام کر پڑھنا امرتیاں منگائی ہیں ابھی آئیں نہیں کہیں تک کٹی ہو جاوے۔ یہاں تو نقل کبھی نہیں دعویٰ ہی ہے۔ بے تکلفی پر یاد آیا کہ ایک بزرگ تھے اُن کی عادت تھی کہ کبھی کبھی کچھ منگا کر مساکین کو تقسیم کر کے روح مبارک صلے اللہ علیہ وسلم کو ثواب پہنچا دیتے ایک دفعہ کچھ نہ تھا چنے ہی تقسیم کر دیئے تو خواب میں دیکھا کہ چنے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھے ہیں۔ محبت کا طریق یہ ہے۔ محبت میں تو تکلف ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک بزرگ کے خلوص اور بے تکلفی کی حکایت یاد آئی کہ وہ ایک دوسرے بزرگ سے ملنے چلے ان کا جی چاہا کہ کچھ لے چلیں مگر پاس کچھ تھا نہیں پس یہ کیا کہ جنگل سے خشک لکڑیاں ہی تھوڑی سی جمع کر کے لے گئے اور پیش کر دیں انھوں نے حکم دیا تھا وہ کو یہ لکڑیاں احتیاط سے رکھ دو جب ہمارا انتقال ہو تو پانی ہمارے غسل کے لئے ان ہی لکڑیوں سے گرم کیا جائے ہم کو اس کی برکت سے اُمید ہے نجات کی۔ یہ کیفیت تھی بے تکلفی کی اور اب تو یہ حالت رہ گئی ہے کہ یوں خیال کرتے ہیں کہ پیر کی خدمت میں جب جائیں کہ جب کچھ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیر کو بھی دنیا دار سمجھتے ہیں اگر ایسا سمجھا ہے تو ایسے پیر کو چھوڑ دینا واجب ہے

محبت میں تکلف نہیں ہوتا

یہ تو مریدوں کو آکامت کی کیفیت تھی اب رہے پیر سو اُن کی بھی طمع کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی مرید میں سے ان کے پاس آتا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کچھ لایا ہوگا۔ بقول مولانا گنگوہی کے کہ کوئی سر کھجلانے لگے تو پیر یہ سمجھیں گے کہ پگڑی میں سے نکال کر کچھ دیگا۔ ایسا طمع کا باب کھلا ہے ایسے پیروں سے تو ان کے بعضے مرید اچھے جو پیر سے محض نیک نیتی سے تعلق رکھتے ہیں گو اس تعلق رکھنے میں ان سے غلطی ہوئی مگر خلوص تو ہے۔ ایک ایسے ہی پیر و مرید کا قصہ یاد آیا کہ ایک مرید نے اپنے پیر سے کہا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کی انگلیاں تو شہد میں بھری ہوئی ہیں اور میری غلیظ میں۔ پیر نے کہا کہ ہاں نہیں ہم ایسے ہی ہیں اور تم ایسے ہی ہو۔ مرید نے فوراً کہا کہ حضور ابھی خواب پورا نہیں ہوا میں نے یہ بھی دیکھا کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی چاٹ رہا ہوں۔ پیر نے کہا نکل یہاں سے خبیث۔ اُس نے کہا کہ خبیث تو ہوں مگر دیکھا یوں ہی ہے یا تو واقعی یہ خواب ہی دیکھا ہوگا یا مرید نے پیر کا حال ظاہر کرنے کو تراشا ہوگا ہر حال میں مطلب یہ تھا کہ مرید کا تعلق تو پیر سے دین کے لئے تھا اور پیر کا تعلق مرید سے دنیا کے لئے تھا یہ حالت ہو رہی ہے۔ پیری کیا ہے ایک دکان ہے کیسی پیری مریدی۔ اگر پیر ایسا ہے کہ تمہارے خالی جانے سے ناراض ہوگا تو واجب ہے آپ کے ذمہ اُس کو طلاق دو۔ غرض یہ تکلفات سب علامتیں اسی کی ہیں کہ خلوص اور حقیقی محبت نہیں اسی طرح ذکر مبارک نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں سمجھئے کہ اگر سچی محبت ہو تو قیود و تکلفات کا انتظار نہ ہوتا۔ چین نہ ہوتا یہ نہ سوچتے کہ پہلے لڈو بنوالیں اُس وقت ذکر کریں گے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کا۔ ارے بھائی کیا اس میں اس قسم کی کوئی شرط ہے۔ نماز میں تو وقت و عدد وغیرہ کی شروط ہیں مگر ذکر میں تو بجز موافقت حدود شرعیہ کے ایسی کوئی شرط نہیں۔ جیسا اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کوئی شرط نہیں چنانچہ ارشاد ہے کہ خدا تعالیٰ کا کثرت سے ذکر کرو۔ اس میں نہ وضو کی قید ہے نہ وقت کی قید نہ عدد کی قید بلکہ یہ ہونا چاہئے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی   شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب سے غافل نہ رہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کرے اور تم آگاہ نہ ہو)

ہر آنکہ غافل از حق یک زمان است   در آندم کافر است اما نہان است

(جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے ذکر سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی وہ کافر ہے لیکن پوشیدہ کافر ہے)

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہر وقت ذکر کرتے تھے یذکر اللہ فی کل احیانہ

(یعنی اپنے سارے وقت میں ذکر اللہ کرتے تھے) البتہ علماء نے اتنا تو فرمایا ہے کہ پاخانہ پیشاب کے وقت زبان سے نہ کرے لیکن قلب سے دھیان رکھے جب ذکر اللہ کے یہ احکام ہیں اور عشاق کے نزدیک آپ کا ذکر مثل ذکر اللہ تعالیٰ کے ہے جب اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے کوئی قید نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کیوں قید ہوگی۔ چار آدمی بیٹھیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرلیں۔ تنہا ہو ذکر کرلے بلکہ تنہائی میں تو بہت لطف آتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے ؎

چہ خوش وقتے وخرم روزگارے
کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ کوئی محب اپنے محبوب کے وصال سے لطف اندوز ہو)

جو بڑی بڑی محفلیں کرتے ہیں اُن سے قسم دیکر پوچھئے کہ بارہ دن اس خاص ہیئت کے تم کو کتنی توفیق ہوتی ہے اس ذکر کی۔ کوئی کتاب پڑھتے ہو اس سے مزہ لیتے ہو بلکہ بعض تو اسکو (یعنی میلاد کو) دین بھی نہیں سمجھتے بلکہ عمل سمجھتے ہیں روزگار کی ترقی کا۔ اسی نیت سے کرتے ہیں گیارہویں بارہویں اور یوں سمجھتے ہیں کہ سال بھر تک جو کمایا تھا گیارہویں بارہویں کرنے سے گذشتہ تو ساری کمائی پاک ہوجاویگی اور آئندہ آفات سے بچے رہیں گے عہدہ بڑھے گا اولاد جئے گی ان دنیاوی اغراض سے کرتے ہیں اِلَّا مَا شَاءَ اللہ اسی لئے ایسے لوگوں میں بالکل ادب بھی نہیں ذکر مبارک کا یہیں کا قصہ ہے کہ ایک جگہ میلاد ہوا اور اس سے اگلے ہی دن وہیں ناچ ہوا۔ شادی تھی ایک صاحب کے یہاں جس میں ناچ کی دعوت بھی کی گئی تھی بعض اُن کے دوستوں میں ثقہ بھی تھے انھوں نے انکار کیا۔ بس ان کی ضرورت سے یہ محفل کی تھی مگر دوسرے دن وہیں ناچ کی محفل کرادی جو اُن کو اصلی مقصود تھا۔ اس شخص نے دونوں پلے برابر سمجھے۔ یہ حالت ہے۔ اور بعض جگہ اگر کوئی ایسا امر منکر بھی نہیں ہوتا تب بھی سب سے بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ روایات میں اس قدر بے اعتدالی کرتے ہیں کہ جن کا سر نہ پاؤں۔ قصیدے اس قسم کے پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی خود رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی ہوجاتی ہے۔ چنانچہ میں عرض کرتا ہوں واقعات دکھاتا ہوں تاکہ محض فرضی دعویٰ نہ سمجھا جائے۔ ایک قصیدہ ہے اور اس کا یہ شعر ہے شاعری میں آکر یہ کہدیا ؎

طواف کعبہ مشتاقِ زیارت کو بہانہ ہے
کوئی ڈھب چاہئے آخر قلیبوں کی خوشامد کا

یعنی اصل تو زیارت مدینہ کی ہے حج مقصود نہیں ہے حج محض ایک مصلحت سے کرتے ہیں اور وہ مصلحت یہ ہے کہ اللہ میاں (نعوذ باللہ) عاشق ہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے اور ہم بھی

عشاق کے نزدیک آپ کا ذکر مثل ذکر اللہ کے ہے جس میں کوئی قید نہیں

بعض میلاد کو عمل سمجھتے ہیں روزگار کی ترقی کا اور گیارہویں کو

لوگوں میں ذکر مبارک کا ادب نہیں

قصائد بیہودہ میلاد میں پڑھنا

عاشق اس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے چلے اور محبوب کے دو عاشق آپس میں رقیب کہلاتے ہی ہیں تو گویا اللہ میاں (نعوذ باللہ) ان کے رقیب ہوتے اور رستہ میں کھڑا تا ہے رقیب کا جو قادر ہے شاید جانے نہ دے اس لئے حج کر کے اُن کی خوشامد کر لینی چاہیئے اس سبب سے پہلے طوافِ کعبہ کرتے ہیں کہ خوش رہیں اور کچھ کھنڈت نہ ڈال دیں (نعوذ باللہ) اور لیجیے ؎

پے تسکین خاطر صورت پیراہن یوسف　　محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

یہ جو مشہور ہے کہ سایہ نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ تو یہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے گو وہ ضعیف ہیں مگر فضائل میں متمسکات ہو سکتی ہیں سو شاعر صاحب اس کا نکتہ بیان کرتے ہیں کہ سایہ کیوں نہ تھا تو وہ نکتہ یہ ہوا کہ یعقوب علیہ السلام نے جس طرح یوسف علیہ السلام کو رخصت کرتے وقت یہ سوچکر کہ یوسفؑ مجھ سے جدا ہوتے ہیں میرے دل کو تسلی کیسے ہو گی پیراہن رکھ لیا تھا اسی کو دیکھ لیا کروں گا۔ اسی طرح نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ نے حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیجنا چاہا تو سوچ ہوئی کہا کہ میں کاہے سے تسلی حاصل کروں گا۔ اس لئے سایہ کو رکھ لیا کہ اس سے تسلی تو ہو جایا کرے گی الٰہی توبہ الٰہی توبہ۔ انصاف سے کہئے کہ ان مضامین کے بعد ایمان باقی رہ سکتا ہے اس شعر میں حق تعالیٰ کے لئے بےچینی ثابت کی ہے پھر بصیر ہونے کا انکار کیا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ جب بصیر و خبیر ہیں تو پھر کیا اللہ تعالیٰ کو نعوذ باللہ دکھائی نہیں دیتا تھا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ لیا کرتے پھر سایہ رکھنے کی ضرورت نہ ہوتی کیا ایسی محفل کرنے سے پکڑ دھکڑ نہ ہوگی۔ بانی محفل پر مواخذہ نہ ہوگا۔ اگر دین ایسا سستا ہے کہ کہیں سے بھی نہیں جاتا تب تو خیر گستاخی بھی کوئی چیز نہیں مگر دین تو ایسا سستا نہیں ہے، کیا دین کے یہ معنی ہیں کہ سب کچھ کئے جاؤ اور وہ نہ جائے۔ یہ تو اللہ میاں کی شان میں سوءِ ادب تھا اب انبیاء علیہم السلام کی شان میں دیکھئے ایک شاعر صاحب کہتے ہیں ؎

بر آسمانِ چہارم مسیح بیمار ست　　تبسم تو برائے علاج درکار ست

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمانِ چہارم پر بیمار ہیں اور اُن کا علاج آپکا تبسم ہے۔ سچ بتلایئے کہ کیا حضرت عیسیٰؑ بیمار ہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تبسم سے وہ اچھے ہو جائیں گے اور حقیقت میں اس میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو بھی ناراض کرنا ہے۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ کیا حضور صلے اللہ علیہ وسلم ایسی بات سے خوش ہوں گے جس میں دوسرے نبی کی توہین ہوتی ہو۔ آپ سمجھیئے کہ آپ کے کوئی بھائی حقیقی ہو اور اس کے ایک بیٹا ہو اور وہ آپ کی شان میں

گستاخی کرے تو کیا بھائی کو یہ بات پسند ہوگی اسی طرح انبیاء علیہم السلام آپس میں بھائی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب میں بڑے ہیں اگر آپ نے کسی نبی کی توہین اور ان کی شان میں گستاخی کی تو کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے خوش ہوں گے۔ ایک شاعر صاحب ہیں کہ انھوں نے نعت لکھنے کے لئے روشنائی تجویز کی ہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھ کو اس روشنائی کے حل کرنے کے لئے کھرل قرار دیا ہے وہ شعر اس وقت مجھکو یاد نہیں رہا۔ سچ بتلایئے ایمان سے اگر ہم انبیاء علیہم السلام کو کسی موقع پر مجتمع پائیں اور وہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف فرما ہوں تو کیا اس مجمع میں ہم ان اشعار کا انکار کر سکتے ہیں کیا یعقوب علیہ السلام کی آنکھ میں روشنائی پیس سکتے ہیں یا ان کے منہ پر ایسی بات کہہ سکتے ہیں۔ تو جو بات منہ پر کہنا بے ادبی قرار دیجاوے کیا پیچھے کہنا گستاخی نہ ہوگی۔ انبیاء علیہم السلام کی تو بڑی شان ہے مخلص لوگوں نے تو دوسرے اہل اللہ کے ساتھ اس کی رعایت کی ہے۔ ایک قصہ یاد آیا۔ ایک عورت جس کو جذام کا مرض تھا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں طواف کعبہ کر رہی تھی آپ نے فرمایا یَا اَمَةَ اللّٰهِ اُقْعُدِیْ فِیْ بَیْتِكِ وَلَا تُؤْذِی النَّاسَ یعنی کہ لوگوں کو تیری وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اب نہ آنا۔ چنانچہ وہ چلی گئی پھر عرصہ کے بعد پھر طواف کا شوق ہوا آکر طواف کرنے لگی۔ ایک شخص نے کہا خوب دل کھول کر طواف کر جو شخص تیرا روکنے والا تھا وہ انتقال کر گیا کہنے لگی وہ شخص ایسا نہ تھا کہ سامنے تو اس کا اتباع کیا جائے اور بعد میں مخالفت کی جائے یہ کہکر چلدی اور کہا کہ اب نہ آؤں گی کیونکہ وہ منع کر گئے تھے۔ میں تو اس لئے آئی تھی کہ طواف کر کے پھر ان کو راضی کر لوں گی جب وہ نہیں پھر کس سے معاف کراؤں۔ سو آدمی پیچھے وہ معاملہ کرے جو سامنے کر سکتا ہو۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پیچھے کیوں لیا معاملہ کیا جاتا ہے جو سامنے نہیں کر سکتے۔ کسی نے خوب رد کیا ہے اس شعر کا (جس میں دیدۂ یعقوب کو کھرل بنایا تھا) وہ یہ ہے ؎

ابھی اس آنکھ کو ڈالے کوئی پتھر سے کچل ... نظر آتا ہے جسے دیدۂ یعقوبؑ کھرل

اور کہتے ہیں ؎

تو بہ ہے یوں ہو کہیں چشم نبی صلی اللہ علیہ وسلم مستعمل ... کوئی تشبیہ تھی اور نصیب اجہل

انبیاء علیہم السلام کی شان میں تو ایسے اشعار بطور نقل بھی کہتے ہوئے پریشانی ہوتی ہے بلکہ اس سے بڑھ کر خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہایت بے ادبی کی جاتی ہے۔

[illegible]

آپ کی شان میں کہتے ہیں فتنۂ عرب۔ شور عجم۔ آوردہ ہیم کافری۔ جس ذات نے کفر کی جڑ کاٹی
اُن کے لئے یہ کہا جائے۔ اصل میں یہ امیر خسروؒ کا شعر ہے جو مجازی فرضی محبوب کے لئے کہا گیا ہے کسی نے
اُس کو نعت کے اشعار میں تضمین کر لیا ہے باقی امیر خسروؒ نے یہ شعر نعت میں نہیں کہا اور اگر
امیر خسرو بھی کہتے تو ہم اُن کی نسبت بھی یوں کہتے کہ اللہ تعالیٰ معاف کرے۔ اگر وہ ایسا کرتے
تو اُن کی بھی غلطی ہوتی باقی اُن کی نسبت ہم زیادہ اس لئے نہ کہتے کہ وہ بزرگ ہیں وہاں
تاویل غلبہ حال کی ہو سکتی ہے گو اوروں کو اُس کا نقل بطور شغل کے جائز نہ ہوتا مگر جو صاحب
حال بھی نہ ہو اس کے پاس کیا عذر ہے ان گستاخیوں کا۔ اب بتلایئے یہی محبت ہے نیز اگر
محبت ہوتی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے دوسرے حقوق تحیت بھی تو ادا ہوتے۔ جو لوگ
اہتمام کرتے ہیں اس مجلس کا اُن سے قسم دیکر پوچھو کہ وہ کس قدر درود شریف دن رات
میں پڑھتے ہیں اگر اُن سے جبکہ وہ محفل میں بلانے کے لئے آدیں یوں کہو کہ جتنے درود شریف
وہاں پڑھے جاتے ہیں میں اُس سے زیادہ یہاں پڑھ لوں گا تو کبھی راضی نہ ہوں۔ ایک شخص
ایک ہزار مرتبہ درود شریف پڑھ رہا ہے اُس پر تو انکار ہے اور جو محفل میں چار مرتبہ بھی نہ
پڑھیں گے وہ محب ہیں ایسے ہی لوگ اصلاح کرنے والے کو کہتے ہیں کہ مولود شریف کا منکر ہے
مگر سمجھنے کی بات ہے کہ نماز سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں لیکن اس میں بھی اگر کوئی شخص بجا
قبلہ کے ادھر (مثلاً مشرق کی طرف) منہ کر کے اور گھٹنے کھول کر پڑھے اور اس پر کوئی منع
کرے تو کیا یہ کہا جائیگا کہ یہ نماز سے روکتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر سے روکنا تو
اس کو کہتے ہیں کہ نہ تو کلمہ پڑھنے دے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لینے دے ایسے شخص کو
بیشک منکر کہیں گے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر واجب ہے
مگر تعجب ہے کہ اُس کو منکر کہا جاتا ہے جو شخص یوں کہے کہ نشر الطیب پڑھو اور وہ کتابیں پڑھو
جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے حالات ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و عادات
مذکور ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے احکام ہیں یہ سب ذکر ہی ہیں مگر ان میں
کوئی قید نہیں ہے۔ کیا ایسے شخص کو منکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہیں گے۔ کیا یہ تہمت نہیں ہے۔ کیا اس کا
حساب نہ ہوگا۔ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب گنج مرادآبادیؒ سے کسی نے پوچھا کہ
مولود کیسا ہے تو فرمایا کہ ہم تو ہر وقت مولود کرتے ہیں اور کلمہ طیبہ پڑھا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور فرمایا یہ بھی مولود ہو گیا۔ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا نہ ہوتے

تو آپ کا کلمہ کیسے پڑھا جاتا۔ مولانا رح کا یہ مولود شریف تھا ایسے شخص کو یہ کہنا کہ منکر رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اسکو محبت نہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی سخت بات ہے۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ذکر کرتے تھے وہاں یہ قیدیں کہاں تھیں کبھی صحابی نے مٹھائی منگائی ہو کسی نے صحابہؓ کو بلا کر جمع کیا ہو نہ آنے والوں کو لتاڑا ہو تو بتلاؤ۔ بات یہ ہے کہ یہ چیزیں دو طرح سے ایجاد ہوئی ہیں بعض تو تکلف و تفاخر کی غرض سے چنانچہ ہم اس کی علامت بتلاتے ہیں کہ ایک فہرست لکھوا اور اس میں یہ بھی لکھو کہ ہمارے یہاں مٹھائی نہ ہوگی دیکھیں ایسی فہرست لکھنا کون گوارا کرتا ہے اس سے تو بانی صاحب کی طبیعت اور نیت کا حال معلوم ہو گیا اگر تفاخر نہیں تو یہ کیوں ناگوار ہے۔ آگے سننے والوں کی نیت کو دیکھئے کہ اگر کوئی ہمت کر کے لکھ بھی دے تو پھر دیکھنا آتا کون ہے۔ دو قسم کی محفلیں کر کے دیکھ لو ایک وہ محفل جس میں مٹھائی ہو اور ایک وہ جس میں مٹھائی نہ ہو پھر دیکھو کہاں زیادہ آدمی ہوں گے۔ دوسرے تفاخر کی ایک دلیل یہ ہے کہ اگر اتفاقاً مٹھائی کم ہو جائے اور آدھے آدمی بلا مٹھائی چلے جائیں تو ناک کٹنے کے خیال سے کسی قدر قلق ہوتا ہے۔ اگر لوگ مسجد میں نماز کے لئے آئیں گو کسی اشتہار ہی پر آئیں اور جگہ نہ ملے تو کوئی شکایت نہیں کرتا کہ مہتمم صاحب نے ہماری بیقدری کی اور نہ مہتمم کو اس کا خیال ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو جگہ نہیں ملی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نہ مہتمم کہہ سکتا ہے کہ ہمارے اوپر کوئی احسان نہیں آپ دین کا کام کرنے آئے تھے جس قدر اہتمام ہم سے ہو سکتا تھا ہم نے کر دیا ہمارے ذمہ کچھ بھی نہیں۔ ہاں کسی کے بلائے ہوئے شادی میں آؤ اور اہتمام میں کمی ہو تو شکایت ہو سکتی ہے پھر جب محفل میلاد میں جگہ نہ ملنے یا مٹھائی سے رہ جانے میں شکایت ہوتی ہے اور خود محفل انجام دینے والے کو بھی سخت شرمندگی ہوتی ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ اس کو مثل حاضری مسجد کے نہیں سمجھتے مثل شرکت شادی کے سمجھتے ہیں جہاں تفاخر سبب ہوتا ہے اہتمام کا جس کی کمی سے شکایت ہوتی ہے پس اگر اس محفل کو دین کا کام سمجھتے ہیں تو حالات مذکورہ میں شرمندگی کیوں ہوتی ہے۔ اسیطرح مٹھائی موقوف کر دی جاوے تو اس سے سامعین کی نیت کا اندازہ ہو جاویگا کہ کتنے آدمی ذکر میں شریک ہوتے ہیں مگر مٹھائی کے موقوف کرنے سے یہ نفع ضرور ہوگا کہ دوسرے غریب بھی ہمت کریں گے ذکر کی جن کو وسعت نہیں اگر آدمی اسکو گوارا کر سکتا ہے۔ تام کیسے ہوگا غرض ان رسوم کے ایجاد کی بنا ایک تو یہی تکلف و تفاخر ہے جس کو ابھی بیان کر چکا ہوں اور بعض شروع ہوئی ہیں غلبہ حال سے چنانچہ قیام کی اصل یہی غلبہ حال اور

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ذکر کرتے تھے وہاں قیدیں کہاں تھیں

رسوم موجودہ کی ایجاد دو طریقہ سے ہوئی ہے

وجد ہی اور آدابِ وجد میں سے امام غزالیؒ نے لکھا ہے احیاء العلوم میں کہ اگر مجلس میں کسی کو وجد ہو اور وہ کھڑا ہو جاوے تو سب کو چاہیئے کہ کھڑے ہو جائیں کیونکہ مخالفت سے انقباض ہوتا ہے اور موافقت سے انبساط۔ مخالفت سے طبیعت بجھ جاتی ہے۔ تو یہ قیام کرنا بھی ذکر مبارک میں کوئی حکم شرعی نہیں صحابہؓ سے ثابت نہیں محض ایک قسم کا وجد ہے کسی وقت میں کسی صاحبِ حال پر حال طاری ہوا وہ حالتِ غلبہ میں کھڑا ہو گیا اور مطابق ادبِ وجد کے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اس کے کھڑے ہونے پر سب کھڑے ہو گئے۔ بس اصل تو اتنی تھی بعد میں کسی کو یہ ہیئت طبعاً پسند آئی بس پاس کر لی (یعنی یہ بات اختیار کر لی کہ جب ذکر ولادت شریف ہو تو ضرور کھڑا ہو جائے) اب غلو کی یہ حالت ہے کہ نماز تو بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے عذر میں مگر میلاد بدون قیام نہیں ہوتا۔ بہر حال جب یہ وجد تھا تو جب غلبہ حال نہیں تو پھر اس کے اختیار کرنے کے کیا معنے۔ پھر یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج اور وفات کا بھی تو ذکر ہی ہے۔ نزول وحی کا ذکر بھی ذکر ہے پھر پیدا ہونے کے ذکر کی کیا تخصیص ہے بس رسم ہے اور کچھ بھی نہیں۔ جیسے بعض بعض جگہ سماع میں اختراعات ہو گئے ہیں کہ اصل تو گذر گئی رسم رہ گئی۔ ایک موقع پر ایک بزرگ پر عین سماع کے اندر ایک وجد طاری ہوا وہ اٹھ کر مسجد کی طرف چلے قوال ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے قوال بھی پہونچ گئے مسجد میں۔ بس اتنی حقیقت تھی۔ ایک دفعہ ایسا ہو گیا تھا۔ اب وہاں لازم ہو گیا ہے کہ عین سماع کے اندر صاحب سجادہ قصداً کھڑے ہوتے ہیں اور مسجد میں جاتے ہیں اور قوال ان کے پیچھے پیچھے ہوتے ہیں اور مسجد میں بیٹھ کر گانا بجانا ہوتا ہے۔ اسی طرح کوئی صاحب وجد ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سنکر کھڑے ہو گئے تھے محبت میں رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اور دوسرے شرکاءِ مجلس کھڑے ہو گئے اُن کی موافقت میں۔ میں پوچھتا ہوں کہ اب یہ لازم کیوں ہو گیا۔ اگر یوں کہو کہ جی چاہتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر کسی مستحب میں بھی احتمال ہو اوروں کے بگڑنے کا تو اُس کو نہ کرنا چاہیئے چہ جائیکہ مستحب بھی نہ ہو محض جی ہی چاہتی چیز ہو تو اگر میں اُس کو اس مفسدہ کے سبب ترک کر دیں تو کیا حرج ہے اور اگر بالکلیہ ترک کرنے کو دل گوارا نہ کرے تو اچھا ضرور اصلاح تو ضرور ہی ہونا چاہیئے۔ جس کی سہل صورت یہ ہے کہ میلاد میں کبھی قیام کریں کبھی نہ کریں اگر ایسا ہو تو کیا حرج ہے صاحب اگر پھر کوئی تم پر اعتراض کرے تب ہی کہیے مشکل تو یہ ہے کہ اس کو ایسا لازم سمجھتے ہیں کہ بھلا کوئی ترک قیام کرا تو لے۔ باقی منع کرنیوالے مطلقاً حرام نہیں

کہتے جیسا کرنے والے لوگ مطلقاً واجب سمجھتے ہیں بہرحال جب ایسی باتیں پیدا ہوگئیں تو اگر نہ کہا جائے تو کیا کیا جائے۔ اسی طرح گیارہویں میں گیارہ تاریخ کی پابندی نہ کرو کبھی نو کو کرلو کبھی بارہویں کو کرلو مگر عقیدہ درست رکھو اب تو یہ بھی نہیں اکثر لوگ گیارہویں ڈر کے مارے کرتے ہیں کہ نہ کریں گے تو حضرت سیدنا غوث پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ناخوش ہو جاویں گے جس سے کچھ ضرر ہوجاویگا اگر خوف سے نہ کرتے ان کو مقبول سمجھ کر محبت سے کرتے تو پھر پابندی کی کیا ضرورت تھی کیا مقبولین و اولیاء کی یہ شان ہوتی ہے کہ نذرانہ دو خوش ورنہ ناخوش۔ ایک جگہ کا واقعہ ہے کہ میں نے ان بدعات کے متعلق بیان کیا تو وعظ کے بعد ایک صاحب کہنے لگے کہ ایسے مسائل بیان کرنے کی ضرورت کیا تھی خواہ مخواہ لوگوں کو بھڑکانا۔ میں نے کہا ضرورت آپ ہی حضرات نے ثابت کی ہے اگر آپ یہ بدعات نہ کرتے ہوتے تو ہمیں ان کے رد کی نوبت نہ آتی۔ آپ کرنا چھوڑ دیں ہم رد کرنا چھوڑ دیں قصور تو آپ ہی کا ہے آپ عمل کرتے ہیں بلا ضرورت۔ ہم کہتے ہیں بضرورت۔ باقی ہم نفس عمل کو منع نہیں کرتے تم تخصیص تاریخ کی چھوڑ دو اور نیت اپنی درست کرلو ہم کچھ نہ کہیں گے۔ نیت یہ مت رکھو کہ روزگار میں ترقی ہوگی یا بیٹا ہوگا۔ نیت یہ رکھو کہ حضرت غوث اعظمؒ ہمارے محسن ہیں کہ ہم کو ان سے دین پہونچا اگر وہ تشریف رکھتے ہوتے تو ان کی خدمت کرتے اب یہ نہیں ہوسکتا تو ہم ان ثواب ہی بخش دیں تو پھر ہم منع نہیں کریں گے مگر معیار اس نیت کا یہ ہوگا کہ پھر سب کی نیاز ہونا چاہیئے ابو حنیفہؒ کی بھی امام بخاریؒ کی بھی (کیونکہ سب محسن ہیں) حضرت غوث اعظمؒ کی تخصیص نہ ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تخصیص کیوں کرلی ہے اسی طرح ہم قیام کو منع نہیں کرتے مگر کہیں تو ذکر ولادت کے وقت کھڑے ہوجاؤ کبھی رضاعت کے بیان میں کبھی معراج کے ذکر میں۔ علیٰ ہذا ایک ہی محفل میں تین چار دفعہ کھڑے ہوجاؤ۔ اگر اس طرح رکھو تو کون شخص منع کرے۔ یہ حقیقت ہے اس عمل کی۔ مقصود یہ ہے کہ محبت رسول یہ نہیں ہے جیسے تم کرتے ہو۔ محبت کے لوازم سے ہے کہ سب حقوق ادا کئے جائیں ان میں سے ایک ذکر بھی ہے۔ پھر ذکر میں درود شریف بھی ہے قرآن شریف کی تلاوت بھی جس میں جابجا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا نہایت جامع تذکرہ ہے اگر قرآن شریف ختم کرلیا تو گویا پورا ذکر کرلیا چنانچہ آپ کے تذکرہ میں فرماتے ہیں

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ الخ

ذکر میں کلام اللہ وغیرہ سب داخل ہیں صرف آپ کے پیدا ہونے کا ذکر

(حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر احسان کیا جبکہ ان میں ان ہی کی جنس سے ایک ایسے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا کہ وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں) اسی طرح بہت آیتیں ہیں ان سب آیات میں ذکر ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا اور ذکر بھی بادشاہوں کا سا۔ اگر کسی بادشاہ کی سوانح عمری لکھو تو کیا بس اتنا لکھو گے کہ فلاں تاریخ پیدا ہوا اور فلاں تاریخ تخت نشین ہوا۔ اصل سوانح عمری تو یہ ہے کہ اس نے اتنے ملک فتح کئے یہ یہ احکام جاری کئے اس اس طرح مخالفین کی سرکوبی کی ایسی ایسی شجاعت ظاہر کی یہ ہے اصل سوانح عمری بس اس قاعدہ سے آپ کی اصل سوانح عمری دو ہی چیزیں ہیں قرآن و حدیث۔ قرآن شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری شان ظاہر ہوتی ہے۔ آپکے اخلاق کا ذکر ہے چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۝ اور آپ کی شان میں فرماتے ہیں اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا (ہم نے آپ کو اس شان کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور مومنین کے لئے بشارت دینے والے اور کفار کو ڈرانے والے ہیں اور سب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں) اسی طرح حدیث میں آپکا کھانا پینا۔ سونا جاگنا اور دوسرے حالات مذکور ہیں۔ اے اللہ اس کا تذکرہ کیوں نہیں ہوتا۔ میں اس کی وجہ بتلاتا ہوں۔ ایک حریص سے پوچھا تھا کہ تجھ کو قرآن شریف میں کونسا حکم سب سے زیادہ پسند ہے اس نے کہا کُلُوْا وَاشْرَبُوْا کہ کھاؤ اور پیو۔ پوچھا دعا کونسی پسند ہے کہا رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ (اے ہمارے پروردگار ہم کو آسمان سے دستر خوان نازل فرما) پس جس طرح اس شخص کو یہ پسند آیا اور یہ پسند کیوں نہ آتا کیونکہ اور باتوں میں تو نفس کے خلاف کچھ کرنا پڑتا ہے اور اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اسی طرح ان لوگوں میں ایسے ذکروں میں یہ پسند آیا کہ آپکا نور پیدا ہوا پھر وہ آپ کی والدہ میں آیا پھر فلاں تاریخ ولادت شریف ہوئی بس اور یہ ذکر پسند نہیں آیا کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جاگ جاگ کر طاعت کی ہے۔ ایک ہی آیت کی تلاوت میں رات گذر گئی۔ پاؤں مبارک ورم کر گئے اور یہ ذکر پسند نہیں آیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناراضی ظاہر کی ہے معصیت سے۔ ریا سے۔ حرام خواری سے۔ اس کو نہیں بیان کیا جاتا۔ وجہ اس کی صرف یہ ہے کہ اس میں نفس کے خلاف کرنا پڑتا ہے سو اگر محض رسم ہی کی پابندی ہے تو اس کا علاج نہیں اور اگر عقل سے کام لینا کوئی چیز ہے تو کیا یہ شان ہوتی ہے محبین کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور تذکروں کو اڑا ہی دیں اسی طرح محبت کے لوازم سے ہے آپ کی شان میں گستاخی نہ کرنا اور آپکی تعظیم کی جاوے

نیز متابعت کرنا۔ میرے ایک صالح دوست نے جو کہ ذکر مبارک کے عاشق تھے خواب دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ہم اُس کی شفارش نہ کریں گے جو ہماری بہت تعریفیں کرے۔ ہم تو اُس کی سفارش کریں گے جو ہمارا کہنا مانے۔ یہ تو اُن کا ذکر تھا جنھوں نے بزعم خود آپکے حقوق میں سے صرف محبت کا پہلو لیا بعض وہ ہیں جنھوں نے عظمت کو لیا ہے نہ تو محبت ہے نہ متابعت اکثر یہ وہ لوگ ہیں جن پر تعلیم جدید کا مذاق غالب ہے طرز ان کا یہ ہے کہ یہ لوگ علماء سے علتیں احکام کی پوچھتے ہیں احکام میں خود علتیں نکالتے ہیں اور جو بات اپنی عقل نارسا و ناقص کے خلاف ہو اُس کے ماننے میں اُن کو تامل ہوتا ہے کہیں کہتے ہیں کہ پلصراط پر چلنا عقل کیخلاف ہے (اس لئے کہ وہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے تیز ہے پھر کیسے کوئی چل سکتا ہے) کہیں کہتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں کا بولنا عقل کیخلاف ہے غرض بڑی ارزاں چیز ان کے یہاں یہی ہے کہ جہاں چاہیں کہدیں کہ عقل کیخلاف ہے اُن امور میں سے ایک معراج بھی ہے کہ اُن کے نزدیک عقل کے خلاف ہے کہتے ہیں کہ تھوڑی دور جا کر ہوا نہیں ہے وہاں پہنچکر جاندار کسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا یہ طرز بتلا رہا ہے کہ ان کو محبت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی۔ کیونکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے اس کے احکام میں شبہ نہیں ہوا کرتا فرض کیجئے کسی عورت سے محبت ہو جائے اور وہ کہے کہ اپنا کرتہ نکال کر سر بازار برہنہ نکل جاؤ تو میں تم سے خوش ہوں گی تو اگر وہ شخص محبت و عشق میں پکا ہے تو کبھی نہ پوچھیگا کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ بلکہ یوں کہیگا کہ میرے محبوب نے اپنے راضی ہونے کی ایک صورت تو نکالی۔ مجکو اس فرمائش کی وجہ دریافت کرنے سے کیا غرض۔ میرا تو مطلب نکلتا ہے ہرگز کسی مصلحت اور حکمت کے معلوم ہونے کا انتظار نہ کریگا۔ محب کی تو بڑی مصلحت کا راضی کر دینا ہے جب ایک عورت مردار کی محبت میں یہ حال ہے کہ اس کے احکام کی علت دریافت نہیں کیجاتی تو یہ احکام تو دیکھو کیسی ذات مقدس کے ہیں اُن کی علتیں کیوں دریافت کی جاتی ہیں بس بات یہ ہے کہ جو لوگ احکام میں شبہات نکالتے ہیں ان کو محبت نہیں حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے اور اگر محبت نہیں ہے تو ان کا ایمان ہی کیا ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم تصریحاً فرماتے ہیں لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (یعنی تم میں سے کوئی مومن کامل نہیں ہو سکتا جب تک اس کو اپنے والد اور بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ مجھ سے محبت نہ ہو جائے) اس سے معلوم ہوا کہ جب تک اتنی محبت نہ ہوگی تو ایمان نصیب نہ ہوگا خود حق تعالےٰ فرماتے ہیں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو اللہ تعالیٰ سے زیادہ شدید محبت ہے)

بعض وہ لوگ ہیں جنھوں نے صرف عظمت کو لیا ہے محبت اور متابعت کو چھوڑ دیا

ایمان باللہ وہی جس میں محبت ہو شدت کیساتھ اور ایمان باللہ اور ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم متلازم ہیں پس
ایمان بالرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شرط بھی وہی شدت محبت ہو گی اور علاوہ شہادت قرآن و حدیث کے ویسے
بھی تو مشاہدہ ہے اور موٹی بات ہے کہ طاعت کا لطف ہی بلا محبت نہیں آتا جو طاعت بلا محبت کے
ہو وہ محض ضابطہ کی طاعت ہوتی ہے حقیقی طاعت نہیں ہوتی اس طاعت کی ایسی مثال ہو گی
جیسے انجن میں بھاپ نہو اور اُس کو مزدور ٹھیلتے ہوں جس کی رفتار کچھ بھی قابلِ اعتبار نہیں ہوتی
جہاں ٹھیلنا بند کیا بس رُک گیا۔ اسی طرح بدون محبت کے جو طاعت ہو گی قابلِ اعتبار نہیں
طاعت جب ہی قابلِ اعتبار ہو گی کہ آگ لگی ہوئی ہو۔ بھاپ بھری ہو محبت کی بلکہ قطع نظر
لطف کے آسان بھی طاعت جب ہی ہوتی ہے کہ جب محبت ہو۔ مثلاً ایک تو مزدور کا کہنا ماننا
اُس کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ جہاں آقا ٹلا اور کام سے بیٹھ گئے اور ایک کسی محبوب کا محب کو
کسی بات کی فرمائش کرنا اور اس کا کام پر لگ جانا اُس کی یہ حالت ہو گی کہ اگر اُس حالت میں
کوئی اس سے یہ بھی کہے کہ کھانا تو کھا لو تو وہ یہ ہی کہے گا کہ میں جب تک کام کو پورا کر لوں گا مجکو
کسی بات میں چین نہ آئیگا غرض مزدور کے کام میں اور محب کے کام میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے
خوب سمجھ لیجیے کہ دوام طاعت جو کہ عادۃً سہولت پر موقوف ہے بلا محبت نہیں ہوتا۔ پس جب
عقلاً بھی محبت طاعت مفروضہ کا موقوف علیہ ہے تو ضرور محبت بھی فرض ہے اور ان لوگوں کو
جب محبت نہیں تو ظاہر ہے کہ متابعت بھی نہیں جو محبت پر موقوف ہے اور ویسے بھی بدیہی ہے کہ
جو لوگ احکام میں شبہات نکالتے ہیں وہ عمل کیا خاک کریں گے۔ غرض محبت و متابعت سے
تو یہ عاری ہیں البتہ ان لوگوں کے قلب میں آپ کی عظمت ہے ضرور مگر عظمت بھی وہ نہیں جو
مطلوب ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت جس حیثیت سے ہونی چاہیئے وہ اُن میں نہیں
یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اصالتاً ایک شاندار اور عاقل بادشاہ سمجھتے ہیں اور ضمناً نبی بھی بس
زیادہ عظمت آپ کی ان کے دل میں بادشاہ ہونے کی حیثیت سے ہے نبی ہونے کی حیثیت سے
آپ کی زیادہ عظمت ان کے ذہن میں نہیں اگر نبی ہونے کی حیثیت سے اصل عظمت ہوتی تو احکام میں علتیں
نہ ڈھونڈتے کیونکہ نبی موسس احکام نہیں مبلغ احکام ہیں۔ اسی طرح آپ کا نام بانیٔ اسلام
نہ رکھتے جیسا کہ یہ لوگ آپ کو بانیٔ اسلام کہا کرتے ہیں میرے نزدیک یہ لقب عیسائیوں سے
لیا گیا ہے وہ لوگ اسلام کو خدا تعالےٰ کا بنایا ہوا نہیں سمجھتے بلکہ بوجہ انکار نبوت کے یہ
اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو بنایا ہے۔ مسلمانو! اِس لقب کو چھوڑو

خوب سمجھ لیجئے کہ بانیٔ اسلام خدا تعالیٰ ہیں آپ کی تو یہ شان ہے ؎

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند　　　　آنچہ استادِ ازل گفت بگو می گویم

(پسِ پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھا دیا ہے جو حکم استادِ ازل سے ملا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں۔)

آپ نے تو اُدھر سے سُنا اِدھر کہہ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی چیز خود نہیں بنائی۔ آپ تو حکایت بیان فرما رہے ہیں خدا تعالیٰ کی طرف سے مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ آپ صرف سفیر ہی نہیں بلکہ ہماری آقا اور سردار بھی ہیں اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک پیام پہونچانا تو وہ ہے جیسے ڈاکیہ خط پہونچاتا ہے اور ایک وہ جیسے اُستاد مضامین شاگرد کو پہونچاتا ہے استاد صرف حکایت کرنیوالا ہی نہیں بلکہ حاکم اور مُربّی بھی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی شان ہے بعض بے ادب لوگوں کو دھوکا ہوا ہے کہ نعوذ باللہ آپ کی مثال محض سفیر جیسی ہے سو یہ محض باطل ہے بلکہ ہم غلام ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور آپ ہمارے آقا ہیں۔ البتہ مبلغ ہونے کے معنے یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے گھٹاتے بڑھاتے نہیں ہیں اور اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ اجتہاد نہیں فرماتے تھے مگر وہ اجتہاد بھی مآلاً احکام وحی ہی میں داخل ہے کیونکہ جس اجتہاد کو قائم رکھنا ہوتا تھا وہ وحی سے منسوخ کر دیا جاتا تھا پس جو منسوخ نہ ہوا وہ بھی وحی منصوص بن گیا پس احکام اجتہادیہ میں بھی آپ کی یہی شان ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود　　　　گرچہ از حلقومِ عبد اللہ بود

(اس کا کہا ہوا اللہ تعالیٰ کا کہا ہوا ہے اگرچہ بندے کے منہ سے نکلا ہے)

اور اوپر جو کہا گیا ہے کہ آپ محض سفیر نہ تھے مُربّی تھے اس کا ایک کھلا قرینہ یہ ہے کہ آپ کی حالت یہ تھی کہ جب کوئی شخص اُمّت میں سے خلاف کرتا تھا تو آپ افسوس کرتے تھے کہ کیوں بگڑ رہا ہے سو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف اس طرح کام سپرد ہوتا جیسے سفیر کے ہوتا ہے تو آپ افسوس ہی کیوں کرتے کیونکہ جب آپ نے سفارت پوری کر دی تو آپ بری ہو گئے۔ سفیر کا کام تو اتنا ہی ہے خواہ کوئی جنت میں جائے یا دوزخ میں افسوس کے کیا معنی اس سے صاف معلوم ہوا کہ آپ سفیر محض نہ تھے۔ غرض نہ تو سفیر محض تھے جیسا اہلِ تفریط سمجھے ہیں اور نہ مخترعِ احکام تھے ہمارے متبوع تھے مگر وحی کے بالکل تابع جب یہ ہے تو آپ کے فرمودہ احکام خدا تعالیٰ کے احکام ہیں پھر خدا تعالیٰ کے احکام میں عقل دوڑانا چہ معنے کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم ہماری علم کے جنس سے نہیں کہ ہم وہاں تک رسائی کی فکر کریں سو جب ان لوگوں نے عقل دوڑائی تو

آپ محض سفیر نہیں بلکہ سردار بھی ہیں

اجتہاد کی [illegible]

[illegible]

معلوم ہوا کہ یہ لوگ آپ کی شانِ نبوّت کو مغلوب اور شانِ سلطنت کو غالب سمجھتے ہیں اور یہ خیال کہ یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف ایک بادشاہ شاندار سمجھتے ہیں اس کی دلیل یہ بھی ہے کہ جب کبھی یہ لوگ آپکے کارنامے بیان کرتے ہیں تو صرف بادشاہت کے کارنامے بیان کرتے ہیں آپکے فقر و فاقہ کو کبھی بیان نہیں کرتے کہتے ہیں کہ اس میں ہیٹی ہوگی مگر خوب سمجھ لو کہ جنکی عظمت محدود ہے اُن میں تو ایسی باتوں سے کمی ہوسکتی ہے ورنہ ان حکایتوں سے کیا کمی ہوتی بلکہ اگر کسی کے پاس لشکر وحشم وخدم سب کچھ ہو اور اس صورت میں اس کو غلبۂ رعب حاصل ہو تو وہ چنداں کمال نہیں۔ بڑی عظمت تو اس میں ہے کہ ایسی تو آپ کی حالت مگر پھر رعب کی کیا کچھ کیفیت۔ اِن لوگوں نے اپنے مذاق کے موافق قیاس کیا ہے جیسے ان کے یہاں اناج نہ رہے تو چھپاتے ہیں مہمان کے لئے کہیں سے سالن منگاتے ہیں تو مہمان سے چھپا کر لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ میرے یہاں کا قصّہ ہے وہ یہ کہ ایک دفعہ ہمارے یہاں سالن کم ہوگیا گھر کے لوگوں نے بھائی کے یہاں سے چھُپا کر سالن منگایا کہ مہمان کو خبر نہ ہو کہ یہ دوسری جگہ سے آیا ہے۔ جب کھانے بیٹھے تو میں نے صاف کہدیا کہ یہ بھائی کے یہاں سے آیا ہے۔ اور میں نے گھر میں کہا کہ ہم سے جو دوستوں کو محبّت ہے تو اللہ تعالیٰ کے واسطے ہے پھر اس میں اس کی کیا گنجائش دوسرے ہماری شان ہی کیا ہے جو گھٹ جاویگی سو اپنی نسبت تو ہمیں یہی کہنا چاہیئے کہ ہماری شان ہی کیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ دوسرا ہے کہ آپ کی اتنی بڑی شان ہے کہ وہ ایسی حکایات سے گھٹتی ہی نہیں کوئی سمندر سے ایک قطرہ لے لے تو اس میں کیا کمی ہوگئی۔ اگر چیونٹی نے ایک ریزہ مٹھائی کا حلوائی کی دُکان سے توڑ لیا تو اس کی دُکان میں کیا کمی ہوگئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ہی ارفع ہے آپکے اُمتیوں میں ایسے ایسے گذرے ہیں کہ سلطنت کی بھی پروا نہیں۔ حضرت غوث اعظم پاک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے پاس شاہ سنجر نے لکھا تھا کہ ملک نیمروز کا ایک حصّہ آپ کی خانقاہ کے خرچ کے لئے نذر کرنا چاہتا ہوں قبول فرمایئے۔ آپ نے جواب میں یہ دو شعر لکھے ؎

چوں چترِ سنجری رُخِ بختم سیاہ باد	دردل اگر بود ہوسِ ملکِ سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملکِ نیم شب	من ملکِ نیمروز بیک جو نمی خرم

۱ چترِ سنجر کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملکِ سنجر کا وسوسہ بھی ہو اس لئے کہ مجھے جب سے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اولیاء اللہ ایسے گذرے ہیں جو سلطنت کی پرواہ نہیں کرتے

نیم شب کی سلطنت ملی ہے میری نظر میں نیمروز کی سلطنت ایک جو کے برابر نہیں)

حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ جب سلطنت ترک کرکے چلے گئے تو ارکانِ دولت میں کمیٹی ہوئی کہ کسی طرح اُن کو لانا چاہیے وزیر گیا دیکھا کہ آپ گدڑی اوڑھے ہوئے بیٹھے ہوتے ہیں عرض کیا کہ حضور سلطنت درہم برہم ہو رہی ہے حضور تشریف لے چلیں آپنے فرمایا کہ یہ سلطنت تمہیں مبارک ہو مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت بڑی سلطنت عطا فرمادی ہے۔ اس کے بعد آپنے اپنی سوئی گدڑی سے نکال کر دریا میں پھینک دی اور وزیر سے کہا کہ میری سوئی دریا میں سے نکلوا دو۔ وزیر نے بیشمار آدمیوں کو دریا میں داخل کر دیا وہاں سوئی کا پتہ کہاں آپنے فرمایا کہ اچھا اب ہماری سلطنت دیکھو یہ کہکر مچھلیوں کو مخاطب کیا کہ اے مچھلیو میری سوئی لاؤ صدہا مچھلیاں اپنے اپنے منہ میں کوئی سونے کی کوئی چاندی کی سوئی لیکر حاضر ہوئیں۔ آپنے فرمایا کہ میری وہی لوہے کی سوئی لاؤ۔ ایک مچھلی وہی لوہے کی سوئی لیکر نکلی آپنے وزیر کے سامنے ڈالدی اور فرمایا کہ دیکھی میری سلطنت تمہیں اپنی سلطنت پر بڑا ناز ہوگا۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

رو بر سلطاں و کار و بار بیں　　حسن تَجرِی تَحتَھَا الاَنھَار بیں

(بادشاہ کے پاس جاؤ اور کاروبار دیکھو عمدہ باغ کہ اس کے نیچے نہریں جاری دیکھو)

عارف شیرازیؒ کہتے ہیں ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق راکیں قوم　　شہانِ بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

(یعنی گدایان عشق کو حقیر نہ سمجھو کیونکہ یہ لوگ شاہان بے تخت و تاج ہیں)

اور کہتے ہیں ؎

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہو لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستاروں پر حکم کرتا ہوں)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ میں زلزلہ آیا آپنے زمین پر پاؤں مار کر فرمایا اسکنی یا ارض اے زمین ٹھہر جا۔ بس زمین ٹھہر گئی۔ کیا حقیقت ہے سلطنت کی اس کے سامنے۔ ایک دفعہ دریائے نیل خشک ہوگیا ہمیشہ چڑھا کرتا تھا اُسی سے آبپاشی ہوتی تھی اُس دفعہ نہ چڑھا۔ عمرو بن العاص یا عبداللہ بن عمرو بن العاص مصر کے عامل تھے لوگوں نے آکر عرض کیا آپنے فرمایا کہ کبھی پہلے بھی ایسا ہوا ہے تو تم کیا کرتے ہو لوگوں نے کہا کہ جب ایسا ہوتا ہے تو

ہم ایک جوان حسین لڑکی بھینٹ دیتے ہیں اس سے وہ جاری ہوجاتا ہے آپ نے فرمایا کہ جاہلیت کی رسم کبھی نہیں ہوگی اسلام میں اور میں خلیفہ کو لکھتا ہوں انھوں نے حضرت عمرؓ کو لکھا حضرت عمرؓ نے نیل کے نام ایک حکمنامہ بھیجا جس کا مضمون یہ تھا کہ اے نیل اگر تو خدا تعالیٰ کے حکم سے جاری ہے تو کسی شیطان کے تصرف سے بند ہونے کے کیا معنے اور یہ نہیں ہے تو ہم کو تیری کچھ پروا نہیں خدا تعالیٰ ہمارا رازق ہے۔ آپ کے اس لکھنے پر مخالفین ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ دریا پر بھی حکومت کرتے ہیں مگر قلندر انچہ گوید دیدہ گوید (قلندر جو کچھ کہتا ہے دیکھا ہوا کہتا ہے) آپ کو شبہ بھی نہ ہوا کہ ایسا نہ ہوا تو عزت کرکری ہوگی۔ حضرت عمرو بن العاصؓ اس رقعہ کو اعلان کے ساتھ لیکر چلے اور مخالفین کا گروہ بھی آپ کے پیچھے چلا ہنستے تھے اور کہتے تھے کہ اس رقعہ سے اور دریائے نیل کے جوش سے کیا نسبت مگر وہ رقعہ دریائے نیل میں ڈالنا تھا کہ دریا کو جوش آیا اور لبریز ہوکر چلنے لگا۔ اور یہ باتیں تو کوڑہ مغزوں کے سمجھانے کے لئے ہیں واقع میں تو اُن کی سلطنت کچھ اور ہی ہے جس کو حضرت بایزید بسطامیؒ نے ذرا تیز الفاظ میں کہا ہے مگر پھر کوئی ایسا نہ کہے انھوں نے کہا ہے مُلْكِي أَعْظَمُ مِنْ مُّلْكِ اللهِ (میرا ملک اللہ تعالیٰ کے ملک سے بڑا ہے) جس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی چیزیں ہیں وہ تو ملک ہیں اللہ کا اور اللہ تعالیٰ مُلک ہے ہمارا اور ظاہر ہے کہ کہاں اللہ تعالیٰ کی علوشان اور کہاں دوسری چیزیں اس لئے ہمارا مُلک اعظم ٹھیرا اور یہ آپ نے مرتبۂ ناز میں کہا ہے ہر شخص کا منہ اس کہنے کے لائق نہیں کیونکہ ؎

نازرا روئے بباید ہمچو ورد　　　چوں نہ داری گرد بدخوئی مگرد

(ناز کے لئے گلاب جیسے چہرہ کی ضرورت ہے جب تم ایسا چہرہ نہیں رکھتے تو بدخوئی کے پاس مت بھٹکو)

حاصل یہ کہ ان کی سلطنت کو کیا پوچھتے ہو اور جب اولیاء اللہ کی یہ کیفیت ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ دنیوی سلطنت کیا بلا ہے۔ سو آپ صرف بادشاہ نہیں ہیں بادشاہ تو آپ کے غلام ہیں۔ آپؐ کو صرف بادشاہ قرار دینا تعظیم نہیں ہے آپ کو نبی قرار دینا یہ ادب اور تعظیم ہے مگر آپ کی تعظیم میں ایک امر نہایت لازم اور فرض ہے وہ یہ کہ حق تعالیٰ کا ادب ملحوظ رکھا جاوے آپ کو حق تعالیٰ کے برابر نہ کردیا جائے۔ آجکل تو واعظین ایسی حکایات تراشتے ہیں کہ جن کا سر نہ پاؤں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بھی اور اولیاء اللہ کی شان میں بھی چنانچہ ایک حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی ملے ہیں حکایات تراشنے کو ایک حکایت گھڑی ہے کہ ایک بڑھیا گئی حضرت غوث الاعظم رح کے پاس اور

کہا کہ میرا بیٹا مرگیا اس کو زندہ کر دیجئے آپنے فرمایا کہ زندہ نہیں ہو سکتا اُس کی عمر ختم ہو چکی تھی بڑھیا نے کہا کہ اگر اس کی عمر ختم نہ ہوتی تو آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی آپ سے تو اسی واسطے کہا ہے کہ عمر ختم ہو گئی اور آپ کو زندہ کرنا پڑیگا آپنے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا وہاں سے بھی اسی دلیل سے حکم ہوا کہ زندہ نہیں ہو سکتا آپنے بھی وہی جواب دیا جب کسی طرح عرض منظور نہ ہوئی اور اِدھر بڑھیا نے تنگ کیا تو آپنے عزرائیل سے تھیلا روحوں کا چھین اُسے کھول دیا ساری روحیں پھر پھر اُڑ گئیں اور تمام مُردے زندہ ہو گئے آپنے فرمایا کہ دیکھا ایک کو نہ جلایا اب اچھا ہوا عزرائیل نے خدا تعالیٰ کے یہاں نالش کی وہاں سے حکم ہوا کہ ہم کو دوست کی خاطر منظور ہے خیر جیسے وہ کہیں ویسی ہی سہی اِلٰہی توبہ کتنی بڑی گستاخی ہے حق تعالیٰ کی شان میں۔

کیا خدا تعالیٰ کی سلطنت اودھ کی سلطنت ہے کہ کوئی قاعدہ قانون ہی نہیں جس کا جو جی چاہا کر گذرا۔ ایسی غیر آئین سلطنت پر ایک حکایت یاد آئی۔ کوئی شہر تھا اَن نیاؤ پور۔ اَن نفی کا کلمہ ہے نیاؤ کے معنے ہیں انصاف کے اور پور شہر کو کہتے ہیں اس کے معنے ہوئے بے انصافی کا شہر۔ ایک گرو اور ایک اُس کا چیلہ اُس شہر میں جا پہونچے اور چیزوں کا بھاؤ پوچھا۔ سب کا بھاؤ سولہ سیر۔ گیہوں بھی سولہ سیر۔ چنے بھی سولہ سیر۔ گھی بھی سولہ سیر۔ نمک بھی سولہ سیر۔ گوشت بھی سولہ سیر غرض سب کا ایک ہی بھاؤ۔ گرو نے یہ حال دیکھ کر چیلہ سے کہا کہ یہاں سے چلو یہ شہر رہنے کے قابل نہیں۔ یہاں کھرے کھوٹے سب ایک بھاؤ تلتے ہیں۔ چیلہ نے کہا کہ ہم تو یہاں رہیں گے خوب گھی کھائیں گے طاقت آئے گی۔ ہر چند گرو نے سمجھایا مگر اس نے ایک نہ مانی۔ خیر ایک عرصہ تک وہاں رہا کئے۔ افراط سے سب چیزیں ملیں چیلہ کھا کھا کر خوب موٹا ہوا۔ ایک دفعہ اتفاق سے ایوان شاہی پر پہونچے راجہ کے یہاں ایک مقدمہ پیش تھا وہ یہ کہ دو چور کسی مہاجن کے یہاں گئے تھے چوری کرنے نقب دیکر ایک باہر پہرہ پر رہا ایک اندر گیا اُس پر وہ دیوار گر پڑی دب کر مر گیا اُس کے ساتھی نے دعویٰ دائر کر دیا مہاجن پر کہ اس نے دیوار کمزور بنائی تھی کہ وہ گر پڑی۔ مہاجن کو حاضر کیا گیا اُس نے عذر کیا کہ میرا قصور نہیں معمار نے ایسی دیوار بنائی تھی۔ معمار حاضر کیا گیا اُس سے پوچھا اُس نے کہا کہ مزدور نے گارا پتلا کر دیا تھا اُس نے اینٹ کو اچھی طرح نہیں پکڑا۔ مزدور حاضر کیا گیا اُس سے پوچھا گیا اُس نے کہا سقہ نے پانی زیادہ چھوڑ دیا تھا اِس لئے گارا پتلا ہو گیا۔ سقہ حاضر کیا گیا اُس نے کہا کہ سرکاری ہاتھی میری طرف دوڑا آرہا تھا مشک کا

ان نیاؤ پور کی ایک حکایت مزاقیہ

دہانہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا اس لئے پانی زیادہ پڑ گیا فیلبان کو حاضر کیا گیا اس نے کہا کہ ایک عورت بجتا ہوا زیور پہنے آرہی تھی پازیب کی جھنکار سے ہاتھی چونک گیا وہ عورت حاضر کی گئی اُس نے کہا کہ سُنار نے پازیب میں باجا ڈال دیا تھا سُنار کو حاضر کیا گیا اُس کو کچھ جواب نہ آیا۔ آخر کہیں تو سلسلہ ختم ہونا۔ آخر یہ تجویز ہوا کہ اس سنار کو پھانسی دیجائے۔ اُس کو پھانسی پر لے گئے اور گلے میں پھانسی ڈالی اس کی گردن ایسی پتلی تھی کہ حلقہ اُس کے گلے میں برابر نہ آیا حلقہ تھا بڑا۔ جلاد نے آکر کہا کہ حلقہ اُس کے گلے میں نہیں آتا اس پر یہ تجویز ہوا کہ کسی موٹے سے کو پھانسی دیدو۔ تلاش ہوئی تو سوائے چیلے صاحب کے اتنا موٹا کوئی اور نہ ملا یہ پکڑے گئے انھوں نے گروجی سے کہا کہ اب کیا کروں۔ گروجی نے کہا کہ بھائی میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ شہر رہنے کے قابل نہیں مگر تو نے نہ مانا اب اپنے کئے کو بھگت۔ چیلہ نے کہا کہ حضور کسی طرح بچایئے کچھ تو کیجئے آخر آپ کا بچہ ہوں گرو نے تدبیر نکالی کہ آپس میں جھگڑنا شروع کیا گرو کہے کہ مجھے پھانسی دو اور چیلہ کہے کہ مجھے دو خوب جھگڑے یہاں تک کہ راجہ تک نوبت پہونچی۔ راجہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ گرو نے کہا کہ یہ ایسی ساعت ہے کہ جو کوئی اس ساعت میں پھانسی چڑھے تو سیدھا بیکنٹھ جائے اس لئے ہم جھگڑتے ہیں کہ پھر ایسی ساعت نہ ملے گی۔ راجہ نے کہا کہ پھر اس سے اچھا موقعہ کہاں نصیب ہوگا ہمیں پھانسی دیدو۔ چنانچہ اس منحوس کو پھانسی دیدی گئی۔ ایسے راجہ کو پھانسی ہی دینا اچھا۔ پاپ کٹا خس کم جہاں پاک۔ یہ قصہ تھا اَن نیاؤ پور کا سو بہت سے لوگ مسلمان ہو کر الٰہی سلطنت سمجھتے ہیں خدا تعالےٰ کی جیسے اَن نیاؤ پور کی حکومت کہ کوئی قاعدہ اور قانون ہی نہیں اندھا دھند معاملہ ہے جس کے کچھ اُصول ہی نہیں۔ صاحبو کتنا بڑا ظلم و ستم ہے کہ اولیاء کو یا انبیاء کو خدا تعالےٰ کی برابر بلکہ مطابق الٰہی خرافات حکایات کے خدا تعالےٰ سے بڑھ کر قرار دیا جاوے اس لئے کہتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا مت بڑھاؤ کہ خدا تعالےٰ میں ملا دو کہ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو ناخوش ہوں گے اب بعض وہ لوگ رہ گئے کہ کسی قدر متابعت تو کرتے ہیں مگر نہ اُن کے دل میں عظمت ہے اور نہ محبت اور یہ لوگ زیادہ اُن میں ہیں جو آجکل کسی امام کا اتباع نہیں کرتے کہتے ہیں کہ ترجمے موجود ہیں ضرورت کیا ہے اکابر کی اتباع کی۔ ہم خود دیکھ کر سمجھ سکتے ہیں اگر عربی نہیں سمجھتے تو ترجمہ ہی سے احکام نکال لیتے ہیں سو ان میں بعض لوگ ایسے ہیں کہ نہ بزرگوں کا ادب کرتے ہیں نہ صحابہؓ کا نہ ائمہ کا۔

بعض لوگ متابعت کرتے ہیں مگر ان میں عظمت و محبت نہیں

بعض لوگ نہ صحابہ کا ادب کرتے ہیں نہ ائمہ کا

اور بلکہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں خشک الفاظ استعمال کرتے ہیں بس ظاہرا اطاعت تو کرتے ہیں اور بدعات سے بھی بچتے ہیں مگر نہ عظمت جیسا بیان ہوا اور نہ وہ سوز و گداز جو محبت میں ہوتا ہے غرض اس وقت یہ تین جماعتیں ہیں۔ ایک وہ جو محبت رکھتے ہیں مگر اتباع و عظمت نہیں۔ ایک وہ جو عظمت کرتے ہیں لیکن محبت و اتباع نہیں۔ ایک وہ جو اتباع کرتے ہیں مگر عظمت و محبت نہیں۔ سو یہ تینوں جماعتیں پورے حقوق ادا نہیں کرتیں کسی نے ایک کو لیا دو کو چھوڑا کسی نے دو کو لیا تیسرے کو چھوڑا علیٰ ہذا۔ جامع وہ شخص ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں۔ متابعت میں۔ عظمت میں سرافگندہ رہتا ہو بس

اس وقت میں تین قسم کی جماعتیں ہیں

اس آیت میں یہی مضمون ہے آیت کا ترجمہ پہلے کرنا چاہیے تھا لیکن تمہید میں مضمون طویل ہو گیا اب ترجمہ کرتا ہوں فرماتے ہیں حق تعالیٰ شانہ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا رَّسُوْلًا الخ اس کی توجیہ میں اختلاف ہے۔ ایک توجیہ تو یہ ہے کہ ذکر کی تفسیر کلام مجید سے کی جائے اور ذکرا کا بدل الاشتمال ہے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور ایک توجیہ یہ ہے کہ ذکرا کے معنی ہیں شرفا کے اور رسولا اُس سے بدل الکل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک شرف نازل کیا سو شرف کا لفظ عظمت کو ظاہر کر رہا ہے۔ وہ کون ہیں رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اَنْزَلَ بھی آپ کے شرف پر دلالت کر رہا ہے

آیت کا ترجمہ اور لفظ ذکر و رسول کی ترکیب

کیونکہ انزال اوپر سے نیچے آنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تھی تو اونچی رکھنے کی چیز بوجہ شرف کے مگر تمہاری خاطر سے نیچے بھیج دیا ہے اس صورت میں آپ کا شرف در شرف ظاہر ہو گیا۔

انزال کے معنی

اگر کسی کو شبہ ہو کہ دوسرے موقع پر قرآن شریف میں ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ کہ ہم نے لوہے کو نازل کیا حالانکہ وہاں اوپر سے نیچے آنا نہیں پایا جاتا کیونکہ لوہا آسمان سے تو نازل نہیں ہوتا وہ تو زمین میں سے نکلتا ہے اس لئے انزال کے معنے اوپر سے نیچے آنے کے کہاں ہوئے۔ جواب یہ ہے کہ وہاں تعذر حقیقت کے سبب مجاز مراد لیا ہے اور لَقَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا میں تعذر نہیں اس لئے حقیقت مراد ہے۔ دوسرے علماء نے اس کی بھی یہ توجیہ کی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ کئی چیزیں آئی تھیں۔ ہتھوڑا نکالا اور کئی چیزیں تھیں اور وہ اوپر ہی سے آئی تھیں تیسری توجیہ یہ کہ حدید نکلتا ہے زمین سے اور سبب اور مادہ اُس کا بخارات ہیں جو پانی سے پیدا ہوتے ہیں اور پانی اوپر سے آتا ہے اور زمین میں نفوذ کرتا ہے سو اس طرح بھی معنے حقیقی ہی ہیں۔ غرض حقیقی معنے انزال

انزلنا الحدید کی توجیہ

عہ دشوار ہونا۔ عذر اور حجت لانا کسی بات میں عہ لوہار اور وہ چیز جس کو تیز کیا گیا ہو یعنی چھری کے۔

کے اوپر سے آنے کے ہیں اور اَنْزَلَ کا کلمہ بارش کے لئے بھی آیا ہے سو آپ کے اِس کا استعمال ہونا یہ اشارہ اس طرف بھی ہے کہ آپ کی شان بارش کی سی ہے کہ وہ بھی رحمت ہے اور آپ بھی رحمت چنانچہ حدیث میں ہے اَنَا رَحْمَۃٌ مُّھْدَاۃٌ یعنی میں خدا تعالیٰ کی رحمت ہوں جو بندوں کے لئے خدا تعالیٰ کے پاس سے تحفہ کرکے آیا ہوں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خاصیت بارش کی سی ہے چنانچہ بارش سے حیات ہوتی ہے ارض کی اور آپ سے حیات ہوتی ہے قلب کی۔ ایک شعر حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحبؒ نے ایسے موقع پر پڑھا تھا کہ کسی نے آپ سے مسئلہ مولد کے متعلق پوچھا تھا آپ نے فرمایا لو ہم مولد پڑھتے ہیں اور یہ شعر پڑھا

تر ہوئی باران سے سوکھی زمیں   یعنی آئے رَحْمَۃٌ لِّلْعَالَمِیْن

اِس شعر سے میرے اِس مضمون کو اور قوت ہوگئی۔ غرض ذِکْرًا میں آپ کی عظمت کیطرف اشارہ ہے رَسُوْلًا میں متابعت کی طرف کیونکہ مدار متابعت کا رسالت ہے اور اٰمَنُوْا میں محبت کی طرف کیونکہ ایک آیت میں ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (ایمان والے اللہ تعالیٰ سے شدید محبت رکھتے ہیں) اور حبّ اللہ تعالیٰ اور حبّ الرسول صلے اللہ علیہ وسلم میں تلازم ہے تو جس طرح ایمان کے لئے اللہ تعالیٰ کی شدت محبت لازم ہے اسی طرح رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی شدت محبت۔ آگے ہے مُبَیِّنَاتٍ یعنی خود ظاہر بھی اور ظاہر کرنے والے بھی آگے ارشاد ہے لِیُخْرِجَ الَّذِیْنَ الخ لیخرج میں لام غایت کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیوں بھیجا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اس لئے کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے برکات حاصل کریں اور یہ شبہ نکیا جاوے کہ جو ایمان اور عمل صالح کے ساتھ موصوف ہوگا وہ تو خود ہی خارج مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (ظلمات سے نور کی طرف نکلنے والا) ہوگا پھر ان کے خارج کرنے کے کیا معنی سو مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ظلمت سے نور کی طرف خارج ہوئے ہیں وہ ایمان اور اعمال صالحہ کرکے ہوئے ہیں یعنی یہ برکت ایمان اور اعمال صالحہ ہی کی ہے کہ وہ تاریکی سے نور کی طرف لے آئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ آپ کے پورے حقوق ادا کرنے چاہئیں یعنی ذکر بھی کریں محبت بھی کریں متابعت بھی ادب و تعظیم بھی۔ آگے آیت میں خاصیت ایمان اور اعمال صالحہ کی بیان فرماتے ہیں وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ الخ مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اعمال صالحہ کرکے کیا ملے گا۔ بشارت دیتے ہیں کہ یہ ملیگا یُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا قَدْ اَحْسَنَ اللّٰہُ لَہٗ رِزْقًا یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ ہے کہ حق تعالیٰ ایسی جنات

میں داخل فرمائیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خالدین میں یہ بتلایا کہ وہ نعمتیں بلا حساب اور بلا انقطاع ہوں گی۔ یہی دو صورتیں کمالِ نعمت کی ہوتی ہیں کہ نفیس بھی ہو کہ مزیت کیفاً ہو اور بلا انقطاع بھی ہو کہ مزیت کماً ہو سو یہ جنت میں حاصل ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ نے اس لئے بھیجا ہے کہ آپ کے جملہ حقوق ادا کر کے جنت کی نعمتیں حاصل کریں اور اگر حقوق ادا نہ کیے برائے نام تھوڑی سی تعریف کرلی یا محفل منعقد کرلی اس سے کچھ نہیں ہوتا مثلاً طبیب کی تعریف سے کیا فائدہ جب تک اس سے نسخہ لکھا کر اس کا استعمال نہ کیا جاوے اور اس کے کہنے پر عمل نہ کیا جاوے اور یہ حقوق آپ کے دائمی ہیں تو آپ ایسی بارش کے مشابہ نہیں جو کسی خاص موسم میں ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بارش ہیں کہ جس سے ہمیشہ بہار رہی بہار ہے کبھی خزاں ہی نہیں یہ نہیں کہ ربیع الاول میں تو بہار ہوا اور مہینوں میں نہ ہو۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی بہار جو حیات میں تھی وہ اب بھی بحالہ ہے اب میں اس مضمون کے مناسب اس شعر پر اپنے وعظ کو ختم کرتا ہوں ؎

(حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی مدح کافی نہیں)

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست خم و خمخانہ با مہر و نشان ست

(وہ ابر رحمت ابھی تک درفشاں ہے خم و خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے۔)

محروم ہے وہ شخص جو اپنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے برکات حاصل نہ کرے۔ دعا کیجئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نصیب ہو متابعت کی توفیق ہو آپ کی عظمت ہو قلب میں فقط اور اس وعظ کا نام بمناسبت کلمات قرآنیہ کے ذکر الرسول صلے اللہ علیہ وسلم مناسب ہے اور لقب اس کا بمناسبت آپ کے معنوی برکات کے مشابہ ہیں باران و بہار کے الربیع فی الربیع مناسب ہے۔ (پھر دعا کر کے جلسہ ختم کیا۔)

الحمد للہ کہ وعظ ذکر الرسول صلے اللہ علیہ وسلم ملقب بہ الربیع فی الربیع چھپ کر تمام ہوا۔ اس کے علاوہ حضرت مرشدنا و مولانا محمد اشرفعلی صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے دیگر مواعظ و تصانیف اور دوسری کتب دینیہ و قرآن شریف وغیرہ پتہ ذیل سے طلب فرمائیے۔

مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ ایم اے جناح روڈ کراچی ۱

؎ فی القاموس اربع یربع نما و زاد و فیہ المربع الخصیب فی الحدیث غیثاً خبیثاً مربیاً مربعاً و فیہ ایضاً فی وصف المطر مربع النبات فی اللمعات مربعاً ای آتیاً بالربیع والخصب و یقال امرعت الارض اخصبت و یروی مربعاً بضم المیم و کسر الیاء (۱) من ابتہا الربیع آہ فالمربع یستعمل مفعولا مجردا او فاعلا مزیدا من الربیع او فعیلا من المرع و معنا ہما متقارب و بہ ظہر وجہ التقلیب ۱۲ منہ

قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً

الوعظ

مسمّٰی بہ

اَلشَّرِيْعَةُ

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ۔ بندر روڈ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ مسمّٰی بہ

الشریعۃ

اين	متى	كم	كيف	ماذا	من اى شان	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کس ہیئت سے ہوا	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کے لئے زیادہ مفید تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
مطبع نظامی کانپور [illegible]	۱۰ ذیقعدہ ۱۳۲۳ھ [illegible]	۳ گھنٹہ ۲۵ منٹ	کھڑے ہو کر	وجوب اتباع شریعت و ابطال [illegible] عقلی و نقلی	[illegible] زیادہ مفید تھا	[illegible]	۵۰۰	مجمع [illegible]

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۲

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ

امابعد فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰکَ عَلٰی شَرِیْعَۃٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْھَا وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّھُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْکَ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا ط وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ج وَاللّٰہُ وَلِیُّ الْمُتَّقِیْنَ ۝ ھٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَھُدًی وَّرَحْمَۃٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ۝ (پھر ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا سو آپ اسی طریقہ پر چلے جایئے۔ اور ان جاہلوں کی خواہشوں پر نہ چلئے۔ یہ لوگ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے۔ اور ظالم ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دوست ہے نیک لوگوں کا یہ قرآن عام لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ اور یقین لانے والوں کے لئے بڑی رحمت ہے۔)

یہ چند آیتیں ہیں سورۂ جاثیہ کی اِن میں حق تعالیٰ نے ایک نعمت کا ذکر فرمایا ہے جو عطا کی گئی ہے اوّلاً بالذات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً وبالتبع حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمّت کو۔ اور چونکہ اِس نعمت کو نعمت نہیں سمجھا جاتا بلکہ بجائے نعمت کے مصیبت وکلفت سمجھا جاتا ہے اس لئے اِس وقت اس کا اختیار کرنا ضروری ہوا۔ اب یہاں تک مذاق بگڑا ہوا ہے کہ اتنی بڑی نعمت کی قدر نہیں بلکہ اِس کو مصیبت اور کلفت سمجھ کر اس سے بچنے کی فکر ہے جیسے کوئی مریض دوا کو مصیبت سمجھے اور اس سے بڑھ کر ناشکرا وہ ہے جو غذائے لطیف کو مصیبت سمجھے اِس کو ایک اچھی اور لطیف غذا دی جاتی ہے اور وہ اس سے منہ بند کرتا ہے تو ایسے شخص کے اعتقاد کو درست کرنا اور خیال کی اِصلاح نہایت ضروری ہے۔ وہ نعمت کیا ہے جسے کلفت سمجھا جاتا ہے وہ شریعت ہے جو اسی عنوان سے اِس آیت میں مذکور ہے اور باعتبار اختلاف احوال مکلفین کے اس کے دو درجے ہیں دوا اور غذا اور دونوں میں کوئی تعارض نہیں بلکہ ایک ہی چیز ہے جو بعض کے اعتبار سے دوا ہو اور دوسری ۴
بعض کے اعتبار سے غذا۔ اور غذا تو نعمت ہوتی ہی ہے مگر دوا بھی واقع میں نعمت ہے کیونکہ مریض کے حق میں دوا ہی ذریعہ ہے غذا کا کیونکہ دوا کا مقصود مریض کے لئے یہی ہو کہ نعمتوں کا نعمت ہونا اس کو محسوس ہو موٹی بات ہے کہ ایک کو دودھ ہضم نہ ہوتا ہو یا گوشت ہضم نہ ہوتا ہو اور ان میں لذت اور قوت اور فرحت سب ہے مگر ایک شخص کو فساد معدہ کی وجہ سے ہضم نہیں ہوتا تو اس کی کیا تدبیر کی جاویگی اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ خوب کھاوے اور دست آویں یہ مذاق ہے وہ جو یہ تدبیر کرے۔ ہمارے وطن میں ایک بوڑھے تھے کھاتے جاتے اور قے کرتے جاتے اور منہ صاف کرکے پھر کھاتے حالانکہ اس کی یہ تدبیر نہ تھی بلکہ اُن کو دوا سے اپنی اصلاح کرنا چاہئے تھی تو ایسے شخص کے حق میں دوا بھی نعمت ہے۔ اِسی طرح شریعت بعض کے اعتبار سے دوا ہے مگر چونکہ ذریعہ غذا کا ہے اِس لئے اس کے حق میں بھی نعمت ہو اور جن کے حق میں غذا ہے اس کا نعمت ہونا تو ظاہر ہی ہے۔ اب سمجھنا چاہئے کہ

شریعت دوا کس کے حق میں ہے اور غذا کس کے حق میں سو دوا تو اس کے حق میں
ہے جو ابھی کلفتِ مجاہدہ میں ہے اور لوگ اس مجاہدہ ہی سے گھبراتے ہیں اور جو اس کا
قصد بھی رکھتے ہیں وہ منتظر بوڑھاپے کے ہیں حالانکہ اس وقت آدمی قریب قریب
معطل ہو جاتا ہے پھر اخلاق ذمیمہ جو شباب میں راسخ ہو چکے ہیں وہ جدا مزاحمت
کرتے ہیں کیونکہ جو خصلتیں جوانی میں جم چکتی ہیں وہ بڑھاپے میں بھی نہیں جاتیں
مگر پھر بھی لوگ کہا کرتے ہیں کہ جوانی میں کھانے پینے کے دن ہیں جب بڑھاپا آئیگا
تو اللہ اللہ کریں گے یہ غلطی ہے دو وجہ سے اوّل تو جس چیز کی عادت جوانی میں
نہ ہو وہ بڑھاپے میں یوں بھی نہیں ہو سکتی دوسرے بڑھاپے میں قوت وہمت
نہیں رہتی کسل بڑھ جاتا ہے مشکل سے ٹھیل ٹھیل کے اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے فرض نماز
کے لئے مشکل سے اٹھا جاتا ہے ایک بزرگ کہتے تھے کہ یہ قول کہ ؎

دریغا کہ عمر جوانی گئی　　　جوانی گئی زندگانی گئی

۴ ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ زندگانی کیونکر گئی کیونکہ بڑھاپا آنے سے اور آرام
سے بیٹھے رہتے ہیں لڑکے بالے یا نوکر چاکر پنکھا جھل رہے ہیں پاؤں دبا رہے ہیں
مگر جب بڑھاپا آیا تو واقعی سمجھ میں آگیا کہ جوانی گئی زندگانی گئی کیونکہ نہ کھانے کی حلاوت
نہ پینے کا مزہ نہ سونے کا چین نہ جاگنے کا لطف اگر دماغ میں یبوست غالب ہے تو
سب لوگ سو رہے ہیں یہ رات بھر اختر شماری میں مشغول ہیں نیند ہی نہیں آتی
اور اگر رطوبت غالب ہے تو ہر وقت آنکھیں بند ہیں اونگھ رہے ہیں اٹھنا چاہتے
ہیں مگر اٹھا نہیں جاتا پھر اس کے علاوہ کہیں ناک میں درد ہے کہیں کان دکھتا
ہے کبھی ٹانگ میں درد ہے کبھی برسات کی ہوا لگ کر کمر میں درد ہی جیسے مولانا رومی رح
نے ایک بوڑھے کی حکایت لکھی ہے کہ وہ ایک طبیب کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ
میرے سر میں درد ہے طبیب نے کہا کہ بڑھاپے سے اس نے کہا کہ زکام بھی ہے اس نے
کہا بڑھاپے سے اس نے کہا کہ بلغم بھی سینہ پر جما ہوا ہے اس نے کہا یہ بھی بڑھاپے
سے ہے اس نے کہا کھانا بھی اچھی طرح ہضم نہیں ہوتا اس نے کہا یہ بھی بڑھاپے سے

غرض اس بوڑھے نے جو کہا اس کے جواب میں طبیب نے یہی کہا کہ یہ بھی بڑھاپے سے یہ سن کے
وہ بوڑھا بہت غصہ ہوا اور ایک دھول ماری طبیب کے تیری طب میں یہی رہ گیا ہے کہ
بڑھاپے سے اُس نے کہا کہ میاں صاحب میں تمہاری اِس دھول مارنے کا بُرا نہیں
مانتا تم معذور ہو یہ بھی بڑھاپے سے ہے واقعی طبیب کامل تھا کہ سمجھ گیا کہ یہ ناحق
کا غصہ بھی بڑھاپے ہی سے ہے بہرحال یہ تو زندگانی کا لطف گیا اور وہ جو جوانی
میں لوگوں کے دلوں میں وقعت تھی باستثناء اہل اللہ کے وہ بھی چلی گئی کیونکہ
ان کی دوستی سچ مچ کی دوستی ہے کیونکہ وہ محض دین کی وجہ سے ہوتی ہے اوروں
کی دوستی محض اغراض کی وجہ سے ہے جب بڑھاپا آیا تو بڑے میاں اپنی ہی اغراض
پورے نہیں کر سکتے تو اوروں کے کیا پورے کریں گے تو جب واسطہ نہیں رہا تو دوستی
بھی ختم ہو گئی اور اہل اللہ کو جو مستثنیٰ کیا ہے مراد اس سے وہ ہیں جو واقع میں
اہل اللہ ہیں اور جو واقع میں اہل اللہ نہیں اور اپنے کو صورت میں اہل اللہ کی
پیش کرتے ہیں ان کی دوستی تو دنیا داروں سے بھی بدتر ہے کیونکہ یہ دعویٰ کرتے ۵
ہیں تقدس کا پھر ان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں بعض تو خود اپنے کو غلطی سے
اہل اللہ سمجھ رہے ہیں مگر واقع میں وہ اہل اللہ نہیں ہیں اور ان کی غلطی کی بناء
یہ ہے کہ چار جاہل عوام معتقد ہو گئے اور انھوں نے حضور حضور مولانا مولانا
شاہ صاحب شاہ صاحب کہنا شروع کر دیا تو یہ سمجھے کہ میں بھی کچھ ہوں گا
جب ہی تو یہ معتقد ہوئے ہیں کیونکہ جو معتقد ہوئے ہیں وہ پاگل تو ہیں نہیں
کچھ سمجھ ہی کے معتقد ہوئے ہیں سُبحان اللہ اچھا اِستدلال ہے اگر مخلوق کی
عقیدت پر دارومدار ہے بزرگی کا تو کیوں صاحب سب ہی تو معتقد نہیں
ہیں غیر معتقدین بھی تو ہیں ان کی بداعتقادی سے کیوں نہ استدلال کیا جائے
سچ یہ ہے کہ نہ خوش اعتقادی کوئی چیز ہے نہ بداعتقادی ضابطہ یہ ہے کہ
خدا تعالیٰ کے ساتھ اپنا معاملہ کیسا ہے اگر خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ اچھا
نہیں ہے تو ساری دنیا کا غوث و قطب کہنا کوئی چیز نہیں غرض عوام کا

اعتقاد کچھ نہیں ؎

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خود را عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند

چند جاہلوں کے معتقد ہونے سے عیسیٰ نہیں ہو سکتے اگر کچھ ہے تو کسی صاحب نظر کو دکھلاؤ اگر وہ تصدیق کر دے تو ٹھیک ہے ورنہ محض جہلار کے اعتقاد سے کچھ نہیں ہوتا جہلار کا اعتقاد کا ہے پر ہے تو ان کا اعتقاد تو اس پر ہے کہ جو ہماری مرضی کے موافق ہو وہ ٹھیک ہے اور جو مرضی کے خلاف ہو تو فیہ کلام جب ان کا یہ مدار اعتقاد ہے تو اس فکر میں پڑنا ہی لاحاصل ہے مخلوق تو ہزاروں ہی اور ہر ایک کی خواہش دوسرے کے معارض تو پھر کس کو کس کو راضی کرے۔ ہمارے حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک حکایت بیان فرمائی کہ ایک شخص تھا اس کے پاس ایک ٹٹو تھا اور بیوی بچّے اور کنبہ رکھتا تھا اس کو سفر پیش آیا اس نے تجویز کی کہ ایک جانور ہے اور کئی سوار ہیں باری باری سب مل کے چڑھتے اُترتے چلے جائیں گے۔ چنانچہ پہلے وہ خود سوار ہوا اور اپنے سیانے لڑکے کو ۶
اور بیوی کو پیادہ لے کے چلا چلتے چلتے ایک گاؤں میں گذر ہوا گاؤں والوں نے اُسے سوار دیکھ کر کہا کہ تجھے سوار ہوتے شرم نہیں آتی کہ بچہ پیادہ اور عورت جو قابل رحم ہے وہ پیادہ اور ہٹا کٹا ہو کے سوار ہے اُس نے کہا بات تو ٹھیک ہے بس خود اُتر پڑا اور بیوی کو سوار کر دیا دوسرے گاؤں میں پہونچا گاؤں والوں نے دیکھ کے کہنا شروع کیا کہ جورو کا غلام ہے کہ سائیس کی طرح گھوڑے کی رسی پکڑے چلا جا رہا ہے ارے کمبخت تجھ پر کیا مار آئی تو نے اپنا وقار کیوں کھویا اُس نے کہا یہ بھی سچ ہے آؤ ابکی سب مل کے سوار ہوں چنانچہ وہ اِس حالت میں ایک تیسرے گاؤں میں پہونچا وہاں لوگوں نے کہا کہ ارے کیسا ظالم ہے کہ جانور پر سب کو ایک دم سے لاد دیا ہے ارے ایک دفعہ گولی مار دے ترسا ترسا کے مارنے سے کیا فائدہ اُس نے کہا یہ بھی معقول فرداً فرداً بھی بیٹھ چکے عورت کو بھی تنہا سوار کر چکے سب مل کے بھی بیٹھ چکے اب صرف یہی اِحتمال باقی ہے کہ

کوئی بھی سوار نہ ہو چنانچہ سب مل کے پیادہ پا چلے اب پانچویں گاؤں پر گزر ہوا وہاں لوگوں نے اس حالت کو دیکھ کے کہا دیکھی ناشکری خدا تعالیٰ نے سواری بھی دی تو اس کی قدر نہیں ارے اگر ایک سواری تھی تو سب مل کے باری باری چڑھتے اُترتے چلے جاتے اُس نے کہا کہ اب کسی طرح الزام سے نہیں بچ سکتے اب وہی کرو جو اپنے جی میں آوے اور کسی کے کہنے کی پروا مت کرو بس پھر وہ سب اُترتے چڑھتے چلے گئے تو خدا تعالیٰ نے اُسے اِس تجربہ سے عقل دیدی کہ وہی کرو جس میں راحت ہو اور کسی کے طعن و تشنیع کی پروا مت کرو جیسے بزرگوں پر کفر تک فتوے لگتے ہیں اور وہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور کسی کے کہنے کی پروا نہیں کرتے۔ امیر خسروؒ فرماتے ہیں ؎

خلق میگوید کہ خسرو بت پرستی میکند   آرے آرے میکند با خلق عالم کار نیست

ہاں بھائی بُت پرستی کرتا ہوں تمہارا اجارہ ہے؟ میں کہتا ہوں ہم تو کیا ہیں خود حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون ہوسکتا ہے ع ۷

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

سارے کمال آپ میں موجود اور کوئی صفت ایسی نہیں جو علیٰ وجہ الکمال آپ میں موجود نہ ہو اور اُس کو مخالفین نے بھی تسلیم کیا تھا چنانچہ بہت جگہ قرآن مجید میں اس کا ذکر ہے يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ أَمْ لَمْ يَعْرِفُوا رَسُولَهُمْ فَهُمْ لَهُ مُنْكِرُونَ آپ کو اِس طرح پہچانتے تھے جیسے اپنے بیٹوں کو دوسری آیت میں بطور استفہام انکاری کے فرمایا ہے کہ کیا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پہچانا جو اس کا انکار کرتے ہیں مطلب یہ کہ باوجود پہچان لینے کے اِنکار کرتے ہیں۔ غرض سب اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی تائید احادیث سے بھی ہوتی ہے چنانچہ روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ ہجرت سے پہلے مکہ معظمہ میں کفار نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نماز پڑھتے دیکھا ایک جگہ اونٹ ذبح ہوا تھا اس کی اوجھڑی پڑی تھی تو آپس میں مشورہ کیا کہ کون شخص یہ اوجھڑی سجدے کی حالت میں آپ پر لاکر رکھ دے روایت میں ہے

فقام اشقی القوم یعنی جو سب سے زیادہ شقی اور بدبخت تھا وہ تیار ہو گیا۔ کفر میں بھی درجے ہوتے ہیں کوئی مڈل کوئی انٹرنس اور کوئی ایف۔ اے اور کوئی بی۔ اے تو ان میں جو سب سے بڑا کافر تھا یعنی بی۔ اے تھا اُس نے کہا میں جاؤں گا چنانچہ وہ گیا اور اوجھڑی اُٹھا لایا اور اسے کمر مبارک پر رکھ دی آپ سجدے ہی میں پڑے رہے کہ اتنے میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آئیں اور اس اوجھڑی کو ہٹایا اور کفار کو خوب خوب کہا اور کوری کوری سُنائیں اور آپ نے بھی نماز کے بعد بددُعا شروع کی یا تو وہ اس حرکت پر آپس میں ہنستے تھے اور مضحکہ کرتے اور مذاق اُڑاتے تھے جیسے اوباشوں کی عادت ہوتی ہے جب بددعا کے کلمات سُنے تو سب کا رنگ فق ہو گیا ساری ہنسی بھول گئے کیونکہ یہ یقین تھا کہ جیسا فرما رہے ہیں ویسا ہی ہو گا ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(آپ کا فرمان گویا فرمودۂ خدا ہے اگرچہ وہ فرمان ایک اللہ کے بندہ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ادا ہوا ہے) ٨

تو غرض اتنے تو معتقد مگر زبان سے آپ کو مجنون کاہن شاعر ساحر وغیرہ ناشائستہ الفاظ سے یاد کرتے تھے گو دل میں وہ آپ کو سچا سمجھتے تھے مگر زبان سے تو یہ کہتے تھے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ معاملہ ہوا تو اور کوئی کیوں یہ توقع کرے کہ وہ طعن و تشنیع سے بچ جائے گا۔ غرض بعض مصنوعی اہل اللہ تو دھوکہ میں ہیں کہ انھیں شبہ ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں اور ہوتے ہیں وہ اہل دنیا اور بعض خود دھوکہ میں نہیں مگر دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں تو ان سب کی دوستی بھی محض دنیا ہی کے واسطے ہوتی ہے غرض بہت کم لوگ ہیں جو خدا تعالیٰ کے واسطے محبت کرتے ہیں اور یہ محبت کبھی زائل نہیں ہوتی اعتقاد تو جاتا رہے مگر محبت رہتی ہے اِس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک بدمعاش لڑکا ہو اور باپ اسے ایک عرصہ تک نیک چلن سمجھتا رہا اور اس کی نیک چلنی پر اس کا اعتقاد تھا مگر اب کسی وجہ سے اُسے اس کی بدمعاشی کا علم ہوا تو دیکھئے اعتقاد

توجاتا رہا مگر محبت باقی ہے بلکہ اس وقت تو کچھ فکر نہ تھی اور اب اور فکر بڑھ گئی کہ ہائے یہ بگڑ گیا چاہتے ہیں کہ یہ درست ہوجاوے اس کے لئے کہیں بزرگوں سے دعا کرارہے ہیں کہیں تعویذ لکھوارہے ہیں کہیں عزیزوں اور دوستوں سے مشورہ کررہے ہیں کہ اس کی درستی کے لئے کیا تدبیر کی جاوے۔ یہی حالت ہے حب فی اللہ کی کہ محبوب بگڑ بھی جاوے تب بھی محبت باقی رہتی ہے بلکہ اس حالت میں اور بڑھ جاتی ہے ورنہ کیا پڑی ہے کہ اس کے لئے دعا کرے یا اہتمام کرے۔ بس اس معیار پر دیکھ لیجئے کہ محبت خدا تعالیٰ کے لئے ہے یا اپنی اغراض کے لئے تو جن کو محبت اغراض کے لئے ہوتی ہے تو ایسے لوگ جوانی تک دوست رہتے ہیں اور جب بڑھاپا آیا تو اب جانتے ہیں کہ بڑے میاں سے اب کام نہیں نکل سکتا تو سب نے چھوڑ دیا بلکہ یہ خود غرضی یہاں تک بڑھ جاتی ہے کہ وہ اپنے مال میں تصرف کرتا ہے تو ورثہ کو یہ بھی ناگوار ہوتا ہے اور اولاد اور بیوی بھی ناک بھوں چڑھاتی ہے کہ جتنا کم خرچ ہو اتنا ہی اچھا کہ ہمارے لئے بچ جاوے گا بلکہ بعض جگہ 9
جہاں معذور ہوجاتے ہیں مثلاً اندھے ہوگئے تو اس وقت نوکر چاکر بھی پروا نہیں کرتے یہ پکارتے ہیں اور وہ سنتے ہیں مگر جواب نہیں دیتے کہ یہ ہمارا کیا کرلیں گے اور ہنستے ہیں کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ اب احتمال نہیں ہے جوانی آنے کا جو بدلہ لیں اب وارثوں کی خوشامد کرتے ہیں کہ ان سے سابقہ پڑنے والا ہے تو غرض بعض اپنے مال سے بھی بڑھاپے میں منتفع نہیں ہوسکتے تو کیا آپ اس بڑھاپے کے منتظر ہیں میاں بڑھاپا آئے گا تم اس وقت کام ہی کے نہیں رہوگے اور جوانی میں طاعات کرنے میں دو باتیں ہیں ایک تو یہ کہ جب جوانی میں طاعات کا خوگر ہوجاویگا تو بڑھاپے میں عادت کی وجہ سے آسانی ہوجاوے گی اسے تو ہر شخص عقل سے سمجھ سکتا ہے دوسری بات یہ کہ جب بڑھاپا اتنا آجاوے کہ کچھ نہ کرسکے اس کے لئے حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص صحت کی حالت میں نیک عمل کرتا ہو اور مرض میں نہ کرسکے یا حالتِ اقامت میں کرتا ہو سفر کی وجہ

سے نہ کرسکے تو فرشتوں کو حکم کیا جاتا ہے کہ اس حالت میں بھی عمل پورا لکھنا یہاں تو
پنشن آدھی دی جاتی ہے اور وہاں پوری پنشن دی جاتی ہے بلکہ اور ایک ضمیمہ بھی
اس پنشن کے ساتھ ملتا ہے وہ کیا ہے وہ عمل نہ کرنے کی حسرت کا اجر کہ پڑے سو رہے
ہیں اور سبحان اللہ سبحان اللہ کا ثواب لکھا جا رہا ہے یہ جوانی کے عمل کی برکت
ہے ورنہ یہ ثواب کیسے ملتا یہ دلیل نقلی سے معلوم ہوا غرض دلیل سے یہ بات
سمجھ میں آگئی کہ جوانی کے عمل سے بوڑھاپے کا تدارک ہو سکتا ہے تیسری بات
ذوقی عارفین کے سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ اعمال میں ایک برکت خاصہ ہے جس سے
قلب میں نور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نور وہی ہے جس کے لئے تہجد کے وقت رسول
مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی تھی اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ قَلْبِیْ نُوْرًا اے اللہ میرے
قلب میں نور پیدا کر دے وَفِیْ سَمْعِیْ نُوْرًا اور میرے کانوں میں نور پیدا کر دے
وَفِیْ بَصَرِیْ نُوْرًا اور میری آنکھوں میں نور پیدا کر دے وَفِیْ مُخِّیْ نُوْرًا اور میرے
گودے میں نور پیدا کر دے وَفِیْ عَظْمِیْ نُوْرًا اور میری ہڈیوں میں نور پیدا کر دے ۱۰
وَفِیْ شَعرِیْ نُوْرًا اور میرے بالوں میں نور پیدا کر دے وَفِیْ عَصَبِیْ نُوْرًا اور میری
رگوں اور پٹھوں میں نور پیدا کر دے وَفِیْ لَحْمِیْ نُوْرًا اور میرے گوشت میں
نور پیدا کر دے وَفِیْ دَمِیْ نُوْرًا اور میرے خون میں نور پیدا کر دے اور یہاں
تک کہ اَعْظِمْ لِیْ نُوْرًا بڑھا اس نور کو میرے لئے وَاجْعَلْنِیْ نُوْرًا مجھے سراپا
نور کر دے وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِیْ نُوْرًا اور میرے اوپر نور کر دے وَاجْعَلْ مِنْ تَحْتِیْ
نُوْرًا اور میرے نیچے نور کر دے وَعَنْ یَمِیْنِیْ نُوْرًا میرے داہنے نور کر دے
عَنْ شِمَالِیْ نُوْرًا اور میرے بائیں نور کر دے۔ اسی کا ترجمہ مولانا رومی رح نے
کیا ہے ؎

نور او در یمین و یسر و تحت و فوق   بر سر و بر گردنم مانند طوق

(اس کا نور دائیں بائیں نیچے اوپر ہر طرف ہے جیسے گلے کا ہار گردن کو گھیرے ہوتا ہے)

وہ نور لالٹین کی روشنی نہیں بلکہ ایک کیفیت خاصہ ہے کیونکہ حقیقت

نور کی یہ ہے کہ ظَاھِرٌ لِّنَفْسِہٖ وَمُظْھِرٌ لِّغَیْرِہٖ یعنی خود بھی ظاہر ہو اور دوسری کو بھی ظاہر کردے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ تعالیٰ نور دینے والے ہیں آسمانوں اور زمین کا) میں بھی نور کے یہی معنی ہیں نور کے معنے چمک دمک نہیں ہیں تو یہ ہوئی نور کی حقیقت کہ خود بیّن ہوتا ہے اور دوسرے حقائق کو بیّن کردیتا ہے اور قلب کے اندر اس نور کے پیدا ہونے سے ظلمت دفع ہوتی ہی کونسی ظلمت ظلمت کسل کی ظلمت کینہ کی ظلمت حسد کی ظلمت کبر کی ظلمت غصہ کی ظلمت معصیت کی وغیرہ وغیرہ اور اس کے اندر نشاط تازگی شگفتگی اور فرحت پیدا ہوجاتی ہے تو ایسا شخص بڑھاپے میں بھی نکما نہیں ہوتا حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں جو شخص دواماً تلاوتِ قرآن کرتا ہے بڑھاپے میں اس کے حواس خراب نہیں ہوتے بڑھاپے میں، عموماً حواس خراب ہوجاتے ہیں اس سے بچنے کی تدبیر تلاوتِ قرآن ہے اللہ والوں کو دیکھا ہوگا کہ باوجود بڑھاپا آجانے کے بھی ان کے حواس قائم رہتے ہیں جیسے مولانا فضل الرحمٰن صاحب 11
قدس سرہٗ کہ سو برس سے سن متجاوز تھا مگر حواس ویسے ہی تھے یہ سب تلاوت قرآن کی برکت تھی اسے عقلاء نہیں جانتے اہل اللہ جانتے ہیں کہ راز اس میں کیا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

خود قوی تر میشود خمرِ کہن ۔۔۔ خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب کی تیزی خود بڑھ جاتی ہے خصوصاً اس شراب کی جو من جانب اللہ عطا ہوئی ہو)

یعنی پرانی شراب تیز ہوجاتی ہے تو یہ بوڑھے میاں پہلے سے بھی تیز ہوجاتے ہیں اِس میں راز یہ ہے کہ وہ اس وقت اہل مشاہدہ ہیں اور مشاہدہ کے معنے توجہ تام کے ہیں یہ توجہ ہی وہ حظ ہے کہ بڑھاپے کا بھی ضعف نہیں معلوم ہوتا جیسے ایک بوڑھا آدمی ہو اور وہ مر رہا ہو اس نے اپنے بیٹے کو جو کہیں سفر میں ہے خط لکھا کہ تم فوراً چلے آؤ اور بیٹا آگیا تو بڑے میاں کا یہ حال تھا کہ کروٹ بھی کوئی اور بدلوائے یا بیٹے کی صورت دیکھتے ہی فرط خوشی سے چارپائی پر سے

خود بخود اُٹھ بیٹھے تو جب بیٹے کے مشاہدہ میں یہ اثر اور قوت ہے تو محبوب حقیقی کے
مشاہدہ میں یہ اثر کیسے نہ ہوگا بلکہ اس سے بڑھ کر ہوگا اسی کو عارف شیرازیؒ
فرماتے ہیں ؎

ہر چند پیر و خستہ و بس ناتواں شدم ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

(اگرچہ میں بوڑھا اور کمزور و ناتواں ہو گیا ہوں لیکن تیری صورت دیکھتے ہی جواں ہو جاتا ہوں)

بس یہ حالت ہوتی ہے کہ کسل اور سستی نہیں رہتی یہ اثر تو شباب میں طاعت
کرنے کا عاجل میں ہے اور آجل میں یہ اثر ہے کہ حدیث میں ہے شاب نشأ فی
طاعة الله یعنی جس کی جوانی کا نشو و نما خدا تعالیٰ کی طاعت میں ہوا وہ قیامت
کے دن عرش کے سایہ میں ہوگا اس روز دھوپ اس شدت کی ہوگی کہ بھیجے
پکنے لگیں گے زمین تانبے کی ہو جائے گی یعنی جس طرح تانبا فوراً گرمی کو قبول
کرلیتا ہے اور مٹی دیر میں اور کم گرمی کو قبول کرتی ہے تو زمین باوجود مٹی کے
تانبے کی سی ہو جائے گی کہ تپنے لگے گی اور آفتاب سوا نیزہ پر آجاویگا یعنی بالکل ۱۲
برابر سر سے اونچا ہوگا یعنی زمین کی قابلیت و انفعال بڑھ جائے گی اور
آفتاب کی فاعلیت بڑھ جائے گی تو اس وقت کیا حال ہوگا گرمی کا دیکھو
اس وقت کتنی دور ہے حکماء تو کہتے ہیں کہ چوتھے آسمان پر ہے اور اس پر کچھ
دلائل بھی پیش کرتے ہیں مگر ان کے مقدمات مخدوش ہیں جن سے یہ حکم کرنا
بناء الفاسد علی الفاسد ہے اور شریعت نے کوئی اس کا فیصلہ نہیں کیا مگر
بظاہر نصوص سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب پہلے آسمان پر ہے گو کوئی دلیل
محکم اس پر بھی نہیں بہر حال پہلے آسمان پر ہو تب بھی بہت دور ہوا کہ پانچسو
برس کی راہ ہے تو اتنے بُعد پر بھی دیکھ لیجئے تھوڑی سی دھوپ میں کیا حال
ہوتا ہے تو اس روز جبکہ قرب کے سبب آفتاب کی فاعلیت اور زمین کی قابلیت
بڑھ جائے گی گرمی کی شدت کا کیا حال ہوگا پھر کوئی بچاؤ بھی نہ ہوگا لَا تَرٰی
فِیْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا کہ وہاں نہ ہمواری ہوگی نہ کوئی ٹیلہ ہوگا نہ کوئی چھت یا

دیوار ہوگی کہ اُسی کے سایہ میں بیٹھ جائیں ایسے وقت میں سایہ کی کتنی قدر ہوگی تو
ایسی بڑی نعمت کی (جس کی بدولت عرش کا سایہ تمہارے قبضہ میں ہے) قدر
نہیں جانتے افسوس کہ تم اپنی قدر نہیں جانتے کہ تم کیا ہو نفس و شیطان کے
پنجہ میں پھنس کر اپنی قدر کھو دی تم وہ ہو کہ عرش بھی تمہارے قبضہ میں ہے بایں
معنی کہ ایسی تدبیریں تمہارے ہاتھ میں ہیں کہ ان سے عرش کا سایہ تم کو مل سکتا ہے
حدیث شریف میں چند اعمال کا ذکر ہے ان میں یہ بھی ہے کہ وہ جوان جس نے طاعۃ
اللہ میں نشو و نما پایا قیامت کے روز اُسے عرش کا سایہ ملے گا تو اس جوانی کی
یہ فضیلت ہے کہ اس کے واسطے عرش کا سایہ نصیب ہوا غرض ایسی نعمت ہے
جوانی جسے تم اِس میدانِ اُمید میں برباد کر رہے ہو کہ جب بڑھاپا آئے گا عمل
کرلیں گے خوب سمجھ لو کہ جب تم سے جوانی میں نہ ہوا تو بڑھاپے میں کیا ہوگا
اور اگر فرض کیجئے ہمت کر کے کیا ہی تو یہاں دو چیزیں ہیں ایک عمل اور ایک
اس کی روح، روح کیا ہے وہ طمانیت ہے جس سے قلب کو حلاوت اور راحت ۱۳۰
ہوتی ہے یہ وہ چیز ہے کہ اعمال کی بھی روح ہے اور اموال کی بھی روح ہے
اِس وجہ سے کہ دوکان کھولنے کارخانہ کھولنے اور جائداد حاصل کرنے سے
مطلب کیا ہے یہی تاکہ راحت سے زندگی بسر ہو تو اصل سب کی چین ہوا لیکن
افسوس ہے کہ جس طریق سے تم اعمال کرتے اور اموال حاصل کرتے ہو اِس سے
چین نہیں حاصل ہوگا ؎

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی کایں رہ کہ تو میروی بترکستان ست

جس رستہ پر تم جا رہے ہو مجھے اُمید نہیں کہ اس سے کعبہ پہونچو کیونکہ یہ
راستہ کعبہ کا نہیں ترکستان کا ہے اِسی طرح وہ لوگ اموال و متاع کے
ذریعہ سے چین حاصل ہونے کے خیال سے اس کے بڑھانے کی فکر میں منہمک
رہتے ہیں حالانکہ مال کی خاصیت ہے کہ جوں جوں بڑھتا ہے پریشانی بڑھتی
ہے ہر وقت ادھیڑ بن رہتی ہے کہ اور بڑھے یا گھٹنے نہ پائے اہلِ عرفان کا

قول ہے ؂

وَمَن یَحْمِدُ الدُّنیا لِعَیْشٍ یَسُرُّہٗ فَسَوْفَ لَعَمْرِیْ عَنْ قَلِیْلٍ یَلُوْمُھَا

جو شخص کسی مسرت بخش عیش دنیا کی مدح کر رہا ہے وہ عنقریب اس کی مذمت کریگا ابھی حس جاتی رہی ہے جب حس ہوگی تو معلوم ہوگا۔ اجی دو حالتیں ہیں دنیا کی ایک بڑھنا ایک گھٹنا دونوں حالتوں کے متعلق خوب کہا ہے ؂

اِذَا اَدْبَرَتْ کَانَتْ عَلَی الْمَرْءِ حَسْرَۃً وَاِنْ اَقْبَلَتْ صَارَتْ کَثِیْرًا ھُمُوْمُھَا

دنیا جاتی ہے تو حسرت کو اپنی جگہ چھوڑ جاتی ہے اور آتی ہے تو پریشانیوں کو ساتھ لاتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو چھوڑ دو مطلب یہ ہے کہ اس میں روح پیدا کرلو وہ تدبیر کرو جس سے روح پیدا ہو وہ تدبیر روح پیدا ہونے کی میں بتا دوں گا۔ یہ تو ثابت ہو چکا ہے کہ روح اعمال و احوال کی یہ ہے کہ قلب کو چین ہو جاوے۔ اب یہ ثابت کرنا رہ گیا کہ یہ کاہے سے ہوا کرتا
۱۴ ہے اسے دلیل کے قبل تجربہ سے بتلاتا ہوں کہ بڑھاپے میں جس چیز سے چین ہوتا ہے وہ جوانی کا عمل ہے شیخ عبدالحق محدث رحؒ نے لکھا ہے کہ اگر تم کو یہ منظور ہو کہ بڑھاپے میں آسودہ رہو تو جوانی میں گناہوں کو چھوڑ دو خصوص دو چیزوں کو ایک حسن پرستی اور دوسرے خوش آوازی میں مشغول ہونا ان دونوں سے بالخصوص بہت بچو ورنہ بڑھاپا آوے گا اور قلب میں بےچینی پیدا ہوگی اور یہ بات کیوں پیدا ہوگی اسے ہم نہیں جانتے وہ تجربہ کا دعویٰ کرتے ہیں جسے شیخ سے عقیدت ہو وہ ان کی پکائی ہوئی کھاوے ورنہ خود پکاوے۔ اب تجربہ کے بعد دلیل سے کہتا ہوں کہ چین کی تدبیر کیا ہے مسئلہ عقیدت ہے کہ چین قلب کے متعلق ہوتا ہے جوارح کا چین بھی در اصل قلب کا چین ہے کیونکہ ہاتھ پاؤں اور ڈیل میں درد ہو تو قلب بےچین ہوتا ہے نہ کھانے میں مزہ آتا ہے نہ دریا کی سیر میں لطف آتا ہے غرض کسی چیز میں دل نہیں لگتا تو چین کیا ہوا قلب کا سکون یعنی دل کا قرار پا جانا اور چین کا مقابل

ہے بیچینی جب چین سکون ہوا تو بیچینی بے سکونی ہوئی اور بے سکونی حرکت ہوئی کیونکہ حرکت سکون کے مقابلہ میں ہے تو سکون اور چین انقطاع حرکت کا نام ہوا اور انقطاع حرکت کب ہوتا ہے جب کوئی چیز اپنے مرکز پر پہونچ جائے کیونکہ حرکت مرکز پر پہونچنے کے لئے ہوتی ہے مثلاً ڈھیلے کا مرکز زمین ہے اگر اس کو اُچھال دو تو وہ پھر بلندی سے پستی کی طرف رجوع کرے گا کیونکہ پستی اور زمین اس کا مرکز ہے اور اس وقت تک حرکت کرتا رہیگا جب تک زمین تک جو اس کا مرکز ہے نہ پہونچ جاوے اور بیچ میں کوئی مکان دیوار یا چھت اسے روکنے والی ہے تو رُک جائے گا مگر تقاضا یہی رہے گا کہ کسی طرح نیچے اُترے چنانچہ جب یہ حجاب زائل ہوجاویگا فوراً اُتر آوے گا تو جو ڈھیلے زمین پر نہیں ہیں وہ بیچ میں ہوتے ہیں دیکھو پتھر کو زمین سے اُٹھاؤ تو وزنی معلوم ہوتا ہے یہ وزن کیا ہے اصل میں یہ تقاضا ہے کہ مرکز سے نہ اُٹھاؤ کیونکہ جب ہاتھ سے چھوٹتا ہے وہیں پہنچ جاتا ہے اور مرکز کیا ہے جہاں قرار ہو اب قلب کا مرکز دیکھئے کیا ہے سو مرکز کے دو مرتبے ہیں ایک حسی ایک معنوی حسی تو مشاہدہ سے متعین ہوجاتا ہے اور معنوی خاصیت سے معلوم ہوگا سو مرکز کی خاصیت ہے محبوبیت یعنی مرکز مطلوب کو کہتے ہیں چنانچہ مطلوب ڈھیلے اور پتھر کا زمین ہے اِسی طرح جو قلب کا محبوب ہوگا وہ قلب کا مرکز ہے اور محبوب کون ہوتا ہے جس سے مناسبت ہو تو قلب کو جس سے مناسبت ہوگی وہی محبوب ہوگا اور وہی اس کا مرکز ہوگا میں نے ایک باپ سے سُنا ہے کہ مجکو جو فلاں بڑی بیٹے سے محبت زیادہ ہے وجہ یہ کہ وہ میرا سا ہے یعنی مجھے اس سے مناسبت ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ قلب کو کس چیز سے مناسبت تامہ ہے سو برہان اور وجدان سے ثابت ہوچکا ہے کہ قلب کو پوری مناسبت صرف حضرت حق سبحانہ سے ہے اور اسی مناسبت کی نسبت شہادت دی ہے رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم نے کہ اِنَّ اللّٰہَ ۱۵

خلق آدم علیٰ صورتہٖ یعنی اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا یہاں
صورت کے معنی شکل نہیں بلکہ وہی مناسبت ہے جسے صوفیہ نے ایک خاص
عنوان سے کہا ہے (جسے علماء خشک نہیں قبول کرتے) کہ انسان مظہر ہے
حق تعالیٰ کا اس لفظ مظہریت سے چونکتے ہیں اور حقیقت میں یہ عنوان تفسیر
ہے اسی حدیث کی اور بدون اس تفسیر کے سخت اشکال پڑتا ہے جس سے
بچنے کے لئے بعضوں نے ضمیر کا مرجع بنایا ہے آدم کو یعنی آدم کو آدم کی
صورت پر پیدا کیا یعنی جیسی صورت آدم کے لئے مناسب تھی اس صورت
پر پیدا کیا مگر بعض روایات میں بجائے صورتہ کے صورۃ الرحمٰن آیا ہے اسے
کیا کریں گے اس کے جواب میں انھوں نے اسے روایت بالمعنی باجتہاد الراوی
بنایا ہے میں کہتا ہوں کیوں تکلف کرتے ہو جو تفسیر صوفیہ کرام نے بیان کی
وہ نہایت بے تکلف اور سہل ہے۔ یہ دیکھئے کہ صورت کسے کہتے ہیں اگر کہو
چہرہ کی شکل کو کہتے ہیں اچھا مانا مگر یہ دیکھنا ہے کہ اس کو کیوں کہتے ہیں ۱۶
صورت کی حقیقت کیا ہے سو حقیقت صورت کی ظہور ہے چنانچہ یہ بھی
محاورہ ہے صورۃ المسئلۃ کذا اور یوں بھی کہتے ہیں اس کام کے بننے کی
کیا صورت ہے تو یہاں صورت کے معنے ظہور کے ہیں اور چہرہ کو بھی صورت
ظہورت ہی کے معنے کی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس سے ظہور ہوتا ہے حقیقت
انسانیہ کا اور یہ حقیقت وہ ہے جس کو انا سے تعبیر کرتے ہیں اور وہ روح
ہے جسے حکماء نفس ناطقہ کہتے ہیں اور وہ ایک مخفی چیز ہے چونکہ روح ایک
خفی چیز تھی جسے کالبد نے ظاہر کر دیا اس لئے کالبد کو صورۃ کہہ دیا تو اصل
معنی صورت کے ظہور کے ہوئے اب سمجھئے کہ خلق آدم علیٰ صورتہٖ کے
معنے علیٰ ظہورہٖ کے ہوئے یعنی خدا تعالیٰ نے اپنے ظہور پر آدم کو پیدا کیا
یعنی آدم کو پیدا کرکے اپنے صفات کو ظاہر کر دیا کہ خدا تعالیٰ سمیع بھی ہے
بصیر بھی ہے متقن بھی ہے محکم بھی ہے ان ہی صفات کا کچھ حصہ انسان کو دیکر

اپنے صفاتِ کمالیہ کو ظاہر کر دیا گو اور مخلوق سے بھی صفات کا ظہور ہوتا ہے مگر انسان سے بوجہ اجمع لکمالات ہونے کے زیادہ ظہور ہوتا ہے اسی واسطے اسکو مظہر اتم کہتے ہیں صوفیہ نے کیا کیا وہی انھوں نے بھی کہا جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں صرف اِصطلاح بدل دی یہ ان کا لطیفہ ہے کہ اپنے اسرار کو عوام سے بچانے کے لئے اِصطلاحیں مقرر کرلی ہیں ورنہ وہ قرآن و حدیث سے جُدا ہو کر کوئی نئی بات نہیں کہتے ہاں علماء خشک جو انکی اِصطلاح نہیں سمجھ سکتے ان پر اعتراض کر دیتے ہیں جو واقع میں ان پر نہیں ہوتا بلکہ اپنی فہم پر ہوتا ہے ؎ اِصطلاحاتے است مرا بدال را ﴿ اور محققین کی عادت ہوتی ہے کہ وہ طالب کے سامنے تو ان نکات کو ظاہر کر دیتے ہیں لیکن معاند کے سامنے اعتراضات سُنکر بھی خاموش رہتے ہیں بلکہ اپنے متوسلین کو بھی اظہار سے منع کر دیتے ہیں کما قال الشیرازی ؎

با مدعی مگوئید اسرارِ عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

(عشق کے بھید مدعی کے سامنے مت کہو - چھوڑ دو تاکہ غرور اور گھمنڈ میں مرجائے)

وجہ یہ کہ ان کو جوش نہیں آتا جوش آتا ہے عازم اظہار کو اسی لئے کیمیاگر کو کبھی جوش نہیں آئے گا اگر کوئی اس کا اِنکار کرے تو وہ اور خوش ہوگا کہ چلو اچھا ہوا لوگوں کے ہجوم سے بچے اور پولیس کے خوف سے بچے اور جو کیمیاگر نہیں ہے محض دوکاندار ہے اور لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتا ہے وہ طرح طرح کی کوششوں سے اپنا کیمیاگر ہونا ثابت کر دیگا اِسی طرح اہل اللہ جب دیکھتے ہیں کہ معتقد کم ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں کہ چلو خلوت بالمحبوب کی دولت نصیب ہوئی ؎

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(وہ کیا اچھا وقت اور کیا اچھا زمانہ ہے کہ اس میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو)

ایک اور عاشق نے کہا ہے ؎

چہ خوش ست با تو بزمی نہفتہ ساز کردن در خانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن

(کیا ہی اچھا ہو کہ محفل میں تنہا ہو اور گھر کا دروازہ بند شراب کی بوتل کھلی ہوئی پاس رکھی ہو)

اس سے زیادہ خوشی کا کیا مقام ہوگا کہ محبوب کا وصل ایسے موقع سے حاصل ہو کہ کوئی پکارنے تک نہیں کیا محبوب کے وصل کے وقت کوئی یہ چاہے گا کہ کوئی آکر پکارے ارے فلانے اس وقت تو یہ چاہے گا کہ ایک چار گھنٹے کے لئے ساری دنیا مجھ کو چھوڑ دے تو کام بن جاوے اور کبھی جیسے نقدۂ حرمتہ کی ضرورت ہو البتہ معتقدین کے ہونے سے فکر ہوگی کہ ایک اسامی کم ہوگئی۔ بہرحال مظہر اتم حق تعالیٰ کا انسان ہے کیونکہ انسان کو حق تعالیٰ سے مناسبت تامہ ہے اور یہی مناسبت سبب تھا محبوبیت کا اور محبوبیت صرف مرکز میں ہوتی ہے تو معلوم ہوا اور ثابت ہوگیا کہ قلب کا مرکز صرف ذاتِ حق ہے اور اسی سے قلب کو قرار اور چین حاصل ہو سکتا ہے بس یہی ایک صورت ہے چین کی کہ خدا تعالیٰ سے دل لگاؤ اسی کو فرماتے ہیں اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ
قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ یعنی جو لوگ ایمان والے ہیں اور ان کے دلوں کو چین ہوتا ۱۸
ہے خدا تعالیٰ کے ذکر سے اور اس میں حصر اس لئے نہیں کہ خدا تعالیٰ ہی کے ذکر سے چین ہوتا ہے کیونکہ مخاطب ابھی سمجھ رہا تھا کہ چین اور چیزوں سے ہوتا ہے تو اسے بالفعل تو صرف اتنا ہی بتا دیا کہ چین خدا تعالیٰ کے ذکر سے بھی ہوتا ہے سبحان اللہ کیا تدریجی تعلیم ہے کہ مخاطب قبول ہی کر لے اگر ابتدا ہی سے حصر کے طور پر فرماتے تو ایک قسم کا معارضہ ہو جاتا یہ نہیں کیا پہلے یہ بتایا کہ اور چیزوں سے چین ہونے کی ہم نفی نہیں کرتے مگر خدا تعالیٰ کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے جب مخاطب نے یہ سمجھ لیا کہ خدا تعالیٰ کے ذکر سے بھی چین ہوتا ہے تو آگے فرمایا اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کہ آگاہ ہو جاؤ اور خبردار ہو جاؤ کہ خدا تعالیٰ ہی کے ذکر سے دلوں کو چین ہوتا ہے اور کسی چیز سے چین نہیں ہوتا پہلے جملہ میں تو بذکر اللہ جو ظرف ہے تطمئن کا اپنی جگہ پر ہے یعنی مؤخر ہے اور آگے بذکر اللہ کی تقدیم فرمائی تا کہ حصر کو مفید

ہو کہ تقدیم ما حقہ التاخیر مفید حصر ہوتا ہے اور پھر اس کو اَلَا حرف تنبیہ سے موکد بھی کر دیا کہ ہوشیار ہو جاؤ کہ خدا تعالےٰ ہی کی یاد سے دلوں کو چین ہوتا ہی اس کی دلیلیں میں ابھی سب بیان کر چکا ہوں اِس لئے ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں اسی کا ترجمہ مولانا رومیؒ نے کیا ہے ؎

گر گریزی بر امید راحتے   ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

(اگر کسی راحت یا آرام کی امید پر بھاگتا ہو تو اس جگہ بھی تجھ کو کوئی آفت پیش آئے گی)

جہاں جاکے پناہ لوگے کہیں چین نہیں ملے گا کہیں کوئی آفت آئے گی اور کہیں کوئی مصیبت کہیں دوستوں کی طرف سے پریشانیاں پیش آئیں گی اور کہیں دشمنوں کی طرف سے ؎

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست   جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بے دوڑ دھوپ اور بغیر دام کے نہیں ہے خلوت گاہ حق کے سوا کسی جگہ آرام نہیں)

۱۹ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں پریشان کرنے کے لئے بھیڑیئے نہ ہوں جز بخلوت گاہ حق آرام نیست ؛ یہ ترجمہ ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے) کا۔ غرض آرام کی چیز صرف یہ ہی خلاصہ یہ کہ جب خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جاتا ہے جو مرکز ہے قلب کا تو پھر حرکت نہیں ہوتی قلب کو اور یہی سکون ہے اب اگر دنیا کی تدبیریں بھی کروگے مگر قلب کو مرکز پر رکھوگے تو پھر پریشانی نہیں ہوگی جیسے پرکار کا ایک پرہ مرکز پر ہوگا اور ایک دائرہ کے محیط پر حرکت کریگا تو جو حصہ مرکز پر ہوگا وہ حرکت نہیں کرے گا کیونکہ مرکز نقطہ حقیقی ہوتا ہی اور حرکت وضعیہ میں نقطہ مرکزیہ کو حرکت نہیں ہوتی ایک پہیہ بہت بڑا ہے اور اس کے اندر ایک اور ہے اُس سے چھوٹا پھر اُس سے چھوٹا پھر اُس سے چھوٹا تو حرکت سب کو ہوگی جو بڑا ہے اس کو زیادہ اور جو چھوٹا ہی اس کو کم مگر ان سب محیطوں کا مرکز ہے اُسے بالکل حرکت نہ ہوگی۔ اب سمجھئے کہ

ایک باطن قلب ہے جو مرکز پر ہے اور ایک ظاہر قلب ہے جو محیط پر دورکرتا ہے باطن قلب خدا تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہے اور ظاہر قلب کمانے میں مصروف ہے بلکہ اس محیط پر چلنے والے کو بھی حکم ہے کہ چلاؤ ورنہ دائرہ قطع کیسے ہوگا وہ دائرہ کیا ہے بیوی بچوں کا نان و نفقہ قلب کے اسی ظاہر اور باطن پر متنبی کہتا ہے ؎

عَذْلُ الْعَوَاذِلِ حَوْلَ قَلْبِی التَّائِہِ   وَھَوَی الْاَحِبَّۃِ مِنْہُ فِیْ سَوْدَائِہٖ

یعنی ملامت کرنے والیوں کی ملامت قلب کے ارد گرد ہے اور احباب کی محبت سویدار قلب میں ہے۔ پس سویدار قلب جو اندرون قلب ہے وہ غیر متحرک ہے جب اس میں خدا تعالےٰ کا ذکر اور محبت جم جائے گی تو پھر حرکت نہیں ہوگی اس کی علامت یہ ہے کہ خوشی اور غم دونوں حالتیں یکساں ہوں گی خوشی ہے تو الحمد للہ اور غم ہے تو الحمد للہ کیونکہ وہاں نہ غم مطلوب ہے نہ خوشی مطلوب ہے، مطلوب تو ان کی رضا ہے ؎ ۲۰

بس زبون وسوسہ باشی دلا   گر طرب را باز دانی از بلا

یعنی اگر تم خوشی کو بلا سے ممتاز سمجھتے ہو تو ابھی وساوس میں مبتلا ہو ؏

ہرچہ از دوست میرسد نیکوست

(دوست کی طرف سے جو کچھ بھی اچھا ہی ہے)

خوشی بھی انھیں کی ہے اور غم بھی انھیں کا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من   دل فدائے یار دل رنجان من

(تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے دل قربان ہی ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرنیوالا ہے)

محبوب کی رضا مقصود ہے جس طرح اس سے مصافحہ کرنے سے فرحت ہوتی ہے اسی طرح اس کی چپت میں بھی فرحت ہوتی ہے چپت میں چوٹ تو ضرور لگے گی کیونکہ معشوق اچھا خاصہ کھاتا پینا ہٹا کٹا تھا اس کا ہاتھ بھی زبردست ہی ہوگا اور اس سے چوٹ بھی ضرور لگے گی مگر چوٹ سر پر

لگے گی دل پر نہیں لگے گی اسی سے یہ چپت میں بھی خوش ہیں دلیل یہ ہے کہ اگر معشوق کہے کہ اگر تمہارے چوٹ لگتی ہو تو لاؤ میں تمہیں چھوڑ کر رقیب کو اسی طرح چپت لگاؤں دباؤں تو وہ اس کا یہ جواب دیگا ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ‌ ‌ ‌ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(ایسا دشمن کا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو۔ خنجر آزمائی کے لئے دوستوں کا سر سلامت ہے)

کہ جب ہم موجود ہیں تو رقیب کو کیوں مارتے ہو ؎

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے ‌ ‌ ‌ کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

تو جس کے قلب میں خدا تعالےٰ کا تعلق جم جاتا ہے اس کو کسی حال میں غم نہیں ہوتا عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب ‌ ‌ ‌ کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(فراق و وصل کی کیا حقیقت ہے رضائے دوست کے سامنے)

یعنی وصل کو بھی مطلوب نہیں سمجھتے اگر کوئی کہے کہ وصل تو مطلوب ہی ہے اس کے مطلوب نہ سمجھنے کے کیا معنی جواب یہ ہے کہ وصل مزعوم عند السالک کو مطلوب نہیں سمجھتے یوں تو فی نفسہ وصل حقیقی مطلوب ہی ہے البتہ وصل مزعوم کو مطلوب نہیں سمجھتے جسے سالک مطلوب سمجھتا ہے کیونکہ سالک غیر کامل کو ان حقائق کی خبر نہیں ہوتی جب تک شیخ کامل کی تقلید نہ ہو ایسا سالک محض اپنے علم سے کام لیتا ہے اور یہاں علم و فضل کا مٹانا ضروری ہے اسی کو مولانا نے ایک حکایت میں بیان کیا ہے کہ ایک نحوی صاحب جنھیں اپنی نحو دانی پر ناز تھا سفر کے ارادہ سے کشتی پر سوار ہوئے راستہ میں ملاح سے پوچھا کہ میاں تم نے کچھ نحو بھی پڑھی ہے اس نے کہا نہیں کہنے لگے افسوس تم نے آدھی عمر کھوئی اس کے بعد کشتی گرداب میں آگئی اور چکر کھانے لگی ملاح نے پوچھا میاں یہ کچھ تیرنا بھی جانتے ہو انھوں نے کہا نہیں اس نے کہا افسوس تم نے ساری ہی عمر کھوئی مولانا فرماتے ہیں ؏ محو می باید نہ نحو اینجا بداں (اللہ تعالےٰ کے راستہ میں ۲۱

محویت کی ضرورت ہے علم نحو کی ضرورت نہیں) تو یہاں تو اس کی ضرورت ہے یہاں نرا ظاہری علم وفضل کافی نہیں اس سے محقق نہیں ہوتا اور اگر علم وفضل کی وجہ سے محقق ہو تو وہ دلائل کا محقق ہے وجدان کا محقق نہیں ہے دلائل کیا چیز ہیں اندھے کی لکڑی کہ اس کے سہارے سے ٹٹول ٹٹول کے چل رہا ہی جہاں وہ لکڑی ٹوٹ گئی بس کچھ بھی نہیں تو اسی طرح اس نے اپنے علم سے وصال کی تعریف گھڑی کہ وصال کسے کہتے ہیں کہ کچھ کیفیت ہونے لگے کچھ سنسناہٹ ہونے لگے جی لگنے لگے اگر جی لگا تو سمجھے ہاں وصل ہو گیا اور اگر جی نہیں لگتا اور وساوس کا ہجوم ہو گیا تو سمجھا کہ بس مردود ہو گیا تو اس کو غلطی یہ ہوئی کہ کیفیات کو وصل اور وساوس کو فراق سمجھا حالانکہ یہ قبض وبسط ہے فراق ووصل نہیں ہے اور قبض وبسط دونوں وصل ہی کی قسمیں ہیں چنانچہ جس طرح محبوب کا پاس بلا کر بٹھانا وصل ہے اسی طرح یہ حکم دینا کہ جاؤ آم لاؤ یہ بھی وصل ہو یہ نہیں کہ آموں کی جستجو میں جو وقت صرف ہوا اور محبوب سے جدا رہنا پڑا یہ فراق ہو گیا۔ کسی شاعر نے کہا تھا ؎ ۲۲

اُس کے کوچہ سے جب اُٹھ اہل وفا جاتے ہیں تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

اور کسی نے اس کی اصلاح کی تھی ؎

اُس کے کوچہ سے کب اُٹھ اہل وفا جاتے ہیں وہ ہوسناک ہیں جو روبقفا جاتے ہیں

مگر یہ اُس اُٹھنے میں ہے جو از خود ہو وہ حقیقت میں خلاف ہے لیکن اس کے علاوہ ایک مرتبہ اور ہے وہ یہ کہ معشوق خود اُٹھا دے تو یہ اُٹھنا عین وفاداری ہے مثلاً اگر معشوق کہے آم لاؤ تو فوراً چلا جائے اور اگرچہ لغۃً یہ زمانہ فراق کا ہو گا مگر اہل عقل کے نزدیک یہ زمانہ اس وصال سے بھی بڑھ کر ہی کیونکہ اس میں تو محبوب کے ناراض ہو جانے کا بھی جو کہ حقیقی فراق ہے اندیشہ ہے اور اس میں اس کے ناراض ہو جانے کا اندیشہ ہی نہیں بلکہ جتنی دیر آم لانے میں لگے گی اتنی دیر تک اس کے راضی رہنے کا یقین ہے تو جو عاشق ہے وہ

اس حالت میں بھی مزے میں ہے اور نہایت خوش ہے کہ محبوب کی رضا تو حاصل ہے اور اس حالت میں وہ عاشق ضرور یہ کہے گا ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب   کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(فراق و وصل کیا چیز ہے دوست کی رضا اور خوشی کی کوشش کر اس کے سوا اور کچھ طلب کرنا افسوس کی بات ہے)

اور یہ وہ فراق ہے کہ جسے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی گوارا فرمایا کیا آپ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ فراق صوری یعنی توجہ الی الغیر مطلقاً بھی نہ ہو مگر آپ کو ارشاد ہوا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ قُمْ فَاَنْذِرْ۔ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ کہ کفار کے پاس جائیے اور انھیں انداز و تبلیغ فرمائیے اور کلام الٰہی سنائیے اور اس پر آپ اٹھے اور خلوت میں بجائے محبوب حقیقی سے مناجات کرنے کے مشرکین و کفار سے خطاب فرماتے ہیں یا اَیُّهَا النَّاسُ اِفْعَلُوْا كَذَا وَلَا تَفْعَلُوْا كَذَا گو آپ کی توجہ محبوب حقیقی کی جانب سے اس وقت بھی منقطع نہیں ہوئی

۲۳ تھی مگر ایک گونہ حجاب تو تھا کیونکہ ایک تو براہ راست محبوب کا دیکھنا اور ایک آئینہ کے اندر اس کا چہرہ نظر آنا تو حق تعالیٰ کے دیکھنے کی مثال ایسی ہے کہ پہلے تو خود محبوب کو بلا واسطہ دیکھ رہے تھے اور اب بواسطہ مرآت کے دیکھ رہے ہیں گو توجہ اب بھی تام ہے مگر بلا حجاب نہیں کیونکہ مرآت حجاب ہے گو شفاف ہے اور وہاں حجاب تو حجاب خود اپنی ذات کا حائل ہونا بھی گوارا نہیں حضرت بوعلی قلندرؒ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم   گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

(مجھ کو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے رخ انور کو دیکھنے نہ دوں اور کانوں کو ان کی باتیں سننے نہ دوں)

ہمارے اور محبوب کے درمیان آنکھ اور کان کا بھی کیوں واسطہ ہو اس کی بھی غیرت آتی ہے غرض یہ حجاب تھا جسے حق تعالیٰ کے ارشاد سے گوارا کیا گو وہ حجاب اُن کی رضا سے تھا مگر وصال بلا حجاب کے مقابلہ میں تو فراق ہی تھا تو دوسرے مؤمنین کیوں نہ اس فراق کو گوارا کریں ؎

میل من سوے وصال و میل او سوے فراق — ترک کام خود گرفتم تا برآید کام دوست

(میں ملنا چاہتا ہوں وہ جدا رہنا چاہتا ہے میں اپنی ارادہ کو اس کے ارادہ پر قربان کرتا ہوں)

خلاصہ یہ کہ عاشق قبض و بسط میں کچھ فرق نہیں کرتا نہ قبض میں گھبراتا ہے نہ بسط میں ناز کرتا ہے کیونکہ یہ سب وصال ہی کی حالتیں ہیں اور گو ظاہر قلب محیط پر دائر ہے جو دنیا کے کاموں میں مشغول ہے مگر باطن قلب جو مرکز ہے وہ مشغول ہے تسلیم و رضا میں یہی وجہ ہے کہ اسے کسی حالت میں بھی تغیر نہیں ہوتا اور کسی مصیبت سے نہیں گھبراتا یہاں تک کہ مرنے سے بھی نہیں گھبراتا اِس واسطے کہ اس وقت بھی مطلوب تو پاس ہی ہے بلکہ موت کا وقت تو وہ ہے کہ پرکار کا باہر کا پرہ جو محیط پر تھا وہ بھی اندر کے پرہ کے قریب آرہا ہے کیونکہ تمام افکار دنیا خود بخود منقطع ہو رہے ہیں تو اور خوشی کی بات ہے کہ یہ جسم ہیولانی جو ایک گونہ حجاب تھا اُٹھا جاتا ہے اسی کو ایک بزرگ وقت نزع اِس طرح فرمارہے تھے ؎ ۲۴

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم — جسم بگذارم سراسر جاں شوم

(اب وہ وقت آگیا کہ میں عریاں ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر سراسر جان بن جاؤں)

اور اسی کے ساتھ یوں بھی کہہ رہے تھے ؎

چیست توحید آنکہ از غیر خدا — فرد آئی در خلا و در ملا

(توحید کی شان کب ہو سکتی ہے سوائے خدا کے جھکا رہے تنہائی میں اور میل جول کے وقت)

غرض اسی خوشی میں جان دیدی۔ ابن الفارض رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو بڑے صاحبِ کشف و صاحبِ حال تھے جب ان کا زمانہ وفات قریب آیا تو آٹھوں جنّتیں ان پر منکشف ہوگئیں یہ دیکھ کر انھوں نے منہ پھیر لیا اور غلبۂ حال میں یہ فرمایا کہ ؎

ان کان منزلتی فی الحب عندکم — ما قد رأیت فقد ضیعت ایامی

کہ اگر محبت کا صلہ یہی ملا تو ساری عمر ہی برباد ہوئی پھر کہتے ہیں وہ جنّتیں

مستور ہوگئیں اور خاص تجلی کا ظہور ہوا اور روح پرواز کر گئی گویا وہ حالت تھی جیسے اور ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

(اگر ملک الموت میری جان نکالنے آئے تو جب تک میں آپ کی تجلی نہ دیکھ لوں جان نہ دوں گا)

غرض جس شخص کی یہ حالت ہو وہ کس قدر چین میں ہوگا۔ میں راہب نہیں بناتا نہ میں کارخانے چھوڑاتا ہوں میں تو صرف یہ بتاتا ہوں کہ ظاہر قلب سے دنیا کے کام کرو اور باطن قلب کو خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ کرو باقی یہ مطلب نہیں ہے کہ بیوی کو طلاق دیدو اور بچوں کو عاق کر دو اور کوٹھری میں بیٹھ جاؤ کیا سارا جہان چھوڑ کے بس اللہ میاں کوٹھری میں ہیں نعوذ باللہ ان کا تو کوئی مکان نہیں وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ وہ تو ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں ہاں تم ہی ان سے دور رہو اس لئے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ یعنی ہم تم سے بہت نزدیک ہیں یہ نہیں فرمایا کہ انتم اقرب الینا کہ تم ہم سے بہت نزدیک ہو اس لئے کہ تم تو دور رہو اور وہ نزدیک ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ قرب و بُعد تو نسب متکررہ میں سے ہے جب ایک دوسرے سے قریب ہوگا تو دوسرا بھی اس سے قریب ہوگا ایک بعید ہوگا تو دوسرا بھی بعید ہوگا مگر یہ قرب جسمی میں ٹھیک ہے یہاں قرب کے معنے قرب علمی کے ہیں قرب جسمی کے نہیں ہیں پس مراد محض یاد اور توجہ ہے تو اس اعتبار سے وہ قریب ہیں یعنی تمہاری طرف متوجہ ہیں اور تم بعید ہو یعنی تم ان کی طرف متوجہ نہیں پس اگر تم ذرا ان کی طرف متوجہ ہو تو پھر ان کا قرب تمہیں معلوم ہو ؎ 25

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں تو اپنے حجاب بے خودی کو لے حافظ درمیان سے ہٹا دے)

حضرت بایزید بسطامیؒ نے حضرت حق جل و علا شانہ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا یا رب دلنی علی اقرب الطرق الیك یعنے مجھے اپنے تک پہونچنے کا سب سے

مختصر راستہ بتا کہ بس اس سے سیدھا اور مختصر نہ ہو۔ سبحان اللہ خواب میں بھی
یہی دھیان ہے جواب میں فرماتے ہیں دع نفسك و تعال اپنے نفس کو چھوڑ دو
اور چلے آؤ کیسا سہل راستہ ہے یعنی اپنے نفس کے تقاضے پر عمل چھوڑ دو یعنی
اپنی رائے کو اپنے ارادہ کو اور مصالح کو چھوڑ دو بس ان مصالح ہی نے تو خراب
کیا ہے ہر بات میں غرض ہر بات میں پالیسی یہی وجہ ہے کہ انھیں چین نہیں اور
اللہ والوں کو اس لئے تکلیف نہیں کہ ان کے سویدائے قلب میں پالیسی اور
غرض نہیں ہے حضرت بہلول نے کسی بزرگ سے پوچھا کہ کیا حال ہے انھوں نے
کہا اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے اس کی خواہش کے
موافق ہوتا ہو پھر اُسے کاہے کی تکلیف حضرت بہلول نے کہا کہ حضرت یہ تو
سمجھ میں نہیں آتا وہ ہنسنے لگے اور کہا کہ اس پر تو تمہارا بھی ایمان ہو کہ بدون
خدا تعالیٰ کے ارادہ کے کچھ نہیں ہوتا جب یہ سمجھ گئے تو اب یہ سمجھ لو کہ جس نے
۲۶ اپنی خواہش ہی نہ رکھی ہو اور اپنی مرضی کو بالکل خدا تعالیٰ کی مرضی میں فنا
کر دیا ہو تو جو کچھ ہوگا وہ خدا تعالیٰ کی مرضی کے موافق تو یہی ہوگا اور اس کی
مرضی بھی وہی ہے جو خدا تعالیٰ کی مرضی ہے بس وہ اس کی خواہش کے موافق
بھی ہوگا اس کا کوئی خاص ارادہ ہی نہیں نہ یہ کہ ابھی مر جاویں نہ یہ کہ دس
برس زندہ رہیں کہ ذرا بیمار ہوتے اور دھڑکا پیدا ہوا کہ ہائے ابھی تو ایک
ہی برس گذرا ہے ابھی تو نو برس اور باقی ہیں نہ یہ خواہش کہ غریب ہو کر رہیں
نہ یہ خواہش کہ امیر ہو کر رہیں جیسے زاہدوں کی یہ خواہش ہوتی ہو کہ کمل ہی ملے
دوشالہ نہ ملے اگر دوشالہ ملا تو ناک منہ چڑھ گیا اور دنیا دار کی یہ خواہش ہوتی
ہے کہ دوشالہ ملے اگر کمل ملے گا تو اس کا ناک منہ چڑھ گیا سو غور کرو تو تم کیا
اور تمہاری مرضی ہی کیا اگر کمل دیں کمل اوڑھو اگر دوشالہ دیں دوشالہ اوڑھو
اگر غریب بنائیں خوشی سے اُسے گوارا کرو اگر بادشاہ بنائیں بادشاہ بن جاؤ
ایک جوڑا روز بدلنے کو دیں ایک جوڑا روز پہنو اور اگر ایک جوڑا ایک برس

میں دیں تو ایک برس میں پہنو شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ کو ان کے شیخ نے
ایک کرتہ دیا تھا وہ اسے ساری عمر پہنے رہے جب پھٹ جاتا گھورے پر سے
گدڑے چیتھڑے جوڑ بٹور کے دھوتے اور دھو کے پیوند لگا لیتے تھے وہ کرتہ اب
بھی موجود ہے اور زائرین نہایت عقیدت سے اُسے آنکھوں سے لگاتے
ہیں اور بادشاہوں کے تخت و تاج کا پتہ بھی نہیں اور نہ کوئی انھیں پوچھتا
ہے وجہ یہ کہ وہ عطیہ تھا سرکاری اور گو عطیہ سرکاری یہ بھی ہے مگر یہ بادشاہ
اسے عطیہ نہیں سمجھتے بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا ہے ہم نے حاصل کیا ہے ہمیں اس کا
استحقاق ہے اس خودی کی وجہ سے وہ مٹا دیا گیا اور اس میں یہ برکت عطا
کی گئی کہ وہ اب تک باقی ہے اگر کوئی کہے کہ وہ عمر بھر کیوں ایک کرتہ پہنے
رہے اگر بدل ڈالتے تو کیا وہ عطیہ نہ ہوتا۔ تو بات یہ ہے کہ اُن کو دوسرا
میسر ہی نہ تھا باوجودیکہ ابراہیم لودی بادشاہ ان کے مرید تھے مگر کبھی بادشاہ
کی نذر قبول نہیں کی کہ یہ بیت المال کا ہے جو عامہ مسلمین کا ہے بادشاہ کو اس ۲۷
میں تصرف جائز نہیں ہے اگر چاہتے تو بہت کچھ لے لیتے اور بڑے عالیشان
محل تیار کر لیتے۔ ابراہیم بادشاہ کی بہن بھی حضرت سے مرید تھیں اور اس
درجہ کی بیوی تھیں کہ آپ فرماتے تھے اگر عورتوں کو خلیفہ بنانا مشائخ کا
معمول ہوتا تو میں ابراہیم کی بہن کو خلافت دیتا اُن سے بھی کبھی نذر قبول
نہیں فرمائی کہ اُن کے یہاں بھی وہی بادشاہ کا پیسہ ہے جو بیت المال کا ہے
ایک مرتبہ آپ کے یہاں ایک بزرگ تشریف لائے وہ ان کو ایک میلا
اور پھٹا سا کرتہ پہنے دیکھ کر سمجھے کہ یہ بنتے ہیں اور شبہ کی بات بھی کی تھی کہ
جس شخص کا بادشاہ مرید ہو اس کو کاہے کی کمی ہے انھوں نے فرمایا کہ بعض
لوگ زاہدوں میں داخل ہونے کو پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتے ہیں شیخ
سمجھ گئے کہ مجھ پر تعریض ہے ان سے علیحدگی میں عرض کیا کہ میں بنتا نہیں
بلکہ میرے پاس اس کرتے کے سوا اور ہے نہیں بڑی تنگی سے بسر ہوتی تھی

اور فاقے ہوتے تھے اِس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ آپ کے گھر میں سے آپ کے پیر کی بیٹی تھیں اگر کچھ ہوتا تو کیا آپ ان سے دریغ فرماتے اُن کی یہ حالت تھی کہ فاقے ہوتے تھے اور جب کئی فاقے گذر جاتے تو بیوی کہتیں کہ حضرت اب تو تاب نہیں فرماتے گھبراؤ نہیں جنّت میں عمدہ عمدہ کھانا پاک رہا ہے وہ بھی ایسی نیک تھیں کہ اس اُدھار پر راضی ہوجاتیں غرض شیخ کی تو عسرت کی یہ حالت تھی اور ایک حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حالت تھی کہ آپ ایسا کپڑا پہنتے تھے کہ اتنا قیمتی کپڑا خلیفہ وقت بھی نہیں پہن سکتا تھا حشم وخدم اور عمدہ ولطیف غذائیں اور مُرغ پلاؤ وغیرہ سے سابقہ رہتا اور جہاں یہ تھا وہاں یہ بھی یقینی تھا کہ اگر دونوں کی حالتوں کو ایک دوسری سے بدل دیا جاتا تو دونوں خوشی سے قبول کرلیتے غرض عارف کی یہ شان ہونی چاہیئے کہ جس حال میں رکھیں زندہ رہے مارے تو مرجاوے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو ۲۸

(زندہ کریں یہ آپ کی عطا ہے اور قتل کردیں تو آپ پر فدا ہوں۔ دل آپ پر فدا ہے جو کچھ کریں میں اس پر راضی ہوں)

حاصل یہ ہے کہ اپنے ارادہ کو فنا کردو۔ اور یہاں ایک اشکال ہو کہ صاحب جب ارادہ کو فنا کردیں تو نماز اور روزہ کا بھی ارادہ فنا کردیں سو سمجھ لو کہ ارادہ کو فنا کردینے کا مطلب یہ ہے کہ جو ارادہ حق کے خلاف ہو اُسے فنا کردو اور جو ارادہ حق کے موافق ہو وہ تو مطلوب ہے اور نماز و روزہ کا ارادہ مرضی حق کے موافق ہے اس کو فنا مت کرو غرض یہ ہے کہ چین کی جڑ اور روح جو اس کو جوانی میں حاصل کرلے گا جو کہ اس وقت درجہ درجہ میں دوائیں ہوگی تو بڑھاپے میں آرام سے رہے گا اور چین سے بسر کرے گا اور بحکم غذا بھی ہوجائے گی اور یہ اوپر ثابت ہوچکا ہے دوا بھی نعمت ہے اور غذا بھی نعمت ہے کیونکہ وہ مجاہدہ ہے اور غذا مشاہدہ ہے اور مشاہدہ بغیر مجاہدہ کے نصیب نہیں ہوسکتا اِس لئے وہ مجاہدہ بھی نعمت ہے۔ اِس مقام پر جس

نعمت کا ذکر ہے اس کے یہی دو درجے ہیں بعض کے لئے غذا یہ سب اس کی تمہید تھی تمہید میں قدرے طول ہو گیا مگر خیر میں مقصود میں بھی کیا بیان کرتا اس میں بھی یہی بیان کرتا۔ بہر حال حق تعالیٰ نے ایک نعمت مرحمت فرمائی اوّلاً رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور ثانیاً آپ کے غلاموں کو جسے لوگ تکلیف اور مصیبت سمجھتے ہیں مجھے اپنے بچپن کی ایک حکایت یاد ہے کہ ایک بار میں مسہل پینے سے گھبرا رہا تھا تو والد صاحب نے فرمایا کہ تم مسہل پی لو تمہیں ایک روپیہ دیں گے چنانچہ اس روپیہ کی لالچ میں وہ مسہل پی لیا لیکن جب عقل آئی اس وقت معلوم ہوا کہ مسہل پینے سے انکار کرنے میں کس قدر غلطی پر تھا کیونکہ وہ در اصل میرے ہی آرام کے لئے تھا اسی طرح جب ہمیں عقل آوے گی تو اس نعمت کی قدر ہو گی کہ بڑی چیز ہے اگر دوا ہے تب بھی نعمت ہے کیونکہ صحت اسی سے ہے اور غذا کا لطف صحت ہی سے ہے
۲۹ غذا مطلوب بالذات ہے تو دوا مطلوب بالعرض ہے بہر حال دوا ہو یا غذا ہر حال میں نعمت ہے اور وہ نعمت کیا چیز ہے اب میں اس کا نام بتائے دیتا ہوں جس کے نام سے لوگ گھبراتے ہیں یعنی شریعت اب تو شریعت کا نام سنا اور ڈرے کہ بس بھائی خدا خیر کرے اب حکم ہو گا کہ کھاؤ نہیں، پیو نہیں، ہنسو مت، بولو مت۔ ایک عنایت فرماتے مجھ سے فرمایا کہ شریعت کا خلاصہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ نہ ہنسنے کی جگہ ہنسو نہ رونے کی جگہ روؤ گلا گھونٹا ہوا رکھو میں نے کہا آپ جیسے سمجھدار جیسا خلاصہ نکالیں گے تو واقعی پھر تو یہی خلاصہ ہو گا شریعت کا ایسے بدمذاق لوگوں کی بالکل اس چمار کی لڑکی کی مثال ہے کہ ایک راجہ تھا گنوار سا اس کی ایک لڑکی تھی اس کی شادی وہ کسی سے نہیں کرتا تھا کیونکہ اسے یہ خبط تھا کہ کوئی میرے برابر کا نہیں ہے بڑے بڑے راجاؤں کے پیام پھیر دیتا تھا اتفاق سے ایک مرتبہ شدت سے آندھی چلی اور زور کے بگولے میں ایک چمار کا لڑکا

اُڑکر راجہ کی چھت پر گرا لوگوں کو اور راجہ کو یہ تعجب ہوا کہ یہ لڑکا یہاں کہاں
سے اور کیوں آیا عقلاء کو بلایا گیا اور پوچھا کہ یہ کیا ہے انھوں نے سوچ کے
کہا کہ یہ غیبی آدمی ہے جو اس لڑکی کے ساتھ شادی کے واسطے بھیجا گیا ہے جب
عالمِ شہادت میں کوئی آدمی شادی کے قابل نہ نکلا تو عالمِ غیب سے اس کو بھیجا
گیا حکم دیا اسے حمام میں لے جاؤ کپڑے بدلواؤ جب اسے حمام میں لے چلے وہ
بڑا چلّایا راجہ نے حکماء سے پوچھا کیا ہے یہ چلّاتا کیوں ہے انھوں نے کہا
حضور یہ عالمِ غیب سے تازہ آیا ہے ابھی ہم لوگوں سے مانوس نہیں ہے اس سے
گھبراتا ہے اسے زبردستی حمام میں لیجاکر گرم پانی سے نہلایا جب کپڑے پہنانے
کا قصد کیا گیا تو کپڑے دیکھ کر اور گھبرایا اور بہت چلایا راجہ نے پھر حکماء سے
پوچھا انھوں نے کہا اس نے ابھی دنیا کی چیزیں نہیں دیکھی ہیں اچھا اس کے
سامنے بہت سے جواہرات لائے جائیں یہ ان سے مانوس ہوگا چنانچہ بہت سے
۳۰ جواہرات خوب چمکتے چمکتے اس کے آگے لاکے رکھے گئے تو وہ پریشان ہوا اور
لگا چلانے سب سے اخیر میں حکماء کی یہ رائے ہوئی کہ اچھا خود شہزادی کو اس کو
سامنے بٹھا دیا جائے کہ شاید اسے ادھر رغبت ہو اور یہ قرار پکڑے جب
شہزادی سامنے لائی گئی تو اب تو اس کے چلانے اور پریشان ہونے کی کوئی
حد و انتہا ہی نہ رہی بہت ہی رویا چلایا اب حکماء نے کہا کہ اچھا اسے آزاد
کر دیا جائے جب یہ اس عالم سے مانوس ہوگا تب شادی کی جائے چنانچہ
وہ آزاد ہوتے ہی سب کپڑے اُتار اور اپنی لنگوٹی باندھ مخلّی بالطبع ہو کر
اپنے گھر کی طرف بھاگا اور گھر پہنچ کر اپنی ماں کو لپٹ گیا اور اس طرح اپنی
سرگذشت سنانے لگا کہ مجھے ڈاکو پکڑ لے گئے تھے میری مَیّا مجھے ایک کوٹھری
میں بند کیا (یہ حمام کا خاکہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری مَیّا پھر انھوں نے
مجھکو کفن پہنایا (یہ جوڑے کی قدر کی ہے) تب بھی میں نہ مرا میری مَیّا پھر
وہ جلتی بلتی آگ لائے (جواہرات کا نقشہ ہے) تب بھی میں نہ مرا میری مَیّا

پھر وہ ایک ڈائن کو بلا لائے (یہ شہزادی ہے) کہ مجکو کھا جائے تب بھی نہ مرا میری میّا۔ بس جو مذاق اس چمار کے لڑکے کا تھا وہ مذاق ہم لوگوں کا ہے کہ شریعت جیسی حسین شہزادی کو ڈائن سمجھ کر اس سے گھبراتے اور بھاگتے ہیں اجی شریعت تو ایسی حسین ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(از سرتا پا جدھر بھی نگاہ ڈالتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ ہے)

افسوس ہم نے اسے چھوڑ کے دنیا کو محبوب بنایا ہے جس کی یہ حالت ہے ؎

بس قامت خوش کہ زیر چادر باشد چوں باز کنی مادر مادر باشد

یعنی سمجھے کہ یہ بڑی حسین اور نوجوان ہوگی مگر جب چادر اٹھا کے دیکھا تو وہ نانی اماں سے بھی بڑی تھی اب سمجھ لیجئے کہ آپنے کس کو چھوڑا اور کس کو لیا ؎

بقول دشمن پیمان دوست بشکستی ببیں کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

۲۱ (بقول دشمن دوست سے عہد کیوں توڑ دیا۔ دیکھ تو سہی کیوں قطع تعلق کیا اور کیوں ملا)

وجہ یہ ہے کہ شریعت کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور نہ اس کا حسین چہرہ دیکھنے کے لئے آنکھ بنوائی اِس لئے دنیا کی بُرائیاں نہیں دکھائی دیتیں اجی اندھا اس سے زیادہ کیا دیکھتا ہے کہ ڈیل نرم نرم ہو بس یہ حُسن ہے اس کے نزدیک اور چاہے چہرہ پر آدھ سیر قیمہ بھرنے کی ضرورت ہی ہو اور چاہے ایسا ہو کہ جیسے اُپلے میں کوا مٹھونگیں مار گیا ہو آنکھیں درست کرائیں تو اصل حُسن کی پہچان ہو اور آنکھ میں یہ دھند۔ اور جالا کاہے کا ہے غرض نفس کا ہے اور اتباع ہوا کا ہے شریعت نے تو حقیقی مصالح کی ذمہ داری لی ہے خاص آپ کی موافقت نفس کا تو ٹھیکہ نہیں لیا ہے حکمت کے اقتضا رسے جیسا مناسب ہوگا شریعت ویسا حکم کرے گی حکیم تو وہی ہے جو مرض کے مناسب نسخہ تجویز کرے نہ کہ مریض کے نفس کے مناسب اور جو مریض کی مرضی کی رعایت کرے گا وہ اصل میں طبیب نہیں ہے وہ فیس اینٹھنے والا ہے جو کہ آپ کی مرضی کے

موافق نسخہ لکھ کر آپ کو خوش کر کے فیس لینا چاہتا ہے بہت لوگ علماء میں بھی ایسے ملیں گے کہ فیس لے کے مستفتی کی مرضی کے موافق فتویٰ لکھ دیتے ہیں میں نے ایک ہزار روپیہ کا فتویٰ دیکھا جس میں سگی خوشدامن کا نکاح داماد سے حلال لکھا تھا آپ کو تعجب ہوتا ہوگا کہ قرآن میں جس کی حرمت کی تصریح ہو اس کی حلت کا فتویٰ کیسے لکھ دیا اور لوگوں نے اُسے مان کیسے لیا اجی کمال تو جب ہی ہے کہ جب لوگ مان بھی لیں کیونکہ فتویٰ تو لوگوں کے اعتراض سے بچنے کے لئے حاصل کیا جاتا ہے جب اعتراض سے بچاؤ نہ ہوا تو وہ فتویٰ ہی کیا ہوا اور پھر ہزار روپیہ کون دیتا ایسے فتوے لکھنے والے بڑے ذہین ہوتے ہیں۔

قصہ یہ تھا کہ ایک داماد ساس پر فریفتہ ہوگیا تو اس نے ایک مفتی سے کہا کہ کیا ترکیب کروں کہ اس سے نکاح کرسکوں اُس نے کہا ہزار روپیہ دو ترکیب میں بتادوں گا چنانچہ اس نے ہزار روپئے دیئے ہزار روپیہ لے کے اُس نے
کیا ترکیب کی کہ یہ لکھا کہ ساس اس کو کہتے ہیں جو منکوحہ کی ماں ہو۔ پہلا مقدمہ ۴۲
منکوحہ اس کو کہتے ہیں جس کا نکاح شریعت کے موافق ہوا ہو۔ دوسرا مقدمہ عموماً عورتیں کلمات شرک وکفر اپنی زبان سے جاری کرتی ہیں جس سے مرتد ہوجاتی ہیں اور مرتدہ کا نکاح درست نہیں ہوتا اس لئے قبل نکاح تجدید ایمان ضروری ہے تیسرا مقدمہ۔ یہ مشرکہ تھی کہ عادت کے موافق کلمات شرک و کفر زبان پر لاتی تھی چوتھا مقدمہ۔ اور اسے تجدید ایمان نہیں کرائی گئی۔ پانچواں مقدمہ۔ لہٰذا شرعاً نکاح نہیں ہوا مشرکہ سے مومن کا نکاح نہیں ہوتا جب یہ منکوحہ نہ ہوئی اس کی ماں ساس بھی نہیں ہوئی۔ رہ گئی حرمت مصاہرت سو یہ ابوحنیفہؒ کی گھڑت ہے جو حدیث کے خلاف ہے اس لئے حدیث کے مقابلہ میں ہم ابوحنیفہؒ کا قول نہیں مانتے۔ اے لیجئے بس وہ حرمت مصاہرت سے بھی بری ہوگئی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ اسی طرح میں نے اور طرح طرح کے فتوے دیکھے ہیں تو کیا یہ لوگ طبیب ہیں

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

صاحب طبیب تو وہی ہے جو اپنی مرضی کا نسخہ لکھے اور مریض کو اس کے پینے پر مجبور کرے چاہے فیس ملے یا نہ ملے اسی طرح بہت سی باتیں شریعت کی بھی جو آپ کے خلاف ہوں گی آپ کو ناگوار ہوں گی مثلاً کسی شخص کی عادت رشوت لینے کی ہے جب اُسے یہ معلوم ہوگا کہ رشوت لینا حرام ہے تو کس قدر ناگوار ہوگا کہ ہزار روپیہ کا نقصان ہوا اگر اتفاق سے اسی لینے والے کو کہیں رشوت دینا پڑے تو اُس وقت اس قانون کی خوبی سمجھ میں آجاوے اگر کوئی اس سے ہزار روپے رشوت کے لے کے فتویٰ سنے اور واپس کر دے تب اس سے کوئی پوچھے کہ شریعت کا حکم کیسا ہے یہ کہے گا کہ سبحان اللہ کیا کہنا ہے شریعت کا بھلا ایسے خود غرض کا کیا فیصلہ اپنی اغراض سے قطع نظر کر کے فیصلہ کرو تو ہم مانیں گے اِس سے تو معلوم ہوا کہ محض غرض کے بندے ہو بلکہ اگر کوئی غرض سے بھی قطع نظر کرے اور وہ عقل سے اپنی مصالح کا فیصلہ کرلیا کرے تو یہ فیصلہ بھی قابل اعتبار نہیں کیونکہ وحی کے آگے عقل کیا چیز ہے۔ غرض شریعت سے ناگواری کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کی خوبیاں دیکھنے کے لئے آنکھ نہیں ہے اگر آنکھ ہو تو معلوم ہو جائے کہ شریعت میں کہیں حق تعالیٰ نے اپنی غرض پوری نہیں کی ہے ؎

من نہ کردم خلق تا سودے کنم　　　بلکہ تا بر بندگاں جودے کنم

(میں نے مخلوق کو اپنا فائدہ حاصل کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ اس پر جود و کرم کروں)

ہمارے مصالح کی ایسی رعایت کی ہے کہ شاید آپ خود بھی نہ کر سکتے۔ مثلاً شریعت نے یہ بتایا کہ پھل آنے سے پہلے باغ کی فصل بیچنا حرام ہے گو یہ فیصلہ مالک باغ کو ناگوار ہو کہ پھل آنے سے پہلے تو باغ پانچسو کو بکتا تھا اور جب پھل آئے اور کم آئے تو اڑھائی سو کو بیچنا پڑا لیکن خریدنے والے سے پوچھو کہ وہ شریعت سے کتنا خوش ہے کہ پانچسو جس باغ کے دیتا تھا ڈھائی سو میں مل گیا اِسی طرح ایک شخص نے ایک بیٹی اور ایک دور کا عصبہ چھوڑا آدھی میراث بیٹی کو ملے گی اور آدھی عصبہ کو اس میں بیٹی کو بڑا ناگوار ہوا کہ

یہی نہیں بلکہ بیٹی اور بیٹے باپ کا مال یہ دونوں کا رشتہ دار ہے خواہ مخواہ دیدیا
مگر اس عصبیت سے پوچھو تو وہ کہے گا سبحان اللہ شریعت میں حقائق کی کیا رعایت
ہے کہ دور دور کی قرابت کو بھی اس قدر مانا ہے تو اب ایک ہی حکم ہے مگر
دو آدمیوں میں سے اپنی اپنی اغراض کی وجہ سے ایک کو ناگوار ہوا اور ایک
کو گوارا ہے اب ہم کس کے فیصلہ کو ان دونوں میں سے مانیں ؎

تَرَکْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰی جَمِیْعًا　　كَذَالِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيْرُ

یعنی لات اور عزّیٰ دونوں کو چھوڑ دیا ہم ان دونوں میں سے کسی کا فیصلہ
نہیں مانیں گے کیونکہ یہ دونوں خود غرض ہیں ہم تو وحی کا فیصلہ مانیں گے
کیونکہ وہاں شائبہ غرض کا نہیں ہے اس لئے وہی قابل اعتبار ہے وحی کا
فیصلہ یہ ہے کہ شریعت قانون عام ہے جو مصالح عامہ کی رعایت کرتا ہے
جیسے سرکاری قانون مثلاً سڑک پر پیشاب کرنا جرم ہے اب ایک شخص کو
زور کا پیشاب لگا وہ کہاں جائے وہاں تو یہ حکم ہے پیشاب مت کرو اور
یہاں موت نکلا جا رہا ہے تو وہ شخص کیا کہے گا کہ بڑی سختی کا قانون ہے کیا
یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ پیشاب کی تو اجازت ہوتی مگر اس کی بدبو سے بچنے
کے لئے کوئی ایسی دوا ڈال دی جاتی کہ دماغ بھس ہو جاتے اس لئے کسی کو
بدبو نہ معلوم ہوتی بھلا کون اسے پسند کریگا کہ اس گدھے کے موتنے کے
واسطے سب کو بھس بنا دے اسی طرح شریعت نے بھی مصالح عامہ کی رعایت
سے قانون بنایا ہے تم اس میں مصالح خاصہ اور وہ بھی نفسانیہ ڈھونڈھتے
ہو۔ اور شریعت کا اچھا معلوم ہونا مصالح عامہ کی رعایت سے یہ تو حکماء و
عقلاء کی نظر میں ہے اور ایک نظر ہے عشق و محبت والے کی اس کو اس سے
اچھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ دوست کا قانون ہے یہ حکماء کی نظر سے بڑھ کر ہے
جیسے کوئی طوائف اپنے کسی عاشق سے یہ کہہ دے کہ تم لنگوٹی باندھ کے ام امین آباد
کے بازار میں پھرو یہ اس سے نہیں پوچھے گا کہ بی اس میں تمہارا کیا فائدہ بلکہ

فوراً اِدھراُدھر دوڑنے لگے گا اگر کوئی کہے بھئی گدھے یہ کیا ہے تو وہ کہے گا قال الجدار للوتد لم تشقنی ؛ قال الوتد انظر الی من یدفنی ایک شخص دیوار میں کیل ٹھونک رہا تھا تو دیوار نے کیل سے شکایت کی کہ میں نے کیا کیا جو میرے جگر کو شگافتہ کر رہی ہے کیل نے جواب دیا اس سے پوچھو جو مجھے ٹھونک رہا ہے۔ تو حکماء وعقلاء احکام کے لِم کے درپے ہوں گے اور جو عاشق ہوگا وہ یہ کہے گا کہ حکمت اس سے پوچھو جس نے یہ قانون مقرر کیا ہے مجھ کو کچھ بحث نہیں بس مولوی صاحب کو یہی جواب اختیار کر لینا چاہئے ؎

درپسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استادِ ازل گفت بگو میگویم

(مجھے پردہ کے پیچھے طوطے کی طرح رکھ چھوڑا ہے مجھے جو استاد کہتا ہے وہی کہتا ہوں)

غرض یہی علماء کو بھی مناسب ہے میں ان کو وصیت کرتا ہوں کہ اگر حِکم واسرار معلوم بھی ہوں تو پوچھنے پر تو ہرگز مت بتاؤ چاہیے یہی گمان کریں کہ انھیں نہیں آتا۔ اور پوچھنے والے بھی خوب سمجھ لیں کہ جاننے والے بھی بہت ہیں ۳ مگر تمہارے غلام نہیں ہیں کہ تمہیں سب بتا دیا کریں جیسے طبیب کہ جانتا سب ہے کہ تین ماشہ گل بنفشہ کیوں لکھا اور چھ ماشہ گل گاؤزباں کیوں لکھا مگر کوئی مریض پوچھنے لگے تو وہ نہیں بتائے گا اگر وہ کہے کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں طب نہیں آتی ہاں صاحب نہیں آتی پسند ہو پیو ورنہ مت پیو عارف شیرازیؒ کہتے ہیں ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز — ورنہ در مجلس رنداں خبری نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز کو ظاہر کیا جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ معلوم ہو)

یعنی کوئی خبر ایسی نہیں ہے کہ ہمیں معلوم نہ ہو مگر ہم تمہارے کہنے سے نہیں بتاتے اور حقیقت میں مصلحت اور حکمت پوچھنے کی ضرورت ہی کیا محبوب حکم سمجھ کر کرنا چاہئے محبوب سمجھ کر اس کے حکم کی عِلّت دریافت کرنا عشق کے بالکل ہی خلاف ہے۔ اگر کوئی کہے کہ جاؤ ہم عاشق ہی نہیں پھر ہم پر

وظائف عشق بھی واجب نہیں تو صاحب تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے عشق تو لوازم ایمان سے ہے جب تم نے آمنّا کہا تو عشقنا کا التزام بھی کر لیا جیسے کوئی شخص کہے مجھ پر نان ونفقہ بی بی کا کیسے واجب ہو گیا میں نے تو اس کا التزام نہیں کیا تھا صرف قبلتُ النکاح کہا تھا ہر شخص یہی کہے گا جب قبلتُ کہا جب ہی شوہری کے حقوق کے ملتزم ہو گئے پس اسی طرح جب لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم کہا پس عاشق ہو گئے کیونکہ اس کلمہ سے مومن ہو گئے اور مومن کے بارے میں ارشاد ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ جو لوگ خدا تعالیٰ پر ایمان لائے وہ خدا تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھتے ہیں تو تصدیق ایمان کے ساتھ ہی سارے کے سارے عاشق ہو گئے اب آپ عشق سے انکار کریں تو کیا ہوتا ہے جب عاشق ہونا ثابت ہو گیا تو عشق کے حقوق ادا کرو بس کان مت ہلاؤ اور سیدھے محبوب کے حکم پر چلتے رہو اگر کوئی اس انقیاد کا قصد کرے تو اوّل اوّل تو تکلف ہوتا ہے پھر اس کی عادت ہو جاتی ہے تو اس کے ترک میں تکلف ہوتا ہے جس طرح دوا عادت پڑنے سے غذا ہو جاتی ہے اگر کوئی کہے کہ دوا کیونکر غذا ہو جاتی ہے تو میرے پاس اس کی لاجواب مثال موجود ہے دیکھئے حضرت تمباکو سلمہ اللہ تعالیٰ کہ کوئی اس سے مشکل سے بچا ہو گا کہیں اکلاً اور کہیں شرباً اس کا استعمال ہوا کرتا ہے شروع کرتے وقت کیسی متلی ہوتی تھی کیسی اُبکائیاں آتی تھیں چکر آتا تھا مگر جب عادت پڑ جاتی ہے تو پھر یہ جناب سب سے زیادہ مرغوب ہو جاتی ہے روزے میں سب کو تو پانی اور شربت کی فکر ہوتی ہے مگر انھیں نہ پھلکیوں کی پروا نہ شربت کی پروا نہ افطاری سے مطلب ارے بھئی حقہ دیدو ایک پان دیدو ایسی مکروہ چیز کیسی محبوب ہو گئی اے اللہ تمباکو کی تو اتنی محبت اور شریعت کی اتنی بھی نہیں ارے بھئی تمباکو ہی سمجھ لیا ہوتا تمباکو تو کیا ہوتا آخر کسی طرح بھدے لوگوں کو سمجھاؤں بھی۔ اگر خمیرہ گاؤ زبان نہیں سمجھتے تو خمیرہ تمباکو ہی سمجھو۔

بہر حال اب یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ عادت ڈال لو تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے بعض بزرگوں کو کسی تکلیف کے وقت نماز کو اٹھتے ہیں ناک منہ چڑھاتے دیکھ کر اگر یہ شبہ ہو کہ عادت پڑ جانے کے بعد ان پر کیوں اثر ہے بات یہ ہے کہ ان کے دل پر اثر نہیں ہے صرف جسم پر ضعف کی وجہ سے اثر ہے اور دل میں نہایت خوش ہیں اس کی مثال بھی میرے پاس موجود ہے اور وہ نظیر حضرت تمباکو کے دوست مرچ ہیں کہ ناک بہہ رہی ہے آنسو جاری ہیں سی سی کر رہے ہیں مگر کھائے چلے جاتے ہیں کیوں صاحب اگر تکلیف ہے تو کیوں کھاتے ہو بات یہ ہے کہ تکلیف منہ کو ہے مگر زبان اور حلق کو تو مزہ آتا ہے اس لئے منہ کی تکلیف گوارا ہے تو اب سمجھ میں آگیا لذت والم دونوں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح امتثال امر محبوب میں گو بدن کو تکلیف ہو مگر دل اور روح شاداں ہے اس عادت کا یہ اثر ہے کہ اگر ایک نماز بھی قضا ہو جائے گو بدن کو آرام ملا کہ پڑے سوتے رہے مگر قلب کو جو تکلیف ہے اس کے آگے یہ آرام کچھ بھی نہیں حضرت مولانا فرماتے ہیں ؎ ۵

بر دل سالک ہزاراں غم بود گر ز باغ دل خلالے کم بود

(اللہ والے کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر دل کے باغ میں گنجائش کم ہوتی ہے)

یعنی اگر باغ دل سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے اُس وقت دیکھو اُن کے غم کو پھر اس میں بھی دو درجے ہیں زاہد کو تو غم ہوتا ہے مطلقاً عمل فوت ہو جانے کا اور عارف کو غم ہوتا ہے باختیار خود فوت ہو جانے کا اور بلا اختیار فوت ہونے کا کچھ غم نہیں ہوتا کیونکہ دوست نے اس میں یوں ہی تصرف کیا مگر یہ بات تمام لوگوں کو سنانے کی نہیں کیونکہ یہ اگر قصداً بھی سو گئے اور نماز قضا کر دی تو حیلہ نکال لیں گے کہ محبوب کی یوں ہی مرضی تھی تو یہ مرضی مرض والوں کے لئے نہیں کیونکہ وہ خود مَرضی (بفتح الراء)

ہیں جیسے مرض والے بہرحال تکلیف طبعی سے جسم کو پریشانی ہوتی ہے مگر روح کو نہیں ہوتی
بلکہ ان اعمال سے ایسی مناسبت ہو جاتی ہے کہ وہ غذائے روح بن جاتی ہیں کہ اگر وہ نہ
ملیں تو پریشان ہوتی ہے صرف شروع میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے جیسے مشاہدہ سے پہلے مجاہدہ کی ضرورت
ہے یا غذا سے پہلے دوا کی حاجت ہوتی ہے پھر تو دوا بھی غذا ہو جاتی ہے
تو حضرت ایسی چیز ہے شریعت جس سے ڈرتے ہیں لوگ حالانکہ اس میں ہمارے
کل مصالح دینیہ و دنیویہ کی پوری رعایت کی ہے اور ساری مصلحتوں سے بڑھ کر
تو چین ہے جو بدون اتباع احکام شریعت نصیب ہی نہیں ہو سکتا اگر کوئی
شخص کہے کہ بدون اتباع احکام کے بھی چین نصیب ہو سکتا ہے کیونکہ چین
تو بقول تمہارے تعلق مع اللہ سے حاصل ہوتا ہے پس اگر ہم ہر وقت خدا تعالیٰ
کو یاد کریں اور اتباع شریعت نہ کریں تو تعلق مع اللہ تو حاصل ہو گیا پس
چین سے رہیں گے تو خوب سمجھ لو کہ مطلق تعلق سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا
ایسے تعلق میں چین کا گمان بھی ہے لیکن فی الواقع اس میں بے چینی مضمر ہے جو ۶
مرنے کے بعد کھل جائے گی جیسے ایک ایرانی شخص ہندوستان میں آیا ایک
حلوائی کی دکان پر جا کے حلوا لیا اس نے دام مانگے یہ وہاں سے بھاگے وہ حلوائی
بھی پیچھے بھاگا جب وہ اتنا بھاگ کر قریب تھا کہ پکڑ لے آپ نے وہ حلوا جھٹ
منہ میں رکھ لیا کہ اب نہ تمہارا نہ ہمارا وہ پکڑ کے پولیس میں لے گیا تھانہ دار
کوئی رحمدل تھے انھوں نے بجائے چالان کرنے کے یہ سزا دی کہ گدھے پر سوار
کرکے اور اعلان کے لئے ڈھول کے ساتھ شہر سے باہر نکال دینے کی سزا دی
لونڈوں نے جو اسے گدھے پر سوار دیکھا تو وہ بھی تماشہ کے طور پر ساتھ ہو لئے
یہ ہندوستان کی سیر سے فارغ ہو کر اپنے ملک پہونچے وہاں لوگوں نے
اُن سے پوچھا کہ آغا ہندوستان رفتہ بودی چہ طور ملک ست۔ ہندوستان
کیسا ملک ہے آپ نے کہا خوب ملک ست۔ بڑا اچھا ملک ہے پوچھا گیا
بچہ طور تو آپ فرماتے ہیں در ہندوستان حلوا خوردن مفت ست۔ حلوا

مفت کھانے میں آتا ہے۔ سواری خر مفت ست۔ گدھے کی سواری مفت ملتی ہے۔ ڈمڈم مفت ست۔ باجا مفت ملتا ہے۔ فوج طفلاں مفت ست۔ لڑکوں کی فوج مفت ملتی ہے۔ ہندوستان خوب ملک ست تو جیسے ان حضرت کو یہ معلوم ہوا کہ یہ حشم خدم عزت کا سامان تھا یا نہایت ذلت کی سزا تھی اسی طرح ان کو نہیں معلوم کہ یہ چین ہے یا بے چینی لیکن کہاں تک ؎

سَوْفَ تَرٰی اِذَا انْکَشَفَ الْغُبَارُ　　اَفَرَسٌ تَحْتَکَ اَمْ حِمَارٌ

(جب غبار چھٹ جائے گا تو جلدی معلوم ہو جائے گا کہ تم گھوڑے پر سوار تھے یا گدھے پر یعنی مرنے کے بعد فوراً پتہ چل جائے گا کہ تم نے اچھا کیا یا برا)

جب حقیقت منکشف ہوگی اُس وقت معلوم ہوگا کہ چین تھا یا بے چینی جیسے اس آغا کو جب ان سب باتوں کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی تو کس قدر شرمندہ ہوا ہوگا اسی طرح انھیں بھی مرتے وقت معلوم ہو جائے گا کہ وہ لذت تھی یا بے لذتی غرض جو تعلق و نسبت مطلوب اور سرمایۂ راحت ہے تو وہ ہے ۷
جو جانبین سے ہو رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ (اللہ راضی ہوا وہ سب اللہ سے راضی ہوئے) وہ نسبت ہی نہیں جو صرف ایک ہی طرف سے ہو جیسے کسی شہر میں ایک پردیسی طالب علم تھے اُن کے دیس کے کوئی آدمی ان سے ملنے گئے انھوں نے پوچھا میاں طالب کس رنگ میں ہو کہنے لگے کہ شہزادی سے نکاح کی فکر میں ہوں پوچھا کیا سامان ہوا کہنے لگے ہاں آدھا کام تو ہو گیا آدھا باقی ہے پوچھا کس طرح کہنے لگے میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں خوب آدھا ہو گیا تو یہ آلو پن ہے اسی طرح بہت سے لوگ بزعم خود صاحب نسبت ہیں جو ملکہ یادداشت بہم پہونچا کر اپنے کو مقبول سمجھتے ہیں مگر اتباع شرع نہ ہونے کے سبب ان کے زعم کا حاصل یہ ہے کہ ہم تو راضی ہیں مگر اللہ میاں راضی نہیں۔ خوب سمجھ لو کہ ان کے راضی ہونے کا معیار صرف احکام کا اتباع ہے اگر اسی حال میں موت آگئی تو سب کھل جائے گا کہ یہ تعلق ان کو

پسند نہ ہونے کے سبب تمہاری نظر میں کس قدر خوار ہوگا بقول سعدیؒ ؎

چو در چشم شاہد نیاید زرت　　زر و خاک یکساں نماید برت

آپ نے ہزار روپے محبوب کو بھیجے کہ وہ خوش ہو مگر معلوم ہوا کہ وہ خوش نہیں ہوا اور اُس نے نہیں لیا اور انھیں واپس کر دیا کسی نے اگر کہا کہ گھر میں بھیج دو تو یہی کہو گے پھینکو بھی ہیں کیا کروں گا ایسے منحوس روپیہ کو اسیطرح جب معلوم ہوگا کہ حق تعالیٰ اِس تعلق سے راضی نہیں ہوئے تو اس تعلق کو کیا سمجھو گے تعلق وہی ہو کہ دونوں جانب سے ہو اور یہ تعلق بدون اتباع شریعت کے ہو نہیں سکتا تو دیکھئے شریعت کتنی بڑی چیز ہوئی حق تعالیٰ اِسی کو فرماتے ہیں ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا۔ ثُمَّ لانے کی وجہ یہ ہے کہ اوپر فرماتے ہیں وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (یعنی ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے ان کو نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں اور ہم نے ان کو دنیا جہان والوں پر فوقیت دی اور ہم نے ان کو دین کے بارہ میں کھلی کھلی دلیلیں دیں سو انھوں نے علم ہی کے آنے کے بعد باہم اختلاف کیا بوجہ آپس کی ضد ضدی کے آپ کا رب ان کے آپس میں قیامت کے روز ان امور میں فیصلہ کر دیگا جن میں یہ باہم اختلاف کیا کرتے تھے اس کے بعد فرماتے ہیں ثُمَّ جَعَلْنٰكَ یعنی پھر آپ سے پہلے بنی اسرائیل کو کتاب وغیرہ عنایت کی تھی اس کے بعد ہم نے آپ کو دین کے ایک خاص طریقہ پر کر دیا مِنَ الْاَمْرِ میں مِن بیانیہ ہے کہ وہ شریعت یا طریقہ خاص کیا ہے وہ امر دین ہی پس اس کا اتباع کیجئے۔ لقب کتنا لطیف ہے شریعت یعنی جس عنوان سے علماء

اتباعِ دین کا امر کرتے ہیں وہی عنوان آیت میں وارد ہوگیا جس سے صریحاً مدعا
علماء کا ثابت ہوگیا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
کو حکم ہوا اتباع شریعت کا تو اور کسی کا کیا منہ جو اپنے کو اس سے آزاد سمجھے
وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ اور ان جاہلوں کی خواہشوں کا اتباع
نہ کیجئے سبحان اللہ کیا پاکیزہ طرز بیان ہے یہ نہیں فرمایا وَلَا تَتَّبِعْ غَيْرَهَا
کہ غیر شریعت کا اتباع نہ کیجئے بلکہ یوں فرمایا کہ جہلاء کی خواہشوں کا اتباع
نہ کیجئے اِس میں یہ بتا دیا کہ جو شریعت کے مقابلہ میں ہوں وہ خواہشیں ہیں
وہ ہوائے نفسانی ہیں اِس لئے وہ عمل کے قابل نہیں اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ قید احترازی ہے یعنی اَلَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ کی اہوا کا
اتباع جائز ہے بلکہ یہ قید واقعی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ واقع میں علماء
ہی نہیں ہیں جو شریعت کے مقابلہ میں اپنی خواہشیں پیش کرتے ہیں بلکہ وہ
تو جہلاء ہیں جیسے یوں کہتے ہیں کہ مفسدوں کے بہکانے میں نہ آنا تو اس کا ۹
یہ مطلب تھوڑا ہی ہے کہ غیر مفسدین کے بہکانے میں آجانا نہیں مطلب
یہی ہے کہ بہکانے والے سب کے سب مفسد ہوتے ہیں اُن سے بچتے رہنا
اِسی طرح یہاں بھی سمجھ لو اور اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ کا مفعول جو ذکر نہیں
فرمایا سبحان اللہ اس میں عجیب رعایت ہے اگر مفعول ذکر فرماتے تو وہ
امرالدین ہوتا تو ایک گونہ مصادرہ ہوجاتا کیونکہ امر دین ہی میں تو کلام
ہو رہا ہے تو اس صورت میں یہ حاصل ہوتا کہ غیر دین اِس لئے مذموم ہے کہ
وہ اہوا ہے اور اہوا اِس لئے مذموم ہے کہ وہ دین نہ جاننے والوں کا
فعل ہے اِس لئے یہاں مطلق علم کی نفی کردی کہ اہوا اِس لئے مذموم ہے کہ
وہ ایسوں کا فعل ہے جو بالکل ہی جاہل ہیں یہ دعوے کہ جو شخص شریعت
کا متبع نہ ہو وہ بالکل جاہل ہے اِتنا بڑا ہے کہ سارا عالم اس میں مقابل
ہے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو پورا یقین ہے کہ یہ ساری

دنیا کو جاہل بنانا اتنی پکی بات ہے کہ اس میں ذرا احتمال خلاف کا نہیں ورنہ آپ کو جھجک ضرور ہوتی کہ کوئی مطالبہ نہ کر بیٹھے اور اس وقت گو ظاہر میں آپ نہیں تشریف رکھتے مگر آپ کا علم وفیض تو ہے جیسے آفتاب پر ابر آجاوے تو آفتاب نظر سے پوشیدہ ہے مگر اس کی روشنی تو ہو بلکہ چوندھوں کے لئے تو یہ ابر بھی رحمت ہے کہ براہ راست وہ اس کا تحمل نہ کر سکتے اسی طرح لتنے لوگ ایسے ہیں کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوتے تو یقیناً حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے عار کرتے اور اس سے حدود کفر میں پڑ جاتے تو اچھا ہوا کہ ابر آگیا ورنہ ان چوندھوں کی بڑی مشکل ہوتی بہرحال اب وہ آفتاب کی روشنی ابر سے بھی چھن رہی ہے اس موقع پر میں مولانا کا یہ شعر پڑھتے پڑھتے رک گیا وہ شعر یہ ہے ؎

چونکہ شد خورشید و مارا کرد داغ چارہ نبود در مقامش از چراغ

یعنے آفتاب رخصت ہوگیا اور ہمیں اسے اس لئے پسند نہیں کرتا کہ آفتاب رخصت نہیں ہوا وہ تو اب بھی درخشاں ہے صرف ابر کے پیچھے چھپ گیا ہے بلکہ یہ شعر اس موقع پر مناسب ہے ؎

ہنوز آں ابر رحمت درفشان ست خم وخمخانہ با مہر و نشان ست

(اب بھی وہ ابر کرم دُرفشاں ہے خم اور خمخانہ مہر و نشان کے ساتھ موجود ہے)

اور مولانا نے وہ شعر کسی دوسرے موقع پر فرمایا ہے۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے فیض لینے والے اب بھی موجود ہیں جو اب بھی اس دعوے کو ثابت کرنے کو تیار ہیں کہ جو متبع شریعت نہ ہو وہ جاہل ہے اور میں خود تو دعویٰ نہیں کرتا مگر دین کے محاسن پر نظر کر کے کہتا ہوں کہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا لائق ہو مگر عالم نہ ہو اور نہ کسی عالم محقق کی صحبت میں رہا ہو اس کو کسی محقق کی

صحبت میں چھ مہینے کے لئے بھیجدو خدا کی قسم اس چھ مہینے میں وہ محقق یہ ثابت کردے گا اور اس عاقل کی زبان سے اقرار کرالے گا کہ میں احمق ہوں اور اس وقت قسم سے زیادہ اور کسی ذریعہ سے یقین نہیں دلا سکتا اگر اس سے زیادہ دلیل کوجی چاہے تجربہ کرلو کہ چھ مہینے کی محنت لو پھر محقق کا پتہ ہم سے پوچھو اس وقت دیکھ لوگے کہ یہ شخص آئے گا تو اپنے کو عاقل کہتا ہوا مگر جائے گا یہ کہتا ہوا کہ میں احمق ہوں نہیں بلکہ احمق تھا کیونکہ اب تو اس محقق کی برکت سے عقل آجاوے گی تب معلوم ہوگا کہ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ کا مدلول کیسا یقینی ہے کہ جو چیز شریعت کے مقابلہ میں ہے وہ جہل ہے میں جانتا کچھ بھی نہیں مگر جونپور کے ایک شاعر صاحب میرے یہاں آئے جو عرفی تہذیب سے آراستہ تھے میں تو ادنیٰ سے ادنیٰ سے ادنیٰ ہوں اسی طرح
دس بیس دفعہ ادنیٰ کی اضافت ادنیٰ کی طرف کی جائے بہرحال میں 11
کچھ بھی نہیں ہوں مگر چند روز رہنے کے بعد جب وہ واپس گئے تو وہاں جاکے انھوں نے ایک رسالہ لکھا اس میں یہ بھی لکھا تھا عمر بھر جسے ہم تہذیب سمجھا کئے وہاں جاکر یہ معلوم ہوا کہ وہ تہذیب ہی نہیں تھی خیر وہ تو مرگئے ایک اور دہلی کے طبیب بھی آئے چند روز یہاں رہنے سے وہ بھی یہ کہنے لگے کہ جن کو ہم اب تک کمالات سمجھتے تھے سارے نقائص نکلے اور جنھیں ہنر سمجھتے تھے وہ سب عیوب تھے تو اس وقت اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں اگر شبہ ہو تجربہ کرلیجئے اس لئے فرمایا اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ جاہلوں کا اتباع نہ کیجئے اور یہاں اتباع شریعت کے متعلق ایک نکتہ ہے جسے امام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے لکھا ہے کہ انسان کی سلامتی مقید رہنے میں ہے اور اطلاق مضر ہے کیونکہ اطمینان اور چین بدون تقیید

کے نہیں ہوتا مثلاً ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب بیمار ہوں گے ہم فلانے طبیب کا علاج کریں گے تو اطمینان ہے کہ طبیب موجود ہے بیماری کا خوف نہیں ہوگا اور نہ بیماری کے وقت سوچنا پڑے گا کہ کس کا علاج کریں اور اگر تقلید نہیں ہے مثلاً ہم کسی خاص طبیب کے پابند نہیں اگر آج ذرا سا تغیر پیش آیا ایک طبیب سے رجوع کیا دوسرا تغیر پیش آیا دوسرے سے رجوع کر لیا تیسرا پیش آیا تیسرے سے رجوع کر لیا تو اس میں دل کو چین نہیں ہوگا اور ہر وقت یہ فکر رہے گی کہ اب کی تغیر میں کس طبیب سے رجوع کریں گے غرض تقلید سے اطمینان حاصل ہوتا ہے چاہے وہ طبیب دانشمند بھی نہ ہو مگر تمہارے نفس کو تو اطمینان ہو جائے گا اور اگر وہ تقلید حقائق کے موافق ہو تو سبحان اللہ کیا کہنا ہے اگر شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونے کا بھی دعوے نہ ہوتا جیسا کہ مدلول ہے وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ د کا تب بھی اتباع شریعت کا امر حکیمانہ ہوتا اور اب تو جبکہ شریعت کا علم و حکمت کے موافق ہونا ثابت کر دیا گیا تو اس اتباع کا ضروری و مصلحت و موجب طمانیت ہونا اور بھی ثابت ہو گیا آگے وعید ہے اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا یہ لوگ خدا تعالیٰ کے مقابلہ میں آپ کے ذرا کام نہیں آسکتے یعنی گو یہ آج مددگار بننے کا دعوے کرتے مگر خدا تعالیٰ کے یہاں ذرا کام نہیں آسکتے اس پر اہل حق کو تردد ہو سکتا تھا کہ اتباع کے بعد ہم تو اکیلے رہ گئے اس لئے فرماتے ہیں وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ دوست ہے اہل تقویٰ کا اس سے تردد

رفع ہو گیا کہ اہل اہواء اگر ہم سے الگ ہو گئے تو کچھ پروا نہیں کیونکہ
خدا تعالیٰ تو ہمارے ساتھ ہے۔ آگے مقصود کی طرف رجوع کرتے
ہیں اور شریعت میں جو صفتیں ہیں انھیں بتاتے ہیں هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ
وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوقِنُوْنَ ○ قرآن یا شریعت عام لوگوں کے لئے
دانشمندیوں کا سبب اور ہدایت کا ذریعہ ہے اور یقین لانے والوں کے
لئے بڑی رحمت ہے لهٰذَا بَصَائِرُ بصائر جمع بصیرت کی ہے بصیرت
کہتے ہیں باطنی روشنی کو جیسے بصر کہتے ہیں نگاہ یعنی ظاہری روشنی
کو تو شریعت بصائر ہے یعنے باطن کو روشن کرنے والی ہے وھدی
اور سراپا ہدایت ہے کہ اس سے راستہ نظر آتا ہے اور مقصود
تک پہونچا دیتی ہے ورحمۃ اور رحمت ہے جو کہ مقصود ہے۔ گویا شریعت
تین چیزوں کا مجموعہ ہے یہاں پر ایک نکتہ ہے جو چند سال پہلے بھی
ذہن میں آیا تھا مگر اسے بھول گیا تھا اس وقت پھر یاد آ گیا ۱۴
وہ نکتہ یہ ہے کہ راہ رو کو انھیں تین چیزوں کی ضرورت ہے جب
آدمی مقصود تک جانا چاہتا ہے تو اس کے لئے ایک مقصود ہوتا
ہے اور ایک طریق ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے مقصود تک پہونچ
سکتے ہیں اور ایک بصر یعنے نگاہ ہوتی ہے جس کے ذریعہ سے راستہ
نظر آوے حق تعالیٰ کے قربان جایئے کہ شریعت کو بتلاتے ہیں کہ
یہ ایسا قانون ہے جو تینوں کو جمع کئے ہوتے ہے هٰذَا بَصَائِرُ یہ آنکھیں
بھی ہیں وھدی اور راستہ بھی اسی کے ذریعہ سے طے ہوتا ہے ورحمۃ
اور رحمت ہے یعنے مقصود بھی اسی سے حاصل ہوتا ہے سبحان اللہ
بصیرت طریق مقصود تینوں اسی ایک شریعت میں ہیں۔ اب رہا یہ کہ
بصائر کو جمع کیوں لائے اور ھدی ورحمۃ کو مفرد کیوں لائے اس
میں نکتہ یہ ہے راستہ چلنے والے تو بہت ہوتے ہیں اور سب

کی آنکھیں الگ الگ ہوتی ہیں اس لئے اِس کو جمع لائے اور راستہ ایک ہی ہوتا ہے اور مقصود بھی سب کا ایک ہی ہوتا ہے وہاں مفرد لائے۔ پھر آگے فرماتے ہیں یہ کہ رحمت تو ہے مگر ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ لقوم یوقنون یقین کرنے والوں کے لئے۔ یقین کے دو درجے ہیں ایک تقلیدی اور ایک تحقیقی۔ تقلیدی تو یہ کہ احکام کو بلا دلیل مان لو پھر اُن احکام کی برکت سے تحقیقی یقین ہو جائے گا جیسے شروع میں الف بے کو محض اُستاد کی تقلید سے مان لیتے ہو اس کے بعد اسی تقلید کی بدولت بڑے بڑے علوم کے محقق بن جاتے ہو اگر شروع ہی میں یہ پوچھا کہ اِس کی کیا دلیل ہے کہ یہ الف ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیشہ جاہل ہی رہو گے اِس لئے پہلے کسی محقق کی تقلید کرو پہلے ہی سے محقق بننے کی کوشش مت کرو ے

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی — تا راہ بیں نہ باشی کے راہ بر شوی ۱۴

(اے جاہل کوشش کرکے صاحب علم ہو جا۔ راستہ دیکھنے کی بجائے راستہ دکھلانے والا ہو جا)

اور طریقہ محقق بننے کا یہی ہے کہ پہلے تقلید کرو ے

در مکتب حقائق پیش ادیب عشق — ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

آج یہ چاہتے ہیں کہ پہلے ہی سے ابا جان بن جائیں ابھی ماں کا دودھ بھی نہیں چھوٹا مگر باوا بننے کا شوق ہے اجی پہلے باوا تو بن لو یعنی چارپائی کے پایہ کی برابر تو ہو لو پھر باوا بننا ابھی تو پسر ہو خوب پسر پسر کے سویا کرو جب بڑے ہو گے تب باوا بھی بن جاؤ گے۔ ہیں تو جاہل کندہ ناتراش مگر یہ ضرور پوچھیں گے کہ کیوں صاحب اس حکم میں کیا راز ہے اور اس کی کیا حکمت ہے میاں پہلے کام تو شروع کرو پھر خود معلوم ہو جائے گا۔ کوئی بادشاہ کے پاس جاتے ہی یہ کہنے لگے کہ میں آپ کے خزانہ کی پڑتال کروں گا ذرا کنجیاں

دے دیجئے تو وہاں سے ظاہر ہے کہ نکال دیا جائے گا اگر خزانہ دیکھنا ہے تو پہلے بادشاہ کی خدمت کرو ممکن ہے کہ وہ خوش ہو کے خود کہیں جاؤ اِسے ہمارے خزانے دکھلا لاؤ اِسی طرح یہ اسرار جو خزائن ربی ہیں یہ درخواست سے نہیں معلوم ہوتے بلکہ اطاعت سے حاصل ہوتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیا — بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بلا معین و اُستاد کے اور بغیر کتاب کے انبیائے کرام جیسے علوم حاصل ہوں گے)

جب وہ خوش ہوں گے تو وہ علوم عطا کریں گے جو نہ کتابوں سے حاصل ہوسکتے تھے نہ اُستادوں سے بہرحال یقین کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ تقلید سے یقین حاصل کیا جائے اور ایک یہ کہ تحقیق سے اور جو یقین ابتدا میں تقلید سے حاصل ہوگا وہ اِنتہا میں تحقیق ہوجائیگا

15 خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ ہم میں اتباعِ شریعت کی بیحد کمی ہے اس کا تدارک کرو اور جو کام کرو پہلے عالم شریعت سے تحقیق کرلو مگر تحقیق ایسے سے کرو جو سچی بات بتلاوے اور جو خود اپنی خواہش نفسانی کو شریعت کے اندر ٹھونسے اور زبردستی غیر دین کو مصالح اور پالیسی کی وجہ سے دین بنا دے وہ واقع میں عالم ہی نہیں وہ تو جاہل ہے اُس سے مت پوچھو ورنہ وہ اپنے ساتھ تمہیں بھی گمراہ کرے گا اگر کہو کہاں ہے جو سچی بات بتلاوے تو ڈھونڈو ڈھونڈھنے سے سب مل جاتا ہے طبیب کیسے مل جاتا ہے اِسی طرح سچا صاحبِ شریعت عالم بھی مل سکتا ہے بہرحال جو کام کرو پہلے استفتاء کرو اور جو عالم ہیں انھیں چاہیئے کہ قرآن و حدیث پر عمل کریں اور جو عامی ہیں وہ علماء سے دریافت کرکے عمل کریں خواہ اس میں دنیا کا نفع ہو یا نقصان جب ایسا کروگے تو پھر

چند روز میں دیکھو گے کہ خود بخود برکات ظاہر ہوں گے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مصالح کو چھوڑو اور شریعت پر عمل کرو اگر کوئی کہے کہ یہ خلاصہ تو پہلے ہی بیان ہو سکتا تھا اِس قدر تفصیل کی کیا ضرورت تھی تو بات یہ ہے کہ تفصیل سے بہت سی زائد باتیں بھی معلوم ہو گئیں اور مضمون کی دِل میں وقعت بھی بڑھ گئی ورنہ محض خلاصہ سے اِتنا دِل نشین نہ ہوتا بہر حال خدا تعالےٰ سے دُعا کیجئے کہ ہم سب کو اِتباعِ شریعت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

تمام شُد

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

وعظ

مسمّٰی بہ

الاستغفار

منجملہ ارشادات

حکیم الاُمّۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

مُحَمَّد عَبْدُ المَنَّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

۱۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وعظ المسمّٰی بہ

الاستغفار

اَینَ	مَتیٰ	کَم	کَیفَ	ماذا	من ینتفع	لِمَ	مَن ضَبَطَ	اَلمُستَمِعُون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید ہے	کیوں ہوا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد سہارن پور	۱۱ر صفر ۱۳۳۲ھ	ڈیڑھ گھنٹہ	بیٹھ کر	استغفار کی ضرورت	ہر طبقہ کو مفید ہے	سہارنپور اتفاقاً جانا ہوا لوگوں کی درخواست پر بیان ہوا	محمد عبداللہ عفی عنہ گنگوہی	۲۰۰	اہل علم کا کم اور عام لوگوں کا زیادہ مجمع تھا۔

۱۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْہِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْکُمْ مِّدْرَارًا وَّیَزِدْکُمْ قُوَّۃً اِلٰی قُوَّتِکُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ

(اے میری قوم تم اپنے گناہ (کفر و شرک وغیرہ) اپنے رب سے معاف کراؤ (یعنی ایمان لاؤ) پھر (ایمان لاکر) اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارش برساوے گا اور (ایمان و عمل کی برکت سے) تم کو اور قوت دیکر تمہاری (موجودہ) قوت میں ترقی کردیگا (پس ایمان لے آؤ) اور مجرم رہ کر (ایمان سے)

(اعراض مت کرو ۱۲) اِس آیت کریمہ کا مضمون ہود علیہ السّلام کا خطاب ہے اپنی قوم کو حق تعالیٰ نے اِس مقام پر اس کو نقل فرمایا ہے۔ اِس آیت کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہوئی کہ ہرچند کہ ہماری ہر حالت ایک سے ایک زیادہ ایسی ہی ضروری ہے کہ اُس کے متعلق بیان کیا جاوے تاہم بعض حالت کا اِقتضاء یہ ہوتا ہے کہ اس کے اشتراک اور عموم کی وجہ سے مناسب سمجھا جاتا ہے کہ اس کے متعلق اہم سمجھ کر بیان کیا جاوے اس وقت مُسلمانوں کی یہ حالت دیکھ کر کہ کم و بیش سب پریشانی میں مبتلا ہیں مناسب معلوم ہوا کہ اِس مضمون کو اختیار کیا جاوے کہ اس میں معالجہ ہے تمام پریشانیوں کا ترجمہ سے معلوم ہوگا کہ وہ کیا مضمون ہے اور نیز معلوم ہو جائے گا کہ اِس کی ضرورت ہے۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السّلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں یَاقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ الخ (اے میری قوم اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو الخ) یہاں پر شبہ نہ ۱۵
کیا جاوے کہ ہم لوگ تو اُمّتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ہم کو ہود علیہ السّلام کا ارشاد سُنانے سے کیا فائدہ اِس لئے کہ یہ مسلّم ہے کہ اُمم سابقہ کے احکام بلا انکار اگر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہم کو سناویں تو وہ ہمارے لئے بھی حجّت ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ اُصول یعنی عقائد اور اخلاق حمیدہ کے مامور بہ ہونے میں سب انبیاء کا ایک مشرب ہے اِس میں کسی نبی کا اختلاف نہیں مثلاً توحید رسالت کا اِعتقاد ظلم کا بُرا ہونا، عدل کا مستحسن ہونا، سچ بولنا یہ بالاتفاق مسلّم ہیں اِسی فہرست میں سے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگنا بھی ہے جس کا اِس آیت میں بیان ہے پس جبکہ اللہ تعالیٰ نے اِس ارشاد کی نقل کے بعد اِنکار نہیں فرمایا اور نیز یہ ان اعمال سے ہے کہ جن کا مامور بہ ہونا تمام شرائع میں یکساں رہا ہے تو لامحالہ ہم بھی اِس کے ضرور

مخاطب ہوں گے۔ رہی یہ بات کہ اگر اس مضمون کو بیان ہی کرنا تھا تو
حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا کوئی ارشاد نقل کر دیا جاتا حضرت ہود علیہ السلام
کا ارشاد کیوں نقل کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام
کا ارشاد نقل کرنے میں ایک خاص مصلحت ہے وہ یہ کہ آپ صاحبوں
کو معلوم ہو جاوے کہ یہ مضمون بہت ہی اہتمام کے قابل ہے اس لئے
کہ قوم عاد بہت پرانی قوم ہے پس جبکہ وہ بھی اس مضمون کے مخاطب
ہیں تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ بات کوئی نئی نہیں ہے بلکہ یہ وہ بات
ہے کہ ہمیشہ سے انبیاء اپنی اپنی قوم کو کہتے آئے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام
اپنی قوم کو ارشاد فرماتے ہیں اے میری قوم اپنے رب سے مغفرت
مانگو پھر اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ خلاصہ ارشاد کا اصلاح کے دو
درجے ہیں اول اپنے گناہ معاف کرانا اس کے بعد خدا تعالیٰ کی
طرف طاعت کے ساتھ متوجہ ہونا اس پر کیا ثمرہ مرتب ہوگا یُرْسِلِ السَّمَآءَ
یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ کا ثمرہ دنیا میں تم کو یہ ملے گا کہ اللہ تعالیٰ
تم پر بارش بھیجیں گے اور تمہاری قوت موجودہ کے اندر اور قوت
بڑھاویں گے قوم عاد قوت کے اندر مشہور ہیں آگے ارشاد ہے
اور خدا تعالیٰ کے حکم سے روگردانی مت کرو جرم کرتے ہوئے۔ یہ
آیۃ کا ترجمہ ہوا ترجمہ سے مضمون کی اجمالی تعیین ہو گئی ہو گی کہ اس
کے دو جز ہیں اوّل مغفرت مانگنا دوسرے طاعت کی طرف رجوع کرنا
خلاصہ حاصل یہ ہے کہ آیۃ میں دو مامور بہ ہیں استغفار اور رجوع الی الطاعۃ
اور دو اس کے ثمرے ہیں بارش ہونا اور قوت بڑھ جانا اور کمزوری
اور ضعف کا جاتا رہنا اور ایک منہی عنہ ہے وہ مجرم ہو کر اعراض کرنا
ہے۔ ہود علیہ السلام نے جو اس میں فرمایا باعتبار مقصود ایراد کے
یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کا ہم کو ارشاد ہے گویا اللہ تعالیٰ ہم کو

خلاصہ آیۃ یقوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ
۲۰

ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر تم کو کسی قسم کی شکایت قحط کی یا کمزوری یا ادبار یا تنزل کی ہو تو اس کی تدبیر اور اس کا علاج وہ ہے جو ہم نے بتلایا ہے اور وہ نہیں ہے جو تم نے اختیار کیا ہے یہ حاصل ہے اس مقام کا ترجمہ سے مضمون کی تعیین اور حاصل سے اس کی ضرورت کا علم ہو گیا ہوگا کہ اس مضمون کی کیا ضرورت ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو عموماً دیکھا جاتا ہے کہ پریشان ہیں اور یوں تو ہر شخص کو خاص خاص پریشانیاں ہیں مگر ایک عام پریشانی اور مشترک و مدید شکایت تو تنزل اور پستی کی ہے کہ یہ پرانی شکایت ہے دوسری جدید پریشانی قحط اور قلتِ باراں کی ہے یہ دو پریشانیاں اس وقت ہم سب کو عام ہیں اس لئے ان کا انتظام ضروری ہے کیونکہ انسان کو جو مصیبت لاحق ہوتی ہے عقل اس کو مقتضی ہے کہ اس کی تدبیر کری اور تدبیر بھی وہ جو صحیح تدبیر ہے ہمارے بھائیوں کی یہ حالت ہے کہ بعضے تو ان میں سے ایسے جواں مرد ہیں کہ تدبیر کی پرواہ ہی نہیں کرتے اور بعضے جو کچھ کرتے بھی ہیں وہ الٹی تدبیر کرتے ہیں پس یہ کہنا صحیح ہے کہ بالکل تدبیر کرتے ہی نہیں چنانچہ بعضے تو صرف یہ کرتے ہیں کہ بس شکایت کرتے ہیں کوئی تو کہتا ہے کہ امسال ایسی خشکی ہوئی ہے کہ مویشیوں کو چارہ تک نہیں ملتا ہے بھوکے مر رہے ہیں کوئی کہتا ہے اس فصل میں بارش نہ ہوئی تو گرانی بہت زیادہ ہو جائے گی جو ذرا دیندار ہیں وہ کہتے ہیں کہ میاں یہ سب ہماری شامتِ اعمال ہے مگر اصلاح وہ بھی نہیں کرتے جو اصطلاح جدید ذرا مہذب ہیں وہ ترقی و تنزل پر لیکچر دیتے ہیں کوئی بیماری کی شکایت کرتا ہے میرے پاس بھی خطوط آتے ہیں کہ بعض جگہ بیماری شروع ہو گئی ہے کوئی کہتا ہے کہ خیر بھائی ہمارے یہاں تو امن ہے تو گویا بالکل بیفکر ہی ہو گئے یہ اور

استغفار کے مضمون کی ضرورت

۲۱

[illegible]

بھی غضب ہے یاد رکھو کہ جیسے تمہارے یہاں بیماری ہونا اندیشہ ناک ہے اسی طرح تمہارے آس پاس ہونا یہ بھی خوفناک ہے اللہ تعالیٰ نے کفار کو ان دونوں سے خوف دلایا ہے چنانچہ ارشاد ہے وَلَا يَزَالُ الَّذِينَ كَفَرُوا تُصِيبُهُم بِمَا صَنَعُوا قَارِعَةٌ أَوْ تَحُلُّ قَرِيبًا مِّن دَارِهِمْ (اور یہ مکہ کے) کافر تو ہمیشہ (آئے دن) اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کرداروں کے سبب ان پر کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے) پس ہمارے شہر میں بیماری کا جیسے خوفناک ہے اسی طرح ہمارے ضلع میں ہونا یا ہماری کمشنری میں ہونا یا ہمارے ملک میں ہونا بھی خطرناک اور فکر کی بات ہے غرض دو شکایتیں اس وقت غالب ہیں ایک بیماری و قحط وغیرہ کی اور دوسری قوم کے ذلیل اور روز بروز کمزور ہوتے جانے کی اور باقی خاص خاص شکایتیں یا خاص خاص بیماریوں کی شکایتیں وہ تو معمولی طور پر رہتی ہی ہیں مگر اس وقت غالب اور مشترک آفات کے متعلق عرض کرتا ہوں اور مجکو اس میں دو جماعتوں کی شکایت ہے اوّل شکایت تو ۲۲
عام لوگوں کی ہے اور دوسری مہذب لوگوں کی ہے جو کہ بیدار مغز کہلاتے ہیں سو میں نے کہتا ہوں کہ یہ پریشانیاں سب صحیح اور واقعی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی کوئی تدبیر بھی ہے یا نہیں اور اگر ہے تو میں مطلق تدبیر کے متعلق پوچھتا ہوں کہ کس چیز کی ارجح و انفع تدبیر کونسی ہوتی ہے آیا وہ تدبیر جو عقلا محض استدلال سے تجویز کریں یا وہ جو کوئی تجربہ کار بعد تجربہ کے تجویز کرے سو بڑا فرق ہے عاقل کی تجویز اور تجربہ کار کی تجویز میں چنانچہ مثل ہے سَلِ الْمُجَرِّبَ وَلَا تَسْئَلِ الْحَكِيمَ (تجربہ کار سے دریافت کرو عاقل سے مت پوچھو) عاقل کی تجویز تو محض تخمینی رائے کی طرف مستند ہوتی ہے اور تجربہ کار کی تجویز تکرار مشاہدہ سے ناشی ہوتی ہے اور ثانی کی ترجیح اوّل پر ظاہر ہے پس جبکہ تجربہ کار کا علم

بلاؤں میں تدبیر کی تحقیق

حالانکہ وہ بھی استدلالی ہے حکیم کے علم پر ترجیح دیا جاتا ہو تو عالم الغیب والشہادۃ کا علم کیوں تسلیم نہیں کیا جاتا اور اس سوال کے جواب میں یوں کیوں نہیں کہا جاتا کہ حق تعالےٰ سے اس کی تدبیر پوچھو خاص سرکار جو عالم اور حکیم سب کچھ ہیں اگر کسی مرض کا نسخہ عطا فرما دیں تو کیوں اس کو استعمال نہیں کیا جاتا اس دوا سے بڑھ کر اور کون سی دوا ہوگی جو مرض اور دوا کے خالق سے عطا ہو عقلاء، اور اہل الرائے تو محض تخمین اور رائے اور قیاس ہی سے کہتے ہیں کہ اس مرض کی یہ دوا ہے مثلاً طاعون ہی ہے اس کی دوائیں اور تدبیریں محض ظنی ہیں ان کی نافعیت کا اور ان کے استعمال کرنے کا مخالف نہیں ہوں یہ اطباء کی ہی عادت ہے کہ جس طبیب کا علاج کرو دوسرا نسخہ پینا اس کے نزدیک جائز نہیں اور حق تعالےٰ کو یہ حق بدرجہ اولیٰ حاصل تھا کہ وہ یہ فرما دیتے کہ جو ہم نے دوا اور تدبیر بتلائی ہے اس کو ہی استعمال کرو خصوصاً اس صورۃ میں جبکہ تدبیر صحیح کا انحصار بھی اُسی میں ہے لیکن ان کی یہ رحمت ہے کہ اور تدبیروں کو بھی ناجائز قرار نہیں دیا اس لئے میں تدبیر ظنیہ ۲۳
مجوزۂ عقلاء، کا مخالف نہیں بلکہ میرا مطلب یہ ہے کہ صرف تدابیر ظاہری اور طب کے ایسے پیچھے کیوں پڑے ہو کہ صحیح تدبیر اور سچی طب کو بالکل ہی بھول گئے ؎

چند خوانی حکمتِ یونانیاں — حکمت ایمانیاں راہم بداں
صحت ایں حس بجوئید از طبیب — صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں حس ز معموری تن — صحت آں حس ز تخریب بدن

(یونانی حکمت کی کتابیں کب تک پڑھتے رہو گے کچھ دن حکمتِ ایمانی یعنی معرفت کی تو پڑھو ۔ حسِ جسمانی کو درست کرنا چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور اگر حس روحانی کو ترقی منظور ہو تو مرشدِ کامل سے رجوع کرو ۔ حسِ جسمانی سے تو بدن کی

درستی ہوتی ہے اور حسن روحانی کی صحت بدن کی تخریب سے ہوتی ہے۔)

پس جو طب حکیم حقیقی نے ارشاد فرمائی ہے بالکل کافی ہے لیکن باوجود اس کے یہ بھی اجازت دیدی ہے کہ اور نسخہ بھی پیو تو حرج نہیں بلکہ ترغیب دی ہے تَدَاوَوْا عِبَادَ اللّٰہِ (اللہ کے بندوں سے علاج کراؤ) جس کی حقیقت اہل اللہ و مُربّیانِ قلب نے سمجھی چنانچہ انھوں نے ترکِ اسباب کو علی الاطلاق جائز نہیں رکھا یہاں سے وہ شبہ بھی رفع ہوگیا جو کہ بہت لوگ ناتمام باتیں سُنکر کہدیا کرتے ہیں کہ یہ مولوی تو چاہتے ہیں کہ دنیا کے کاروبار ترک کرکے مسجد کے کونہ میں تسبیح لیکر بیٹھ جاویں حاشا و کلا مولویوں کا یہ مقصود ہرگز نہیں بلکہ تم اگر ایسا کرو بھی تو وہ تم کو روک دیں کیونکہ آدمی بالطبع اسباب ظاہرہ کا خوگر بنایا گیا ہے پس اگر اسباب کو ترک کریگا تو اس کی جمعیت و سکون میں ضرور فرق پڑے گا اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک طبیب کامل ہے اُس کو مریض کے حال پر بہت عنایت اور شفقت ہے اس نے مریض کو نسخہ لکھ کر دیا لیکن وہ طبیب یہ بھی جانتا ہو کہ اس مریض کو ضعف اور توہم کی وجہ سے اس پر قناعت نہ ہوگی اور اسکو خیال رہے گا کہ فلاں دوا اگر پیتا تو جلدی کامیاب ہوجاتا اور یہ اس کی دُھن اور اُدھیڑبن ممکن ہے کہ اِس حد تک ہو کہ اصلی دوا سے بھی اعراض کرے اِس لئے وہ براہ عنایت اس کی تسلّی کے واسطے کہدیتا ہو کہ دوا تو اس مرض کی یہی ہے جو ہم نے بتلائی ہے لیکن اگر تم کوئی اور دوا بھی پیو تو تم کو اختیار ہے تو اس مریض کو اگرچہ شفا اور صحت تو اسی ماقاعدہ اور صحیح نسخہ سے ہوگی اور مریض خواہ کچھ سمجھے لیکن طبیب کو چونکہ شفقت اور محبت ہے وہ اپنا نام بھی کرنا نہیں چاہتا۔ اس کا مقصود تو یہ ہے کہ اس کو صحت ہوجائے۔ وہی مثل ہے کہ کام تو کسی کا اور نام کسی کا ہے

ترکِ اسباب علی الاطلاق جائز نہیں

۲۴

کارِ زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں   مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی تیری زلفوں کا کام ہے لیکن مصلحتاً عشاق نے چین کے ہرنوں پر الزام لگا دیا ہے)

پس اسی طرح حق تعالےٰ کا مقصود یہ ہے کہ ہمارے بندے کسی طرح اچھے ہوجائیں چاہے وہ حکیم جی ہی کا نام کردیں اور ان کو پریشانی نہو پس یہ وجہ ہے کہ ترک اسباب کو منع کردیا ورنہ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (اور کوئی (روزی کھانے والا) جاندار روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو) کا مقتضی تو یہ تھا کہ سب اسباب ترک کردیتے اور تجارت زراعت نوکری صنعت یک لخت چھوڑ دیتے ہاں اقویا کو اجازت دی ہے کہ اگر تم ترک اسباب کرو تو جائز ہے اس لئے کہ انکو ترک اسباب سے اپنی قوت توکل کی وجہ سے پریشانی لاحق نہ ہوگی باقی ضعفاء کو یہی حکم ہے کہ تدبیر کرو ایک صحابی کا قصہ ہے کہ ان سے تخلف تبوک لغزش ہوگئی تھی پھر اللہ تعالےٰ نے ان کی توبہ قبول فرمائی انھوں نے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ اللہ تعالےٰ نے میری توبہ قبول فرمائی ہے اس کے شکریہ میں میں چاہتا ہوں کہ اپنا سب مال تصدق کردوں فرمایا نہیں سب مت دو کچھ رکھ لو اس قصہ سے اور نیز شریعت کے ہر ہر حکم سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ شریعت نے جذبات طبعیہ کی بڑی رعایت کی ہے اور اسلام کے سب احکام فطرتِ سلیمہ کے موافق ہیں حضرت حاجی صاحبؒ سے ایک بی بی نے عرض کیا کہ میں اپنی جائداد وقف کرنا چاہتی ہوں حضرت نے فرمایا کہ نہیں نہیں ایسا نہ کرو کچھ رکھ لو نفس کو کبھی پریشانی ہوجایا کرتی ہے پھر وہ پریشانی دین تک مقتضی ہوتی ہے حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ وہ زمانہ گیا کہ درہم و دینار رکھنا تقویٰ و توکل کے خلاف تھا اب تو اگر کسی کے

پاس کچھ مال ہو تو اس کو حفاظت سے رکھنا چاہیئے کہ ہمت انسان جب مفلس ہوتا ہے تو اوّل اس کا دین ہی برباد ہوتا ہے بعض بزرگوں نے رزق ملنے کی عجیب طریقہ سے دُعا ہیں مانگی ہیں چنانچہ ایک بزرگ نے دُعا کی تھی کہ اے اللہ جو کچھ میری قسمت میں لکھا ہے ایک دم سے دیدو ارشاد ہوا کہ کیا ہم پر اطمینان نہیں عرض کیا کہ اطمینان کیوں نہیں شیطان مجھ کو بہکاتا ہے اور کہتا ہے کہ کہاں سے کھائے گا میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ دیگا وہ کہتا ہے کہ یہ تو یقینی ہے کہ دیگا مگر یہ تو خبر نہیں کہ کب دیگا اِس سے میں پریشان ہوتا ہوں آپ مجکو اگر ایک دم سے دیدیں گے تو میں کوٹھری میں بند کر کے رکھ لوں گا جب شیطان کہیگا کہ کہاں سے کھائے گا میں کہہ دوں گا کہ اِس کوٹھری میں سے کھاؤں گا وہ اس میں کوئی شبہ نہ ڈال سکے گا اور پریشان نہ کر سکے گا یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سلوک میں خاص کیفیت مثلاً باوجود مال نہ ہونے کے پریشانی نہو سو یہ مطلوب نہیں اگر مال رکھ کر جمعیت اور تسلّی ہو تو رکھے اور اگر خرچ کر کے اِطمینان حاصل ہو تو خرچ کر دے بعض طبیعتیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان کی مِلک میں بہت سی چیزیں ہوں تو ان کا دل گھبراتا ہے بہرحال اس باب میں سے دوا دارو کی بھی اجازت ہے لیکن دوا کو موثر بالذات نہ سمجھے کہ بغیر اس کے شفا ہی نہ ہوگی بہت لوگ ہم نے دیکھے ہیں کہ دوا بالکل نہیں کرتے ہیں جلال آباد کے ایک رئیس نے کئے حکیم کو بلاتے گاڑی بھیجتے فیس دیتے اور حکیم جی سے کہتے کہ آپ بلا تامل جتنے کا چاہیں نسخہ لکھئے دس کا بیس کا پچاس کا چنانچہ حکیم جی نسخہ لِکھ دیتے ملازم کو دیتے کہ جاؤ بھائی دکھلاؤ عطار کو کتنے کا ہے عطار کہتا کہ پچیس روپیہ کا ہے کہتے لاؤ صندوقچی سے پچیس روپیہ گن کر دیتے کہ جاؤ خیرات کر دو مساکین کو میری یہی دوا ہی چنانچہ جب یہ

ایک بزرگ کا واقعہ

کیفیت مطلوب بالذات نہیں

۲۶

دوا دارو نہ کرنے والوں کے واقعے

عمل کرتے فوراً اچھے ہوجاتے ہمارے ایک دوست ہیں وہ کبھی دوا نہیں کرتے اِس مرتبہ وہ سخت بیمار ہوئے ہر چند ان کو سمجھایا گیا کہ علاج کرو مگر ایک نہ سُنی آخر لوٹ پوٹ چند روز کے بعد اچھے خاصے ہوگئے معلوم ہوا کہ تدبیر حقیقی پر کفایت کرنا بالکل کافی ہے اگر کوئی کہے کہ اگر تدبیر حقیقی یہی ہے تو کیا وجہ ہے کہ بعضے لوگ نری دوا سے اچھے ہوجاتے ہیں صاحبو! تم سمجھتے ہو کہ وہ اچھے ہوگئے وہ اچھے نہیں ہیں ایک بخار تو چلا گیا اس کو ایک بخار اور ہے جو اس کے لئے روح فرسا بن رہا ہو جس کا انجام ہلاک جسمانی ہی نہیں بلکہ ہلاک ابدی ہے۔ اصلی تدبیر طاعت ہی ہے اُس کے ہوتے ہوئے دوا کی اجازت ہے پس جمع کرنا جائز اور نری طبعی تدبیر پر اکتفا کرنا ناجائز۔ ہم لوگ اسی میں مبتلا ہیں کہ اور تدابیر سب کرتے ہیں اور اصل تدبیر سے غافل ہیں سو طاعون کی تدبیر میں
صفائی مکانات کی اور فنائل ہی کافی نہیں ہے بلکہ دوسری صفائی ۲۷
بھی ضروری ہے اور یہ دوسری صفائی وہ نہیں جو بعضے بدمذاق لوگ سمجھتے ہیں یعنی وہ تعویذوں کو کافی سمجھتے ہیں کہ تعویذ دروازہ پر چسپاں کردو طاعون تعویذ سے ڈر کر بھاگ جائے گا یہ ان سے بڑھ کر ہیں جو دوا پر اکتفا کرتے ہیں کیونکہ دوا کا کھانا اور استعمال کرنا بیماری زائل ہوجانے کی طبعی تدبیر تو ہے لیکن تعویذ کا چسپاں کرنا طاعون کے بھاگ جانے کے لئے تو اُس درجہ کی طبعی تدبیر بھی نہیں اور نہ باطنی و حقیقی جیسا کہ اصلاح حالت تدبیر حقیقی ہے پس اس پر اتنا اعتقاد رکھنا بہت ہی عجیب ہے جتنا وہ لوگ رکھتے ہیں جو کہ تعویذوں کے معتقد ہیں یعنی ان کو شک ہی نہیں ہوتا گویا ایک پٹہ لکھوا لیا ہے صاحبو! طاعون تو جب بھاگے جبکہ باہر سے آتا ہو طاعون تو گھر کے اندر موجود ہے باہر تعویذ لگانے سے کیا ہوتا ہے وہ طاعون کیا ہے معصیت

کیونکہ طاعون ہو یا کوئی اور مصیبت ہو اس کا اصلی سبب تو معصیت ہے پس جب معصیت بحالہ رہے تو دشمن تو تمہارے گھر کے اندر ہے باہر کے انتظام سے کیا ہوتا ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

در بہ بست و دشمن اندر خانہ بود   حیلۂ فرعون زیں افسانہ بود

(دروازہ بند کرلیا لیکن دشمن گھر کے اندر تھا۔ فرعون کا حیسلہ محض افسانہ تھا۔)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ فرعون نے اپنے دشمن کو یعنی موسیٰ علیہ السلام کو گھر کے اندر رکھا اور ان کو پرورش کیا اور دشمنوں کا انتظام کرتا تھا صاحبو! لوگ باوجود اصلاح نہ کرنے کے جو تدبیر کر رہے یہ فرعونی تدبیر ہے کہ خدا تعالیٰ کی نافرنی جو اصلی سبب ہے پریشانیوں کا اس کو چھوڑتے نہیں اور بالائی تدبیریں کرتے ہیں یاد رکھو جب تک کہ مرض کے اصلی سبب کا استیصال نہ کیا جاوے مرض نہ
۲۸ جائے گا پس جب تک کہ معصیت نہ چھوڑیں گے ان بلاؤں سے خلاصی نہیں ہوسکتی سو اس سبب کی طرف کسی کو التفات تک بھی نہیں آپ ہی بتلایئے فیصدی کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اس کا احساس ہو اور وہ تدبیر کرتے ہوں ہاں ظاہری تدبیریں کرتے ہیں لیکن اصلی تدبیر سے غفلت ہے اور بعضے کوئی تدبیر بھی نہیں کرتے دیکھئے آجکل بارش کی کمی ہے بتلایئے اس کے لئے کیا تدبیر کی ہے طاعون میں تو خیر کچھ کرتے بھی ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تدبیر کو منحصر سمجھ لیا ہے اپنی وہمی اور ظنی تدبیروں اور اسباب میں اور طاعون کے کچھ ظاہری علاج بھی ہیں اس لئے اس کی تدبیر تو کرلی اور بارش برسنے کا کوئی طریقہ کسی کو یاد نہیں اس لئے اس سے عاجز ہیں بڑے بڑے مدبر اور عقلاء موجود ہیں لیکن کسی کی قدرت میں یہ بات نہیں کہ واقعی بارش برسادیں باقی ایک گندی بارش ایک تدبیر سے بھی ہوچکی ہے اس کی نفی نہیں کرتا چنانچہ

مصیبت کا اصلی علاج ترک معصیت ہے

امساکِ باراں کے ازالہ کی تدبیر نہیں کرتا

ایک حکایت میں نے ایک کتاب میں دیکھی ہے کہ فرعون خدائی کا
دعویٰ کیا کرتا تھا ایک سال بارش نہ ہوئی قحط ہو گیا لوگوں نے آکر
شکایت کی کہ ہم لوگ قحط میں ہلاک ہو رہے ہیں تم کیسے خدا ہو بارش
کیوں نہیں برساتے فرعون نے شیطان سے کو کسی وقت اس سے
دوستی ہو گئی تھی یہ سب قصہ کہا شیطان نے وعدہ کیا کہ کل بارش
ہو گی چنانچہ اس نے سب شیطانوں کو جمع کر کے کہا کہ سب اوپر جاکر
موتو چنانچہ بارش تو ہوئی لیکن بدبو کے مارے دماغ پھٹے پڑتے تھے
فرعون نے پوچھا کہ یہ کیسی بارش شیطان نے کہا کہ احمق ہوا ہے جیسا
تو خدائے باطل ہے ویسی ہی تیری بارش ہے اور جیسے وہ خدائے حقیقی
ہیں اسی طرح کی ان کی بارش ہے اور یہ جو حدیثوں میں آیا ہے کہ دجال
جہاں چاہے گا بارش ہو جاوے گی تو یاد رکھو کہ اس سے بارش کا اس کے
۲۹ قبضہ میں ہونا لازم نہیں آتا یہ استدراج ہے اس کے چاہنے پر ابتلاءً
اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہو گی اس کے معتقد سمجھیں گے کہ اس نے بارش
کی ہے لیکن یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اس میں تو تلبیس ہو جاویگی جواب
یہ ہے کہ یہ دھوکہ کی بات نہیں ہے اس لئے کہ اس کے ماتھے پر کافر لکھا
ہوگا کہ جس کو پڑھا اَن پڑھا سب پڑھ لیں گے اور دوسرے یہ کہ وہ
کانا ہوگا اور حق تعالیٰ سب عیوب سے پاک ہیں لیکن باوجود اس کے
بھی بعضے لوگ گمراہ ہو جاویں گے اور ان دونوں علامتوں کی تاویلیں
کرلیں گے میرے ایک استاد بیان فرماتے تھے کہ ایک مقام پر ایک
اندھے نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا ساٹھ ستّر آدمی اس کے ساتھ ہو گئے
ایک طالب علم نے اس سے کہا کہ اگر تم خدا ہو تو اپنی آنکھیں کیوں اچھی
نہیں کرلیتے کہنے لگا کہ ہم اپنے بندوں کا (نعوذ باللہ) امتحان کرتے
ہیں کہ دیکھیں کون ہماری تصدیق کرتا ہے اور تکذیب کرتا ہے غرضکہ

آنکھ پھوٹی ہوئی اور ماتھے پر کافر لکھا ہوا اس سے زیادہ اور کیا دلیل اس کے بطلان کی ہوگی یہ تو ایک موٹی بات ہے دوسرے ایک باریک بات اس کے بطلان کے شناخت کی حدیث میں آئی ہے وہ یہ کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس ظاہر بینائی سے اس کو دنیا میں دیکھوگے اور حق تعالےٰ کو دنیا میں ان آنکھوں سے کوئی دیکھ نہیں سکتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ خدا نہ ہوگا۔ ان دلائل کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بگڑے تو بگڑے بہرحال بارش کے متعلق کوئی تدبیر بھی نہیں کرتے اور البتہ خالی شکایتیں کیا کرتے ہیں میاں کتنے دن ہوگئے بارش نہیں ہوئی قحط ہوگیا میں کہتا ہوں کہ اس کہنے سے کیا مقصود ہے کس کو سناتے ہو کیا یہ اللہ میاں پر اعتراض ہے یا اللہ میاں کو یا کسی آدمی کو صرف سنا رہے ہو آدمیوں کو سنانا تو ظاہر ہے کہ مقصود نہیں اس لئے کہ آدمی کچھ کر ہی نہیں ۳۰
سکتے اور اللہ تعالیٰ کو بھی صرف سنانا اور خبر دینا ہرگز مقصود نہیں اس لئے کہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے اب یہی شق رہی کہ یہ اعتراض ہے اور گویا مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ امر خلاف حکمت ہے ایسا نہ کرنا چاہئے تو دیکھ لیجئے کہ حق تعالےٰ پر اعتراض کرنا کیا ہوتا ہی اگر قصداً ہی یہ اعتراض ہوتا تو میں اس کو کفر کہتا لیکن اب کہ قصد نہیں ہے سخت بے ادبی اور گستاخی ضرور کہوں گا مجھے تو واللہ ان کلمات سے سخت وحشت ہوتی ہے ہاں اگر اس جملہ خبریہ سے یہ مقصود ہو کہ دعا کرو کہ بارش ہو تو دوسری بات ہے لیکن قرائن حالیہ سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی مقصود نہیں اگر کہو کہ ہمارا تو کچھ بھی مقصود نہیں ہوتا یوں ہی ہانک دیتے ہیں تو اس صورت میں یہ لغو ہوا اور لغو سے بھی احتراز کرنا چاہئے حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهٗ مَا لَا يَعْنِيْهِ

بارش نہ ہونے اور دیگر مصائب عامہ کے متعلق لوگوں کے کلمات اور ان کا شرعی حکم ہونا۔

(آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ لایعنی اور بے فائدہ باتوں کو چھوڑ دے) غرض ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ فضول اور لغو میں تو مشغول ہیں اور جو اصلی اور صحیح تدبیر ہے اس سے غفلت ہے اور وہ تدبیر وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں مذکور ہے یعنی استغفار اور رجوع الی اللہ (اللہ تعالےٰ کی طرف متوجہ ہونا) اگر کوئی شبہ کرے کہ یہ تدبیر بھی کی جاتی ہے چنانچہ دعائیں کرتے ہیں گناہوں سے توبہ کرتے ہیں مگر اس سے بھی کچھ نہیں ہوا تو صاحبو! جواب یہ ہے کہ خود آپ دیکھتے ہیں کہ یہ تدبیر کرنے والے بہت ہی کم ہیں تو یہ کیا تدبیر ہوئی کہ ایک نے تو تدبیر کی اور زیادہ اس کی ضد اور خلاف کریں یعنی ایسے اعمال کریں کہ اُلٹا اثر ہو اور اثر غالب ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے جو زیادہ ہوں چنانچہ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا اَنَهْلِكُ وَفِيْنَا الصّٰلِحُوْنَ (کیا ہلاک کر دئے جائیں گے حالانکہ ہمارے درمیان نیک
۳۱ آدمی بھی ہیں) تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا نعم اذا کثر الخبث پس جب زیادہ سوء تدبیر کے مرتکب ہیں تو باوجود بعض قلیل کے تدبیر کرنے کے مصائب کا نزول کیا محل شبہ رہا باقی یہ بات کہ ان صلحاء پر تو وہ مصیبت نہ آنا چاہئے سو بعض حکمتوں سے عادۃ اللہ یہ ہے کہ اس حالت میں دنیا میں جو مصیبت آتی ہے اس میں سب ہی شریک ہوتے ہیں ہاں آخرت میں اپنے اپنے اعمال کے موافق محشور ہوں گے اور دنیا میں بھی وہ شرکت ظاہری ہی ہوتی ہے ورنہ صلحاء کے حق میں وہ مصیبت ظاہری حقیقت میں رحمت ہی ہوتی ہے سو بعض صلحاء کے اعتبار سے تو یہ جواب ہے اور بعض صلحاء کے اعتبار سے دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ اس زمانہ کے بعض صلحاء بھی منکرات کو دیکھتے دیکھتے مداہن ہوگئے ہیں اب جو لوگ علماء اور اتقیاء اور صلحاء کہلاتے ہیں باستثنائے خواص اہل اللہ کے اکثر کی کیفیت یہ ہے کہ نافرمانی

کرنے والوں سے ان کو انقباض نہیں ہوتا بے تکلف میل جول کھانا پینا
شادی بیاہ مرنے جینے میں شرکت اہل معصیت کی کرتے ہیں میں نے سنا
ہے کہ یہاں لوگ کوکین بہت کھاتے ہیں مگر کوئی ایک ہی شخص بتلا
دیجئے کہ اُس نے اپنے کسی عزیز کو صرف اِس وجہ سے چھوڑ دیا ہو کر وہ
کوکین کھاتا ہے برابر ملتے جلتے ہیں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی اسی
طرح ہر معصیت کو سمجھ لیجئے۔ حدیث شریف میں امم سابقہ کے قصوں
میں ایک قصہ وارد ہوا کہ جبرئیل کو ایک گاؤں کی نسبت حکم فرمایا کہ
اس کو اُلٹ دو۔ عرض کیا کہ اے اللہ فِيهَا فُلَانٌ لَمْ يَعْصِ قَطُّ یعنی اس
میں فلاں شخص ہے کہ اس نے کبھی گناہ نہیں کیا۔ حکم ہوا کہ مع اس کے
اُلٹ دو فَاِنَّهٗ لَمْ يَتَمَعَّرْ وَجْهُهٗ فِيَّ قَطُّ یعنی وہ ہماری نافرمانی دیکھتا تھا
اور کبھی اس کے چہرے پر تغیر تک نہیں ہوا۔ دیکھو جو شخص باغیوں سے
ملتا ہے وہ بھی باغی ہی شمار ہوتا ہے۔ ایام غدر میں جس نے باغیوں کو پناہ ۳۲
دی سرکار کے نزدیک وہ بھی مجرم شمار ہوا جب کہ ہم وفادار ہوں گے
تو یہ وفاداری کی بات نہیں ہے کہ اس کے دشمنوں سے ملیں۔ پس اگر
صلحاء کہیں ہیں بھی وہ بہت تھوڑے ہیں۔ زیادہ تعداد تو ایسے ہی
لوگوں کی ہے جو نافرمانی میں مبتلا ہیں۔ ہاں کوئی یہ ثابت کرے کہ بستی
کی بستی صالح ہو اور پھر وہاں بلائیں اور امراض اور قحط ہو سو یہ
بہت مشکل ہے صلاحیت اور تقویٰ تو بڑی چیز ہے اُس کا تو اثر ہی
دوسرا ہے برائے نام ہی کوئی تھوڑی دیر کے لئے حق تعالیٰ کی طرف
رجوع ہو کر دیکھ لے کہ کیا رحمت ہوئی۔ دیکھو استسقاء کی دو ہی رکعت
ہیں جو بہت سے بہت دس منٹ میں ہو جاتی ہیں لیکن باستثناء
شاذ و نادر کے بہت کم ایسا ہوا ہے کہ مؤثر نہ ہوں۔ جب کبھی پڑھی گئی
ہیں بارش ضرور ہوئی ہے کوئی رجوع ہو کر دیکھے تو۔ سندیلہ ایک

تارکِ امر بالمعروف مع ایک قصہ حدیث شریف

صلوٰۃ استسقاء کی برکت

مقام ہے وہاں ایک مرتبہ اِمساکِ باراں ہوا قحط ہوگیا۔ مخلوق بہت پریشان ہوئی۔ استسقا کی نماز کئی روز پڑھی گئی بارش نہ ہوئی وہاں کے رؤسا کے پاس بازاری عورتیں آئیں اور اُنھوں نے عرض کیا کہ صاحبو! یہ سب ہماری بداعمالی کے نتیجے ہیں ہم تبہ کار سیہ رو ہیں ہماری نحوست سے تم کو بھی یہ پریشانی ہوئی ہم کو اجازت دیدیجئے کہ ہم بھی میدان میں جمع ہوکر توبہ کریں لیکن جب ہم جمع ہوں تو ایسا اِنتظام کر دیجئے کہ وہاں جنگل میں کوئی شخص ہمارے پاس نہ آوے ایسا نہ ہو کہ بجائے رحمت کے اور زیادہ غضب نازل ہو۔ چنانچہ اِنتظام کر دیا گیا اور وہ سب وہاں گئیں اور سجدے میں پڑ کر رونا شروع کیا اور کہا کہ اے اللہ یہ ہماری نحوست ہے ہم بہت گنہ گار ہیں ہم بہت سیہ رو ہیں ہماری وجہ سے مخلوق کو پریشان نہ کیجئے اور جو کچھ بن سکا حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا حق تعالیٰ کو عاجزی پسند ہے ناقل اِس حکایت کے یوں کہتے تھے کہ اُنھوں نے سر نہیں اُٹھایا تھا کہ بارش شروع ہوئی اور خوب ہوئی مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را ۔۔۔ ما دروں را بنگریم و حال را

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے ہم باطن اور حال کو دیکھتے ہیں۔)

یعنی ہم ظاہر کو اور الفاظ کو نہیں دیکھتے اگر الفاظ لمبے چوڑے باضابطہ ہوں لیکن خشک ہوں دل میں کچھ نہ ہو تو حق تعالیٰ کے نزدیک ان کا کچھ مرتبہ نہیں ہم تو دل کو اور حال کو دیکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دکھلا دیا کہ تقویٰ طہارت پر کسی کو ناز نہ ہو ہمارے دربار میں تقویٰ طہارت جب ہی مقبول ہے جبکہ اس میں عبدیت اور خشوع خضوع ہو اور خشک تقویٰ ہمارے دربار میں قابلِ قدر نہیں ہے۔ موضع لوہاری میں ایک مرتبہ اِسی طرح اِمساکِ باراں کی وجہ سے مسلمانوں نے اِستسقا کی نماز

تیاری کی۔ بنئے دیکھ کر کہتے تھے کہ اب کے تو بارش ہے ہی نہیں یہ فضول کوشش کر رہے ہیں مسلمانوں نے دعا کی کہ اے اللہ ہم کو ان کے سامنے ذلیل نہ کر۔ ابھی دعا ہی میں مشغول تھے کہ بارش شروع ہوئی۔ وہی بنئے کہنے لگے کہ یہ مسلّے (مسلمان) رام جی کو بہت جلدی راجی (راضی) کرلیں ہیں۔ پس جبکہ باوجود ہماری اتنی کوتاہیوں کے تھوڑی سی توجہ میں بھی رحمت ہو جاتی ہے تو اگر ہم پوری اپنی اصلاح کرلیں اور دل سے توبہ اور رجوع الی الحق کریں تو کیسے رحمت نہ ہوگی ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد　　اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(کوئی شخص ایسا نہیں کہ عاشق ہوا ہو اور محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو۔ اے صاحب (تمہیں) درد ہی نہیں ہے ورنہ طبیب موجود ہے۔)

اگر ہم پوری اصلاح کرلیں تو رحمت ضرور ہو جائے بالفرض اگر بارش نہ ہو تو ہم اس کو ناکامی نہ کہیں گے

پس یہ فرض محال ہے کہ ہم سب نیک ہوں اور بارش نہو اور بالفرض اگر نہ بھی ہو تب بھی یوں نہ کہیں گے کہ ناکامی ہوئی۔ اس کو ناکامی کہنا ۲
کامیابی کی حقیقت نہ جاننے سے ہوا ہے۔ میں کامیابی کی حقیقت بتلاتا ہوں اس سے ناکامی کا علم ہو جائے گا۔ صاحبو روپیہ مل جانا۔ ارزانی کا ہونا۔ روٹی کا ملنا۔ ہر شئے کا حسب دلخواہ ملنا لوگ اس کو کامیابی کہتے ہیں۔ یاد رکھو یہ کامیابی کی صرف صورت ہے کامیابی کی حقیقت نہیں۔ چنانچہ میں ایک مثال عرض کرتا ہوں اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ چیزیں اپنی ماہیت میں کامیابی نہیں ہیں۔ دو شخص فرض کئے جادیں ایک شخص تو ایسا ہے کہ ایک لاکھ روپیہ اس کی ملک میں ہے اور جائداد ہے نوکر چاکر غرض سب سامان دنیا کا اس کو میسر ہے لیکن اس پر ایک مقدمہ فوجداری کا قائم ہوگیا اور اس میں پھانسی کا حکم ہوگیا۔ اور ایک دوسرا شخص ہے جو اسی کے پڑوس میں رہتا ہے جس کی اوقات یہ ہے کہ وہ ۸ ر کا مزدور ہے۔ مزدوری کی اور کھا کر

اپنے بیوی بچوں میں سو رہا۔ یہ امیر آدمی ہمیشہ اس کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا
تھا۔ اگر آج اس امیر کو یوں کہا جاوے کہ تم کو ایک صورت سے خلاصی
ہو سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم اپنا سارا سامان اس شخص کو دیدو بجائے تمہارے
یہ اُس جُرم کا اقرار کرلیگا اور اس کو پھانسی ہو جاوے گی اور تم بچ
جاؤ گے مگر اس کے بعد ناداری سے تمہاری حالت ایسی ہو جائیگی جیسی
اس شخص کی ہے تو وہ امیر یقیناً یہی کہے گا کہ اس سامان کی کیا حقیقت
ہے اگر اس سے دونا بھی میرے پاس ہو اور وہ دیکر میری جان بچے تو
میں راضی ہوں۔ اور اگر اس غریب کو کہا جائے کہ تم کو اتنا روپیہ اور
سامان ملتا ہے لیکن تمہاری جان لی جاوے گی وہ کہے گا کہ جب میری
جان ہی گئی تو میں اِس سامان کو لیکر کیا کروں گا۔ سو صاحبو اگر یہ روپیہ
اور جائداد اور مکانات ہی کامیابی اور مقصود اصلی ہیں تو کیا وجہ
۳ ہے کہ آج ان کو وہ شخص کامیابی کیوں نہیں سمجھتا اور ان کے دینے پر
کیوں راضی ہے اور وہ غریب آدمی کیوں ان کے لینے پر راضی نہیں
ہوتا۔ پس معلوم ہوا کہ یہ سب چیزیں کامیابی کی صورتیں ہیں حقیقت
کامیابی کی اور شے ہے وہ کیا ہے راحتِ قلب چونکہ مال سے راحت
ہوتی ہے اس لئے وہ مقصود ہے بالذات مقصود نہیں ورنہ ہر حالت
میں مقصود ہوتا۔ چنانچہ اِس واقعہ نے ثابت کر دیا کہ خود غلط بود آنچہ
ما پنداشتیم (جو کچھ ہم نے گمان کیا واقع میں غلطی تھی) پس بڑی چیز اور اصلی مقصود
راحتِ قلب ہے اسی واسطے وہ دو لاکھ روپیہ دینے پر بے تکلف اور
دل سے راضی بلکہ مصر ہے اور وہ آٹھ آنے کا مزدور ان پر تھوکتا بھی
نہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا تو اب ہم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں
اور دعویٰ کرتے ہیں کہ راحت اور سکون حقیقی جو حقیقت ہے کامیابی
کی صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ملتا ہے۔ پس اس لئے میں نے کہا

تھا کہ اصلاح و تقویٰ کے اختیار کرنے کے بعد اگر بارش وغیرہ بھی نہ ہو اور
ظاہرا مصیبت بھی دور نہ ہو تب بھی یوں نہ کہیں گے کہ ناکامی ہوئی۔ اس
حالت میں بھی کامیابی ہی ہے اِس لئے کہ اس شخص کو اس مصیبت میں بھی
پریشانی نہ ہوگی راحت اور سکون ہی ہوگا۔ اور یہ نرا دعویٰ ہی نہیں
ہے کہ راحت منحصر ہے اطاعت میں۔ اہل طاعت کی حالت کا مشاہدہ
کر لیجئے کہ ان کو کوئی شئے پریشان نہیں کرتی ان کا قلب ہر وقت مطمئن ہے
اور جو کچھ حق تعالیٰ کی جانب سے پیش آتا ہے وہ اس پر دل سے راضی
ہیں خواہ وہ نعمت ہو یا نقمت (مصیبت) ہو۔ ارزانی ہو یا گرانی بارش ہو
یا نہ ہو اور وہ اسی کو دل سے کامیابی سمجھتے ہیں۔ پس یہ ثابت ہوگیا کہ
اگر سب نیک ہوں اور پھر بھی بارش نہ ہو تب بھی اس کو ناکامی نہ
کہیں گے بلکہ وہی عین کامیابی ہے اِس لئے کہ قحط اور امساکِ باراں
اسی وقت مصیبت ہے جبکہ اس سے پریشانی ہو اور جبکہ وہ ہر حالت 4
میں راضی ہیں تو ان کے لئے یہ مصیبت ہی نہیں۔ میں قسم کھا کر کہتا
ہوں کہ سب اگر اصلاح کرلیں تو اس کا کہنا ہی کیا ہے۔ اگر ایک شخص
بھی اپنی اصلاح کرلے تو وہی کامیاب ہو جاوے گا اس کو ہرگز پریشانی
نہیں رہے گی۔ کیونکہ خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری میں جو راحت ہے وہ
کسی شئے میں بھی نہیں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ اہل اللہ کو حق تعالیٰ سے
محبت ہوتی ہے اور محبت وہ شے ہے کہ تمام تلخیوں کو شیریں کر دیتی ہے
اور حق تعالیٰ کی محبت میں یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ مجازی عشق میں یہ اثر
ہوتا ہے کہ تکلیف کو راحت بنا دیتا ہے۔ مثلاً کسی پر عاشق ہو اور آپ
چلے جا رہے ہوں کہ پیچھے سے کسی نے ایک گھونسہ بڑی زور سے ایسا رسید کیا
کہ بڑی تکلیف و اذیت ہوئی پیچھے پھر کر جو دیکھا تو دیکھتے کیا ہیں کہ وہ گھونسہ
مارنے والا وہ شخص ہے جس کے دیکھنے کی برسوں سے تمنا تھی اور غیبت میں جس کا

محبت اور عشق کا اثر تلخیوں کو شیریں بنا دیتا ہے

نام لیکر دل کو تسلّی دیا کرتا تھا جیسے ایک حکایت ہے ؎

دید مجنوں را یکے صحرا نورد — در بیابان غمش بنشستہ فرد

ریگ کاغذ بود انگشتاں قلم — می نمودے بہر کس نامہ رقم

گفت اے مجنونِ شیدا چیست ایں — می نویسی نامہ بہر کیست ایں

گفت مشقِ نام لیلےٰ می کنم — خاطرِ خود را تسلّی می کنم

(کسی نے مجنوں کو جنگل میں تنہا دیکھا کہ غمگین بیٹھا ہوا ہے کہ ریت پر انگلی سے کسی کو خط لکھ رہا ہے پوچھا اے مجنوں کسے خط لکھ رہے ہو کہنے لگا کر لیلےٰ کے نام کی مشق کر کے اپنے دل کو تسلّی دے رہا ہوں)

جس کا نام ہی بجائے مسمّیٰ کے تھا اب وہ سامنے جلوہ افروز ہے - اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ اس حالت میں کیا اس گھونسہ کی اس کو تکلیف ہوگی. اگر عشق میں سچا ہے تو یوں کہے گا کہ ایک گھونسہ نہیں تم میرے دس گھونسے لگالو مگر
۵ میرے سامنے رہو جسم کو تو اس سے تکلیف ضرور ہوگی لیکن قلب تو یہی کہیگا ؎

نشود نصیبِ دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت — سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہو دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائی کرے)

اور یہ کہے گا ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من — دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

(تیرا ناخوش ہونا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے ایسے محبوب پر دل قربان ہو جو میرے دل کو رنجیدہ کرنیوالا ہے)

اور یہ کیوں ہے محض اس لئے کہ یہ محبوب کی جانب سے ہے ؏

از محبّت تلخہا شیریں بود

(محبت میں تلخیاں بھی شیریں ہیں)

جب مخلوق کی محبت میں یہ حالت ہے تو ؎

عجب داری از سالکان طریق — کہ باشند در بحرِ معنی غریق

خوشا وقت شوریدگان غمش — اگر ریش بینند دگر مرہمش

گدایانے از بادشاہی نفور | بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشند | وگر تلخ بینند دم درکشند

(تو سالکان طریق سے جو کہ حقیقت کے دریا میں غرق ہیں تعجب کرتا ہے اس کے غم میں پریشان لوگوں کا کیا اچھا وقت ہے اگر غم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں ایسے فقیر بادشاہی سے نفرت کرنے والے اور اس کی امید پر فقیری میں کرنے والے ہیں ہر وقت رنج کی شراب پیتے ہیں جب اس میں رنج کی تلخی دیکھتے ہیں خاموش رہتے ہیں)

جبکہ تمہارے جیسا آدمی جو تمہاری مثل خون اور کھال اور گوشت پوست سے بنا ہے تمہاری یہ حالت بنا دیتا ہے تو صاحب محبوب حقیقی کے عشق میں تو یہ اثر کیسے نہ ہوگا۔ پس کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ بعد اصلاح کے بھی ناکامی ہوتی ہے رہی یہ بات کہ اگر محبوب ہی کی یہ مرضی ہو کہ مصیبت میں پھنسا رہے پھر تو کامیابی ہونا اور مصیبت سے نکلنا ممکن ہی نہیں تو
پھر کامیابی کدھر سے ہوئی۔ بات یہ ہے کہ میرا مقصود صرف یہ ہے کہ ۶
ان کو اطمینان اور چین اور سکون ہر وقت رہتا ہے اس کا نام میں نے باعتبار حقیقت کے کامیابی رکھا ہے میں نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ مصائب ان پر نہیں آتے مصائب صورۃً آتے ہیں مگر اس سے وہ پریشان نہیں ہوتے از جا رفتہ (پریشان) نہیں ہوتے اور کیوں ہوں اس لئے کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ بندہ کے واسطے وہی کرتے ہیں جو اس کے لئے بہتر ہو حق تعالیٰ کو ماں سے زیادہ شفقت ہے ؎

طفل می لرزد زنیش احتجام | مادر مشفق ازاں غم شادکام

(بچہ نشتر لگواتے سے لرزتا ہے مگر مشفق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے)

خدا تعالیٰ ان کو مریض رکھیں یا تندرست مفلس رکھیں یا امیر مگر ان کو ذلیل اور پریشان نہیں کرتے اس کے خلاف کہیں ابتلاؤ تب شبہ کی گنجائش ہے بہرحال ثابت ہوگیا کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی تدبیر حقیقی

ازالۂ شبہ کہ جو مصائب آتے ہیں ان سے وہ پریشان نہیں ہوتے

صرف اطاعۃ کاملہ ہے۔ پس اس تدبیر کو اختیار کرو اور دین کی طرف توجہ کرو اور اس کے طریقہ سے توجہ کرو۔ بہت لوگ اس کے متعلق بھی غلطیوں میں مبتلا ہیں یعنی اگر دین کی طرف آتے ہیں تو نئے رنگ سے اور جو اس کا اصلی طریق ہے اس طریقہ پر نہیں چلتے۔ مثلاً کبھی بزرگ سے کہتے ہیں کہ حضرت کوئی ایسی تدبیر کیجئے کہ گناہ مجھ سے نہ ہوں گویا حضرت کے پاس کوئی زنجیر ہے کہ آپ کو اس میں جکڑ دیں گے تو گویا وہ نرے بزرگ ہی نہیں بلکہ کوتوال یا داروغہ جیل بھی ہیں۔ ایک معقولی مولوی صاحب تھے ان کے ملنے کے لئے ایک خانصاحب رئیس آئے اور وہ رئیس مستاجری پر گاؤں لیا کرتے تھے مولوی صاحب نے پوچھا خانصاحب گاؤں کا انتظام کس کے سپرد کر آئے خانصاحب نے فرمایا کہ بڑے پیر صاحب کے سپرد کر دیا۔ مولوی صاحب نے فرمایا آہا ہم تو یہ سمجھا کرتے تھے کہ بڑے پیر صاحب نرے ولی ہیں معلوم ہوا کہ وہ گاؤں کے پدھان بھی ہیں۔ ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مولوی صاحب بڑے گستاخ تھے اور واقع میں گستاخ وہ خانصاحب تھے کہ بڑے پیر صاحب کو انھوں نے ایسے لغو کام کا سمجھا تو ایسے ہی ہمارے بھائی اوّل تو دین کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اگر کچھ ضروری شوق ہوتا ہے تو ایسی بیہودہ فرمائشیں کرتے ہیں ؎ 7

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

بعضے کہتے ہیں کہ حضرت اپنے سینہ میں سے کچھ دیدیجئے گویا ان کے پاس کوئی پڑیہ ہے کہ وہ اس میں سے تم کو بھی دیدیں گے۔ ایک بزرگ نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ جس کے سینہ میں سے تم مانگتے ہو یہ دیکھو کہ اس کے سینہ میں کیونکر آیا۔ برسوں مجاہدے کئے محنتیں کیں خدمتیں کیں اپنے حظوظ نفسانیہ پر خاک ڈالی جب کچھ ملا سو تم بھی اسی طرح کرو ؎

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

(صوفی جب تک بہت سے مجاہدے نہ کرے خام ہی رہتا ہے پختگی مجاہدات کے بعد حاصل ہوتی ہے)

بڑے بڑے سفر سے مراد مجاہدے اور مشقتیں ہیں اتنے مجاہدے کے بعد خامی گئی ہے۔ غرض یہ نرا خبط ہے بعضے دانشمند ایسے لوگوں کا علاج بھی کر دیتے ہیں جیسے ایک ظریف سیّاح شاہ صاحب کی نسبت ایک خانصاحب کو خیال ہو گیا کہ یہ کیمیا جانتے ہیں آئے اور بات شروع ہوئی۔ خانصاحب السلام علیکم۔ شاہ صاحب وعلیکم السلام۔ خانصاحب۔ شاہ صاحب میں نے سنا ہے آپ کیمیا جانتے ہیں۔ شاہ صاحب۔ ہاں جانتے ہیں۔ خانصاحب۔ ہم کو بھی بتلا دو۔ شاہ صاحب۔ نہیں بتلاتے تمہارے باوا کے نوکر ہیں۔ پھر تو خانصاحب کو اور بھی زیادہ اعتقاد بڑھا اور منت کرنے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا کہ خانصاحب جسطرح ہم نے سیکھی ہے اس طرح سیکھو خدمت کرو پاؤں دباؤ حقّے بھرو جو ہم کھلاویں وہ کھاؤ اور جو ہم کہیں وہ کرو۔ اگر کبھی مزاج خوش ہو گا اور دل میں آ جاوے گا بتا دیں گے۔ خانصاحب راضی ہو گئے۔ رات ہوئی شاہ صاحب نے کچھ گھاس پھونس اُبال کر خانصاحب کے سامنے رکھ دیا۔ خانصاحب نے ایسا کھانا کب کھایا تھا ذرا ناک چڑھانے لگے۔ شاہ صاحب نے کہا ابھی تو اوّل ہی منزل ہے۔ جب خانصاحب نے یہ رنگ دیکھا تو کیمیا سے عمر بھر کے لئے توبہ کی۔ صاحبو خدمتیں کرو۔ محنتیں کرو خدا تعالیٰ فضل فرمانے والے ہیں۔ طلب کا تو یہ حال پھر چاہتے ہو کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے مل جائے یہ تو طریق بزرگی کے متعلق کلام تھا۔ اب اس کے ثمرات کے متعلق لیجئے کہ بزرگی کے ثمرات اپنے ذہن میں کیا سمجھ رکھے ہیں مثلاً اگر کوئی اچھا خواب نظر آ گیا بس یہ بزرگی ہے اور اگر خواب بند ہو گئے سمجھ گئے کہ بزرگی ہماری جاتی رہی۔ میرے پاس بہت خطوط خوابوں کے متعلق آتے ہیں میں تو جواب میں یہ شعر لکھ دیتا ہوں ؎

ایک خانصاحب اور ظریف کی حکایت

بزرگی کے ثمرات لوگوں نے کیا سمجھے ہیں

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم چو غلام آفتابم ہمہ زآفتاب گویم

(نہ شب ہوں نہ شب پرست جو خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں اسی کی باتیں بیان کرتا ہوں)

جو دریافت کرو بیداری کی حالت پوچھو۔ خواب تو اگر یہ بھی دیکھ لو کہ سور کا گوشت کھایا ہے واللہ ذرہ برابر تم کو بُعد نہیں ہوا اور اگر خواب میں یہ دیکھو ہم جنّت میں ہیں واللہ اس سے کچھ قرب نہیں ہوا۔ بہر حال کام کرو۔ کام کرنے سے کچھ ملتا ہے اور سینہ میں کیا دھرا ہے ہاں سینہ میں تو بلغم ہے وہ تم کو دیدیں گے اور بعضے لوگ اِس طرح دین کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ دُنیا لیکر بزرگوں کے پاس جاتے ہیں۔ کیا معنی کہ بزرگوں کے پاس جاویں گے اور ان کا وقت بھی ضائع کریں گے اور دنیا بھر کے قصے وہاں بیان کریں گے حضرت بمبئی میں یہ ہو رہا ہے۔ روم میں یہ قصہ ہوا۔ روس میں یہ واقعہ ہوا صاحبو تم کو روم روس کے قصوں سے کیا لینا ہے۔ خود تمہارے اندر ایک

9 روم روس ہے کہ ان میں روزانہ جنگ رہتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اے برادر عقل یکدم باخود آر دمبدم در تو خزان است و بہار

(اے بھائی تھوڑی دیر کے لئے ذرا عقل درست کرکے دیکھ خود تیرے اندر دمبدم خزاں و بہار موجود ہے)

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ تو زغنچہ کم نہ دمیدہٴ در دل کشا بچمن درآ

(تمہارے اندر خود چمن ہے اس کا پھاٹک تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرلو۔)

حکیم سنائی کہتے ہیں ؎

آسماں ہاست در ولایت جاں کارفرمائے آسمانِ جہاں

در رہ روح پست و بالا ہاست کوہ ہائے بلند و صحرا ہاست

(ولایت جان میں بہت سے آسمان ہیں جو ظاہری آسمان میں کارفرما ہیں روح (باطن) کے راستہ میں پست و بالا (نشیب و فراز) کوہ و صحرا موجود ہیں)

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں ؎

وانت الکتاب المبین الذی باحرفہ یظہر المضمر

بعض لوگ بزرگوں کے پاس دنیا لیکر جاتے ہیں

وتزعم انك جرم صغیر　　　وفیك انطوی العالم الاکبر

(اور تو مثل ایسی روشن کتاب کے ہے جس کے حرفوں سے مضمر باتیں ظاہر ہوتی ہیں تو اپنے آپ کو جسم صغیر سمجھتا ہے حالانکہ تیرے اندر بڑا جہان لپٹا ہوا ہے)

صاحبو تمہارے اندر سب کچھ ہے روم بھی ہے روس بھی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہاں مکان بنے ہوئے ہیں مقصود یہ ہے کہ جب تم روم روس کی لڑائی دیکھو یا سنو تو اپنے اندر روح و نفس کی لڑائی کے متعلق بھی غور کیا کرو کہ تم پر تمہارا نفس غالب ہے یا روح غالب ہے یہ کیا ظلم و ستم ہے کہ بیرونی لڑائیوں کے تو تذکرے کرو اور اپنے اندر جو لڑائی ہے اس سے غفلت ہو ے

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم　　　از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر و دارا کے قصے نہیں پڑھے ہیں ہم سے محبت اور عشق کی باتوں کے سوا کچھ نہ پوچھو)

یاد رکھو اگر اس سے غفلت میں رہے تو بہت پچھتاؤ گے۔ یہاں تو ناکامی ہو ہی رہی ہے وہاں بھی ناکام رہو گے۔ بہت جلدی اصلاح کر لو۔ اس آیت ۱۰
میں اس کا طریقہ مذکور ہے اور وہ طریقہ مرکب ہے دو جزو سے اور ان دونوں میں ترتیب بھی ہے اوّل تو یہ ہے کہ اپنے گناہوں سے معافی مانگو مگر معافی مانگنا یہ نہیں کہ صرف زبان سے استغفر اللہ استغفر اللہ کہہ لیا یہ تو نقل ہے معافی مانگنے کی جیسے کسی فارسی دیہاتی نے کسی واعظ سے سنا کہ بے وضو نماز نہیں ہوتی تو آپ فرماتے ہیں "بارہا کردیم و شد نماز (ایسا ہم نے بہت مرتبہ کیا اور نماز ہوگئی)" نام اُٹھنے بیٹھنے کا سمجھے۔ ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحب سے ایک شخص نے مسئلہ پوچھا کہ ایک عورت اور مرد میں یہ رشتہ ہے ان کا نکاح ہو سکتا ہے یا نہیں۔ فرمایا کہ نہیں ہو سکتا کہنے لگا کہ ہم نے تو کیا تھا ہو گیا۔ نہ ہونے کا مطلب یہ سمجھا کہ الفاظ ایجاب و قبول کے منہ سے نہ نکل سکیں گے بس جیسی یہ نماز اور نکاح ہوا تھا ایسے ہی ہم لوگوں کا استغفار بھی ہے۔ صاحبو ہر گناہ کے استغفار کا طریقہ جدا ہے

طریقہ اصلاح کے دو جزو استغفار و اطاعت

گناہوں کو دیکھو کیا ہیں۔ اگر حقوق العباد میں ان کی استغفار یہ ہے کہ ان کو ادا کرو ان کی معافی استغفار پڑھنے سے نہ ہوگی۔ اگر روزے نماز ذمہ پر ہیں ان کی استغفار یہ ہے کہ ان کی قضا کرو۔ اگر گناہ ہیں ان کی توبہ کا طریقہ استغفار بندامت پڑھنا ہے نیز توبہ و استغفار کے لوازم میں سے ہے معاصی کا ترک کرنا خواہ دیانات کے متعلق ہوں یا معاملات کے مثلاً آجکل اکثر لوگ آمدنی وخرچ کے طریقوں میں حدود شریعت کا لحاظ نہیں رکھتے۔ اِس زمانہ میں آمدنی کے بہت سے طریقے خلاف شرع شائع ہوئے ہیں کہ جوے یا ربوا سے خالی نہیں۔ دیوالی کی رات میں جو جوا کھیلا جاتا ہے اس کو تو بُرا سمجھتے ہیں لیکن آجکل سٹہ جو چل رہا ہے اس سے پرہیز نہیں کرتے ان سٹہ والوں میں بہت لوگ ایسے ہیں کہ نمازی اور ڈاڑھی لمبی ٹخنوں سے اوپر پاجامہ ہاتھ میں تسبیح بڑے متقی لیکن سٹہ سے ان کا تقویٰ نہیں ٹوٹتا۔ یاد رکھو یہ بالکل جوا ہے اسی طرح چٹھیاں جو پڑتی ہیں یہ بھی جوا ہے۔ اس سے بڑھ کر بیمہ کمپنیاں جو نکلی ہیں وہ بھی حرام ہیں۔ ان کے تو شروع ہی میں بیم آگیا ہے (یہ لطیفہ ہے ۱۲ جامع) اور شادی فنڈ اور جان بیمہ اور ایک قسم کے ٹکٹ کی تقسیم کا سلسلہ یہ سب حرام و قمار جوا اور ربوا ہیں۔ اور ان میں سخت دھوکہ بھی ہے۔ شریعت میں کوئی معاملہ پیچیدہ نہیں اور ان طریقوں میں سخت پیچیدگی اور دھوکہ ہے۔ یہ تو آمدنی کے طریق ہیں اور خرچ کے اندر تو کچھ باک ہی نہیں جہاں چاہتے ہیں تنعمات میں فضول سامان میں ناموری کے کاموں میں بے دھڑک خرچ کرتے ہیں سمجھتے ہیں اپنی شے ہے جس طرح چاہیں صرف کریں اور سب سے زیادہ گندہ مصرف جو اس شہر میں کثرت سے ہے کوکین کھانا ہے۔ اِس کوکین سے سینکڑوں گھر برباد ہوگئے ظاہر میں تو ذرا سی چیز ہے لیکن مفاسد اس کے کثیر ہیں۔ شیطان کا شیرہ ہے شیطان کو کسی نے کہا تھا کہ تو بڑا ملعون ہے گناہ کراتا ہے۔ اس نے کہا

میں کیا گناہ کرتا ہوں میں تو ایک ذراسی بات کرتا ہوں لوگ اس کو بڑھا
دیتے ہیں دیکھو میں تم کو تماشا دکھلاتا ہوں۔ ایک دوکان پر پہونچے۔ ایک
انگلی شیرہ کی بھرکر دیوار کو لگادی اس پر ایک مکھی آبیٹھی ایک چھپکلی اس پر
جھپٹی اس پر دوکاندار کی بلی دوڑی اس پر ایک خریدار کا جو کہ فوجی سوار
تھا کتا لپکا۔ دوکاندار نے اس کتے کے ایک لکڑی ماری۔ سوار کو غصہ
آیا اس نے دوکاندار کے ایک تلوار ماری بازار والوں نے انتقام میں
سوار کو قتل کر ڈالا۔ فوج میں خبر ہوئی فوج والوں نے بازار کو گھیر کر
قتل عام شروع کرادیا۔ بادشاہ وقت نے دوسری فوج سے ان ظالموں
کو سزا میں قتل شروع کردیا۔ ایک گھنٹہ میں تمام شہر میں خون کے ندی نالے
بہہ گئے۔ شیطان نے کہا دیکھا میں نے کیا کیا تھا اور لوگوں نے اس کو
کہاں تک پہونچادیا۔ اسی طرح یہ کوکین بھی شیطان کا شیرہ ہی جب تک
اپنے پاس روپیہ رہتا ہے اس کو خرید کر کھاتے ہیں جب وہ ختم ہو جاتا ۱۲
ہے تو اثاث البیت بیچ کر کام چلاتے ہیں جب وہ بھی ختم ہو گیا تو بیوی
کا زیور پھر جائداد اور گھر غرض سب اڑادیتے ہیں جب اپنا سرمایہ ختم
ہو لیا پھر پڑوسیوں پر صفایا شروع کردیا۔ کسی کے برتن اٹھالئے کسی
کے یہاں نقب دیدی آخر جیلخانہ میں چلے جاتے ہیں وہاں مفت کی
روٹیاں کھاتے ہیں گھر رہنے میں تو کچھ فکر بھی تھی وہاں کچھ فکر ہی نہیں۔
بعضے ایسے بیحیا ہوتے ہیں کہ جیلخانہ سے جب چھوٹتے ہیں تو کہہ کر آتے ہیں کہ
ہمارا چولھا باقی رکھنا ہم پھر آدیں گے۔ غرض یہ کوکین بڑی بلا کی شے
ہے اور ہزاروں اس میں مبتلا ہیں اور تعجب ہے کہ سب بلائیں اور
مصیبتیں اٹھاتے ہیں لیکن چھوڑتے نہیں لوگ کہتے ہیں کہ چھوٹتی نہیں
صاحبو! جب ہمت قوی کرلی جاوے تو سب چھوٹ جاتی ہے۔ حضرت
مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی خدمت میں ایک گاؤں کا رہنے والا

شیطان کے شرارت کی حکایت

کوکین شیطان کے شیرہ کی مانند

حضرت مولانا گنگوہی کے ایک باہمت مرید کا قصہ

مرید ہونے کے لئے آیا حضرت نے کلمات بیعت کے کہ جن کا کہ حاصل معاصی سے توبہ ہے کہلا دیئے۔ جب توبہ کر لی تو کہتا ہے کہ مولوی جی! افیم سے تو توبہ کرائی ہی نہیں۔ حضرت نے فرمایا مجھے کیا خبر کہ تو افیون کھاتا ہے۔ اچھا یہ بتلا کتنی کھاتا ہے جس قدر کھانا ہو میرے ہاتھ پر رکھ دے مگر اس نے جیب میں سے افیون کی ڈبیہ نکال کر دور پھینکی کہ مولوی جی جب توبہ ہی کر لی تو اب کیا کھاویں گے گھر گیا تو دست شروع ہوئے اس نے مولانا سے کہلا کر بھیجا کہ حضرت دعا کیجیو اچھا ہو جاؤں چند روز کے بعد تندرست ہو کر پھر آیا۔ دو روپیہ حضرت کی خدمت میں پیش کئے حضرت نے بعد انکار کے اس کے اصرار سے قبول فرمائے کہتا ہے حضرت جی یہ تو آپنے پوچھا ہی نہیں کہ یہ روپیہ کیسے ہیں حضرت نے فرمایا بتلاؤ کیسے ہیں۔ کہا افیم کے ہیں پوچھا افیم کے کیسے کہنے لگا کہ میں دو روپیہ ماہوار کی افیون کھاتا تھا۔ جب میں نے افیون چھوڑی تو میرا نفس بہت خوش

۱۳ ہوا کہ دو روپیہ بچیں گے۔ میں نے کہا کہ میں تیرے لئے نہیں بچاؤں گا۔ میں یہ دو روپیہ اپنے پیر کو دوں گا۔ بظاہر لوگ اس گنوار کو اس کی گفتگو سے غیر مہذب سمجھے ہوں گے حضرت تہذیب نام لکھنؤ اور دہلی کے الفاظ کا نہیں ہے وہ تہذیب ہے تہذیب نام ہے تہذیب نفس کا جس کا بڑا شعبہ خلوص ہے جو اس گنوار میں کمال کے ساتھ حاصل تھا۔ سو آپ نے الفاظ کو تو دیکھا لیکن یہ نہ دیکھا کہ اس گنوار میں کس درجہ کا خلوص اور تکلف اور تصنع سے کتنا دور تھا کہ جو بات تھی بلا تکلف سب کہدی مولانا فرماتے ہیں ؎

ما بروں را ننگریم و قال را　　ما دروں را بنگریم و حال را

(ہم ظاہر اور قال کو نہیں دیکھتے دل کو اور حال کو دیکھتے ہیں)

اور اس گنوار کی قوت علمی و عملی پر غور فرمایئے کہ کس درجہ تھی۔ قوت علمی تو فہم اس بات کا کہ نفس کے خلاف کرنا چاہیئے اور عملی قوت یہ کہ ایک دم سے ایک مدت کی عادت کو جو سالہا سال کے مجاہدہ سے بھی نہیں چھوٹتی چھوڑ دی یہ حال ع

ع اور پھر حضرت کی قوت فیضان کو بھی ملاحظہ فرمایئے کہ کس درجہ تھی ۱۲ جامع

یہ نفس کے حیلے حوالے ہیں جب آدمی دل سے ہمت کرتا ہے اور قصد کرتا ہے کسی کام کے چھوڑنے کا تو حق تعالیٰ ضرور امداد کرتے ہیں پس کوکین بھی ہمت کر کے چھوڑ دو۔ اسی طرح اور سب بیہودہ اخراجات ترک کر دو۔ خلاصہ یہ ہے کہ آمدنی اور خرچ کے طرف کی بھی اصلاح کیجئے نیز توبہ و استغفار کا ایک شعبہ اخلاق ذمیمہ کی بھی اصلاح ہے ایک مدلول آیت یعنی اصلاح کے دو جزو میں سے ایک جزو میں تو کلام ہو چکا اب دوسرا جزو اصلاح کا جو آیت میں مذکور ہے یہ ہے ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ یعنی پھر بعد استغفار کے حق تعالیٰ کی طرف طاعت کے ساتھ رجوع ہو جاؤ۔ یہ بھی توبہ کے لوازم سے ہے آگے اس اصلاح کا ثمرہ بیان فرماتے ہیں يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا یعنی تم پر بارش بہت برسنے والی بھیجیں گے۔ یہ بارش خواہ ظاہر میں ہو یا اگر ظاہر میں دیر بھی ہو گئی تو اس بارش کی روح تو ضرور ہی ہو گی اور اس کو باطن کی بارش کہنا چاہیے یعنی قلب پر رحمت کی بارش ہو گی جس کی تفصیل اوپر آ چکی ہے کہ کامیابی کی غایت طمانیتِ قلب و راحتِ روح ہے وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ یعنی دوسرا ثمرہ یہ ۱۴
ہو گا کہ تمہاری موجودہ قوت کو بڑھا دیں گے اس وقت تو قوت مالی و جاہی ہے اس اصلاح کے بعد قوتِ قلب عطا فرماویں گے پھر جو بھی مصیبت آوے گی وہ صورت مصیبت ہو گی اور حقیقت میں یہ حالت ہو گی کہ اس مصیبت پر ہزار راحتیں قربان کرو گے اور زبان حال سے کہو گے ؎ ہرچہ از دوست میرسد نیکوست (جو کچھ محبوب کی جانب سے پیش آئے وہ خیر ہی ہوتا ہے) آگے ارشاد ہے وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ یعنی اعراض مت کرو مجرم ہو کر۔ مطلق ولا تتولوا نہیں فرمایا اس لئے کہ تولی کی دو قسمیں ہیں ایک صورت تولی ایک حقیقت تولی۔ صورۃً تو یہ کہ بشریت سے غلطی ہو گئی۔ ایسی غلطیوں سے انسان بچ نہیں سکتا اور حقیقت تولی ہوتی ہے مقابلانہ و باغیانہ تو فرماتے ہیں کہ باغیانہ تولی مت کرو یعنی باغی مت بنو اور گناہ سے تو کیسے پاک ہو سکتے ہیں لیکن اگر گناہ ہو جائے تو ساتھ کے ساتھ توبہ کر لو حدیث شریف میں ہے كُلُّكُمْ خَطَّاؤُونَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ یعنی تم سب خطاوار ہو اور بہتر خطاوار توبہ کرنیوالے ہیں۔ یہ تعلیم ہے حق تعالیٰ کی اور یہ طریقہ وہ ہے کہ جس سے قومی مالی جسمی دینی دنیوی ترقی ہوتی ہے اس کو پلے باندھو یاد رکھو کہ ہماری دنیوی فلاح دین کیساتھ وابستہ ہے جب ہم اس کے خلاف ہوا ہے تنزل اور پستی اور ادبار اور قحط سب ہی بلائیں مسلط ہو جاتی ہیں اب اللہ تعالیٰ

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

وعظ
ملقب بہ
فوائد الصحبۃ

۱۵ منجملہ ارشادات حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ ملقب بہ

فوائد الصحبۃ

اين	متىٰ	كم	كيف	ماذا	من ضبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
کاندھلہ دالان مولوی رضی حسن صاحب	۴- ذیقعدہ ۱۳۳۲ھ یوم جمعہ	بعد نماز جمعہ مغرب تک باستثنائے مقدار ادائے عصر	کھڑے ہو کر	ضرورت صحبت و مراجعت اہل تحقیق و اہل نسبت	سعید احمد تھانوی مرحوم	تقریباً تین سو سے زائد	اکثر معزز تعلیم یافتہ شریک تھے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ١٦

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَاصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰہُ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا (اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیاوی زندگانی

بے رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانیے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا (یہ) حال حد سے گذر گیا ہے) یہ ایک آیت ہے سورۃ کہف کی اس میں ایک نہایت ضروری مضمون مذکور ہے اور وہ ایسا مضمون ہے کہ اس کی ضرورت عام ہے عوام و خواص سب کے لئے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا مضمون جس کی ضرورت عوام و خواص سب کے متعلق ہو نہایت ہی ضروری ہوگا۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ ضرورتیں بعض تو صرف عوام کے متعلق ہوتی ہیں اور بعض صرف خواص کے اور بعض عوام و خواص دونوں میں مشترک ہوتی ہیں اور ہر چند کہ پہلی دونوں ضرورتیں بھی اپنے درجہ میں ضروری ہوتی ہیں لیکن جو ضرورت مشترک ہو وہ نہایت ہی ضروری ہوگی نیز دوسری وجہ اس کے اہم ہونے کی یہ بھی ہے کہ قاعدہ ہے کہ بعض ضروریات کی تو اہلِ ضرورت کو اطلاع ہوتی ہے مگر کسی وجہ سے اُس پر عمل کرنے میں
۱۷ کوتاہی ہوتی ہے۔ اور بعض کی تو اطلاع ہی نہیں ہوتی۔ تو یہ بعضے امور ایسے ہوتے ہیں کہ وہ عوام کے نزدیک نہایت ہی خفیف ہوتے ہیں لیکن واقفین حقائق کے نزدیک وہ نہایت ہی اہم ہوتے ہیں۔ اسی طرح اعمال وامراض میں بھی بعض تو ایسے ہیں کہ اُن کی سب کو اطلاع ہے اور گو وہ بھی ضروری ہوتے ہیں مگر زیادہ ضروری وہ ہیں جن کی اطلاع ہی نہ ہو۔ اِس آیت میں ایسا ہی مضمون بیان کیا گیا ہے جس کی ضرورت مشترکہ کے ساتھ خود خبر بھی بہت کم لوگوں کو ہے۔ اور یہ بیخبری کا دعویٰ یا تو لوگوں کے عقیدہ سے دریافت کر لیجئے کہ اس مضمون کے متعلق کیا عقیدہ ہے یا طرزِ عمل سے کیونکہ جس امر کے ساتھ غیر ضروری کا سا برتاؤ کیا جاوے گا یہی سمجھا جاویگا کہ اس کی ضرورت کی اِطلاع ہی نہیں۔ خاص کر جبکہ عقیدہ بھی کسی درجہ میں شہادت دے۔ میں اس مضمون کی اجمالی تعیین کئے دیتا ہوں پھر ترجمہ تفصیلاً بھی تعیین ہو جاوے گا مگر ترجمہ سے قبل اس کے شان نزول کا

بیان کر دینا مناسب ہے۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو شفقت امت پر ہے حتیٰ کہ اُمت دعوت پر بھی اس کا پتہ کتب سیر و تواریخ و احادیث سے چل سکتا ہے۔ اِن کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بے انتہا شفقت تھی سب پر اور اثر اُس شفقت کا یہ تھا کہ آپ ہر وقت سوچتے رہتے تھے کہ اُمت کو کس طرح نفع پہونچے۔ اور کوئی یہ نہ سمجھے کہ اِس سوچنے سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی کوئی خاص غرض تھی یا اپنے کسی خاص نفع کی تحصیل مقصود تھی ہرگز نہیں بلکہ محض اُمت کے نفع اور اس کی بہبودی کے لئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تدبّر و تبلیغ پر بغیر قصد ثواب مرتب ہو جاوے اور اِس طرح حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی نفع پہونچے۔ لیکن یہ نفع حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبلیغ کے وقت پیش نظر نہ تھا اور اسی نفع اجر تبلیغ کی بنا پر خدا تعالےٰ نے اُن کفار کے متعلق جن سے بالکل یاس ہوگیا تھا یہ فرمایا کہ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ 18
اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ؏ یہ نہیں فرمایا کہ سَوَآءٌ عَلَيْكَ کیونکہ آپ کے لئے انذار و عدم انذار مساوی نہیں تھا بلکہ انذار ثواب مرتب ہوا جو کہ عدم انذار کی صورت میں نہ ہوتا اور یہیں سے اہلِ علم کے نزدیک اِس اعتراض کا بھی جواب ہو جاویگا کہ جب آپ کا انذار و عدم انذار مساوی تھا تو ایک عبث فعل آپ کے کیوں سپرد ہوا حاصل جواب کا یہ ہے کہ عبث تو اُس وقت کہا جا سکتا تھا کہ جب آپ کے حق میں بھی برابر ہوتا اور جب آپ کے حق میں برابر نہ تھا لترتّب الثواب علی الانذار وانتفائه علی عدمه (بسبب ثواب مرتب ہونے کے ڈرانے پر اور نہ مرتب ہونا نہ ڈرانے پر) تو یہ فعل عبث نہ رہا۔ غرض اس میں تو شبہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو تبلیغ و انذار پر ثواب تو ملتا ہے لیکن گفتگو یہ ہے کہ یہ ثواب آپ کی نظر میں بھی انذار سے مقصود تھا یا نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم

امت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت

آیت سواء علیہم پر ایک شبہ اور اس کا جواب

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو انذار سے ثواب مقصود نہ تھا

؏ ترجمہ: برابر ہے آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

کی شفقت دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محض ثواب مقصود نہ تھا کیونکہ اگر آپ کو محض ثواب مقصود ہوتا تو اس قدر دلسوزی کی کیا وجہ تھی۔ ثواب تو صرف تبلیغ پر بھی مرتب ہو جاتا تھا جس کے باب میں قرآن مجید میں ارشاد ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (شاید آپ اپنی جان کو ہلاک کرنے والے ہیں اس وجہ سے کہ یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں) اور وَمَا اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ (اور آپ ان پر وکیل نہیں ہیں) اور وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحَابِ الْجَحِيْمِ (دوزخ والوں کی نسبت آپ سے سوال نہ ہوگا) ان سب آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بیحد غم تھا ان لوگوں کے ایمان نہ لانے کا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو صاف لفظوں میں ارشاد بھی فرمایا۔ حدیث شریف میں ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ میری تمہاری ایسی مثال ہے کہ جیسے کسی نے آگ روشن کی ہو اور پروانے گرتے ہوں وہ شخص ان پروانوں
کو ہٹاتا ہو لیکن وہ اس پر غالب آجاتے ہوں اسی طرح تم لوگ دوزخ کی 19
آگ میں جان جان کر گرتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ پکڑ ہٹاتا ہوں لیکن تم مجھ پر غالب آئے جاتے ہو اور اس میں گھسے جاتے ہو۔ ان الفاظ سے ہر زبان داں کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ زیادہ مقصود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ تھا کہ یہ لوگ آگ سے بچیں اور یہی وجہ تھی کہ اگر کوئی ایسی تجویز آپ کے روبرو پیش کی جاتی جس سے آپ کو اپنے مقصود حاصل ہونے کی امید ہوتی ہو تو آپ اس کو بہت جلد قبول فرما لیتے تھے اسیؑ سے کفار مشرکین کو ایک شرارت سوجھی اور انھوں نے دق کرنے کے لئے ایک مشغلہ نکالا جیسے آجکل مصلحین کے ساتھ کیا جاتا ہے چنانچہ کفار نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (یہ تو کیوں کہا ہوگا یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا ہوگا) ہم آپ کے پاس آیا کریں تو کچھ سُن لیں لیکن چونکہ آپ کے پاس غربار کا مجمع رہتا ہے جن کے پاس بیٹھتے ہوئے ہمیں عار آتی ہے

ع ثُمَّ اٰمَنَ بَعْضٌ مِّنْهُمْ بَعْدُ ۱۲ (پھر اس کے بعد ان میں سے بعض ایمان لے آئے)

اس لئے ہم نہیں بیٹھتے۔ اگر آپ ان کو علیحدہ کر دیا کریں اور ہمارے لئے ایک مستقل مجلس علیحدہ کر دیں اور جس وقت ہم آیا کریں ان کو اُٹھا دیا کریں کیونکہ ہمارے پاس بیٹھ کر ان کا حوصلہ بڑھے گا۔ تو ہم حاضر ہوا کریں۔ اور اس سے اُن کو یہ ہرگز مقصود نہ تھا کہ ہم مسلمان ہو جائیں گے بلکہ محض دق کرنا منظور تھا کہ تھوڑی دیر احباب میں مفارقت ہی رہے گی۔ کیونکہ صحابہ کرام کو وہ محبت تھی حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کہ کسی کو نہیں ہوئی۔ اور یہی سبب تھا اطاعت کاملہ کا ورنہ اگر کامل محبت نہ ہو تو اطاعت کاملہ ہو نہیں ہو سکتی آجکل اکثر دینداروں میں بھی محض ضابطہ کی محبت ہے۔ صاحبو بہت بڑا فرق ہے ضابطہ کی محبت میں اور جوش کی محبت میں۔ اوّل میں کوئی نہ کوئی غرض پنہاں ہوتی ہے اور اس میں ضرور فروگذاشت ہو جاتی ہے وہ محض مصلحت پر مبنی ہوتی ہے اور بسا اوقات ایک مصلحت کے قائم مقام دوسری مصلحت ہو جاتی ہے تو نفس کہتا ہے کہ مقصود تو آگ سے بچنا ہے اس گناہ کو کرلو اس کے بعد توبہ کر لینا تو آگ سے تو اس طرح بھی بچ جاؤ گے اور یہی وجہ ہے کہ ہم کو ہمارے نفس نے دلیر کر دیا ہے تو آگ سے بچنے کی مصلحت ایک محرک عقلی ہے جس پر تقاضائے نفس غالب آسکتا ہے اور محبت محرک طبعی ہے کہ اگر یہ بھی معلوم ہو جاوے کہ ترک اطاعت پر عذاب نہ ہوگا تو بھی مخالفت سے شرماتا ہے کیونکہ وہاں داعی الی الاطاعۃ (اطاعت کی طرف داعی) طبعی ہو جاتا ہے۔ اِسی لئے فرماتے ہیں ؎

صنما رہ قلندر سزد ار بمن نمائی
کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(اے مرشد مجھ کو قلندری کا راستہ بتلا دیجئے کیونکہ پارسائی کا راستہ تو بہت دور دراز کا ہے)

تو صحابہؓ کا اطوع الخلق (تمام مخلوق سے زیادہ اطاعت کرنے والے) ہونا اسی وجہ سے ہے کہ وہ عاشق تھے نرے مصلحت بین نہ تھے ان کی یہ حالت تھی ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چکار
کار ملک ست آنکہ تدبیر و تحمل بایدش

صحابہ کرام کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

محبت کی دو قسمیں ایک ضابطہ کی دوسری جوش کی ٢٠

(حاشیہ مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل اور تدبیر چاہیے)

ان کی اطاعت پر مصلحت بھی مرتب ہو جاتی تھی لیکن محبت اور اطاعت مصلحت پر مبنی نہ تھی اُن کی یہ حالت تھی کہ اگر مخالفت کرنا بھی چاہتے تو نہیں ہوسکتی تھی۔ صحابہؓ کی محبت کا اندازہ اِس سے کیجئے کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے پختہ مکان ڈاٹ دار کسی مصلحت سے بنا لیا کہ وہ مصلحت ضرورت کے درجے میں نہ تھی گو انھوں نے کسی درجے میں ضروری سمجھا ہو اتفاق سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گذر ایک مرتبہ اس طرف سے ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کس کا مکان ہے صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فلاں شخص کا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ نہیں فرمایا اور واپس تشریف لے آئے۔ جب صاحب مکان حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو انھوں نے سلام عرض کیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی طرف سے منہ پھیر لیا وہ دوسری ۲۱
طرف سے آئے آپ نے اُدھر سے بھی منہ پھیر لیا۔ اب تو ان کو بہت فکر ہوئی انھوں نے دوسرے صحابہ سے دریافت کیا تو اُنھوں نے کہا کہ کوئی خاص بات تو ہم کو معلوم نہیں ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مکان کی طرف تشریف لے گئے تھے اور تمہارے مکان کو دیکھ کر دریافت فرمایا تھا کہ یہ کس کا مکان ہے۔ ہم نے بتلا دیا تھا اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ فرمایا تو نہیں لیکن اُس وقت سے خاموش ہیں۔ دیکھیے اس حدیث میں کہیں تصریح نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکان کی بابت کچھ بھی فرمایا ہو اُس لئے صاحبِ مکان کے پاس اِس یقین کا کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کبیدگی کی وجہ یہ مکان ہی ہے۔ آجکل کی عقل کا تو جس کی نسبت کسی کا قول ہے ؎

آزمودم عقل دور اندیش را ۔۔۔ بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

عقل دور اندیش کو آزما لیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کر میں نے دیوانہ بنایا)

یہ فتویٰ ہوتا کہ پوچھ تو لیتے یہی وجہ ناراضی کی ہے یا کچھ اور ۔ اگر یہی تو خیر اس کو گرا دیں بلکہ آجکل تو اس پر بھی اکتفا نہ کیا جاتا بلکہ پوچھا جاتا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس میں خرابی کیا ہے یہ تو فلاں فلاں مصلحتوں پر مبنی ہے جیسا آجکل ورثۃ الانبیاء کے ساتھ ان کے احکام خداوندی پہونچانے کے وقت اور منکرات پر تنبیہ کرنے کے وقت معاملہ کیا جا رہا ہے تو صحابہ کرام بھی ایسا کرسکتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس حکم کے اسرار دریافت کرتے جیسا آجکل دریافت کئے جاتے ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تو اسرار کی اطلاع بھی تھی علمار کو تو اسرار کی خبر بھی نہیں یہ تو قانون کے عالم ہیں نہ کہ اسرار قانون کے عالم تو اس صورت میں علمار سے اسرار کا دریافت کرنا ہی غلطی ہے لیکن حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تو صاحبِ وحی ہیں آپ کو تو اگر بالفرض اسرار کی اطلاع نہ بھی ہوتی تو خدا تعالیٰ سے پوچھ کر بتلا دیتے لیکن اُن صحابی نے ان سب کو نظر انداز کرکے وجہ خفگی کی تعیین کی بھی تو ضرورت نہیں سمجھی بلکہ جس میں ذرا سا بھی احتمال سبب غضب ہونے کا ان کو ہوا اُس کو خاک میں ملا دیا یعنی اُسی وقت جاکر مکان کو زمین کے برابر کر دیا۔ شاید آجکل کے عقلاء اس حرکت کو خلاف عقل بتلا دیں کہ محض احتمال پر اتنا مال ضائع کر دیا لیکن اگر خلاف عقل ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گرانے پر ناخوش ہوتے ۔ غرض انھوں نے فوراً مکان گرا دیا اور پھر گرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع بھی نہیں کی بلکہ اپنی قسمت پر بھروسہ کرکے بیٹھ رہے کہ جس طرح حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتفاقاً دیکھ لیا تھا۔ اسی طرح میرے گرانے کی اطلاع بھی اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی میری قسمت میں ہے تو اتفاقاً حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو ہو جاویگی ۔ کیونکہ جانتے تھے کہ اطلاع تو جب کروں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر مکان گرانے کا احسان ہو یہ تو محض اپنی ہی بھلائی ہے قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ

(اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ رکھو بلکہ اللہ ہی تم پر احسان

رکھتا ہے کہ تم کو زیان کی ہدایت فرمائی اگر تم سمجھے ہو غرض حضور صلے اللہ علیہ آلہ وسلم کا پھر اس طرف جو گذر ہوا آپ نے فرمایا کہ وہ مکان کیا ہوا صحابہؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صاحبِ مکان کو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خفگی کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوراً ہی آکر مکان کو گرا دیا حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو سنکر بہت خوش ہوئے اور زیادتی تعمیر کی مذمت فرمائی۔ اب یہ دوسرا مسئلہ ہے کہ کتنی تعمیر ضروری ہے جو یہاں مذکور نہیں۔ تو صحابہ کرام کی محبت کا یہ عالم تھا اور اس محبت کا مقتضٰے یہ بھی ہے کہ صحابہؓ کی زلات بالکل معاف ہوں۔ دیکھئے اگر کسی جاں نثار خادم سے کبھی کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو اس کی پرواہ بھی نہیں کیا کرتے۔ ابھی حال ہی میں ایک واقعہ ہوا کہ ایک صاحب کے بدن میں ایک گہرا زخم ہو گیا تھا ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا کہ اِس زخم میں اگر کسی آدمی کا گوشت لیکر بھرا جائے تو یہ برابر ہو جائے۔ ان صاحب کا ایک

۲۳ نوکر اس وقت موجود تھا کہنے لگا کہ میری ران میں سے جس قدر گوشت کی ضرورت ہوے لیا جاوے۔ اب بتلایئے کہ اگر اس خادم سے کبھی کوئی سرسری لغزش ہو جاوے تو کیا وہ آقا اُس پر مواخذہ کریگا ہرگز نہیں۔ پس یہ ہی وجہ ہے کہ صحابہ پر طعن کرنا جائز نہیں۔ صاحبو! جو مشاجرات صحابہؓ سے منقول ہیں اور جتنی لغزشیں ہوئی ہیں اگر ان سے دس حصہ زیادہ ہوتیں وہ بھی معاف تھیں۔ غضب کی بات ہے کہ آپ اپنے کو قدر داں سمجھتے ہیں کہ وفادار جاں نثار کی لغزش کو قابل معافی سمجھتے ہیں اور خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو اتنا بھی قدرداں نہیں سمجھتے اسی سے ہم بلا تامل کہتے ہیں کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عُدُوْلٌ (صحابہ سب کے سب عادل ہیں) اور اس حدیث پر اعتماد رکھیں گے لَا یَمَسُّ النَّارُ مَنْ رَاٰنِیْ (جس شخص نے مجھ کو دیکھا اس کو آگ نہ چھوئے گی)، اور اگر صحابہ کے بعض افعال ذلت ہیں تو ہم ان کی نسبت کہیں گے

ے خونِ شہیداں را ز آب اولیٰ ترست — ایں خطا از صد ثواب اولیٰ ترست

صحابہ کی لغزشیں معاف ہیں

(شہید دل کا خون پانی سے اولیٰ تر ہے یہ خطا سو ثواب سے زیادہ بہتر ہے)

غرض صحابہؓ کی یہ شان تھی اور ان کی اس محبت کا علم اور اندازہ ان کفار کو بھی تھا چنانچہ جب حدیبیہ کی صلح ہوئی ہے اور علی سبیل التعاقب روسائے کفار مسلمانوں میں آئے ہیں تو ایک رئیس نے جا کر اپنی قوم سے کہا ہے کہ میں نے بڑے بڑے شاہانِ دنیا کا دربار دیکھا ہے۔ کسریٰ اور قیصر کے درباروں میں شریک ہوا ہوں مگر کسی کے حشم و خدم کو میں نے اتنا مطیع نہیں دیکھا جس قدر کہ اصحاب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مطیع ہیں یہ حالت ہے کہ اگر آپ تھوک پھینکتے ہیں تو وہ زمین پر نہیں گرتا اور جب وضو کرتے ہیں تو اس کا غسالہ لوگ اپنے ہاتھوں پر لیتے ہیں اور اگر کسی کو نہیں ملتا تو وہ دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مل کر اپنے منہ پر پھیر لیتا ہے گویا وہ حالت تھی ؎

مرا از زلف تو موئے بسندست ہوس را رہ مدہ بوئے بسندست

(یعنی اگر محبوب نہ ملے تو اس کا ایک بال ہی کافی ہے اگر بال بھی نہ ملے تو خوشبو ہی بہت ہے)

صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی جاں نثاری کا دور دور تک شہرہ

۲۴ صاحبو! بتلایئے یہ بھی کہیں قرآن میں یا حدیث میں حکم ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غسالہ وضو اپنے منہ پر ضرور ملا کرو واللہ اکبر۔ اِس وقت بہت سی جماعتیں صحابہؓ پر طعن کرتی ہیں مگر اُن کی اِس حالت کو نہیں دیکھتے بھلا نماز و روزہ وغیرہ کی بابت تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنت کے شوق میں کرتے تھے لیکن غسالہ وضو کا حکم وجوبی یا اِستحبابی کہیں آیت میں تھا کہ اس کو منہ پر مل لیا کرو تو فلاں فضیلت ملے گی اِس وقت تو واللہ بعضے ایسے مستقل مزاج ہیں کہ اگر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرتے دیکھتے تو کبھی حرکت بھی نہ ہوتی کیا اِس وقت سو میں ایک شخص بھی ایسا برتاؤ کر سکتا ہے جو صحابۂ کرام نے کیا بلکہ عجب نہیں کہ اِس فعل سے استنکاف کرتے صاحبو ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ اِس وقت میں پیدا ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں پیدا نہ ہوتے ورنہ ہمارا یہ استنکاف خدا جانے ہم کو کس حد میں داخل کرتا۔ اِس وقت جو ہم بہت سی باتوں میں فتویٰ کفر

ہمارا زمانہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہونا رحمت ہے

سے بچ جاتے ہیں تو اِس لئے کہ علماء تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ استنکاف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے امر سے نہیں بلکہ فلاں شخص سے ہے جس کے واسطے سے یہ امر اُس کو پہونچا ہے۔ نسبت اِلی الرسول صلے اللہ علیہ وسلم (رسول صلے اللہ علیہ وسلم کیطرف نسبت) میں شبہ ہونے سے یہ اعتراض کیا ہے اور اگر ہم اُس وقت ہوتے اور یہ حالت ہوتی تو ہمارے ان افعال پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کفر کا فتویٰ ہوتا تو یہ خدا تعالےٰ کی رحمت ہے کہ ایسے زمانہ میں پیدا ہوئے جس کی نسبت حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وہ زمانہ آویگا کہ دسواں حصہ بھی اگر کوئی عمل کریگا تو اُسکی نجات ہو جاوے گی مگر اُس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں پانچ وقت کی نماز فرض تھی تو اب نصف وقت کی نماز کافی ہوگی۔ یعنی اگر فرض و وتر کا مجموعہ بیس رکعتیں ہوں تو دو رکعتیں کافی ہو جاویں۔ چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا اِس لئے میں اس حدیث کی توضیح کرتا ہوں کہ یہ تخفیف کیفیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کمیت کے اعتبار سے یعنی اعمال میں جو خلوص اُس وقت تھا اگر اِس وقت تو حصہ کم بھی ہو تو نجات ہو جائے گی۔ تو یہ خدا تعالیٰ کی بڑی رحمت ہم پر ہے کہ ہم زمانہ تخفیف میں پیدا ہوئے۔ یہ تو تخفیف کا بیان ہے اور تاویل کی مثال یہ ہے کہ مثلاً بیوہ کا نکاح ثانی ہے کہ اس سے عام طور پر قلوب میں تنگی ہے یعنی جیسا اوّل مرتبہ دل ہوتا ہے دوسری مرتبہ نکاح کرنے میں اُتنا دل کھلا ہوا نہیں ہوتا۔ آگے یہ دیکھ لیجئے کہ خداوند تعالیٰ اِسی تنگی کی نسبت کیا فرماتے ہیں فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۝ (آپ کے رب کی قسم ہے یہ لوگ مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ آپ کو اپنے جھگڑوں میں حکم نہ بنا دیں جو آپ فیصلہ فرما دیں اس پر اپنے دلوں میں تنگی نہ پاویں اور پوری طرح تسلیم کرلیں)، تو اس پر کیا فتویٰ ہوتا مگر اس وقت ہم ان لوگوں کی اِس تنگی کی یہ تاویل کر لیتے ہیں کہ یہ حکم شرعی سے استنکاف

نہیں ہے بلکہ عرف کی وجہ سے طبعی شرم آتی ہے لیکن اگر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو فرما دیتے کہ نکاح ثانی کرو اور اس کے قلب میں اس سے تنگی پیدا ہوتی تو اُس وقت کیا بچاؤ ہوتا کیونکہ خطاب خاص خود دلیل ہوتی بطلان عذر کے لئے اور اس کے لئے نظیر موجود ہے کہ حضرت زینبؓ کا نکاح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زیدؓ سے کرنا چاہا اور حضرت زینبؓ بوجہ عالی خاندان ہونے کے ذرا رکتی تھیں اور اسی طرح ان کے بھائی بھی۔ فوراً یہ آیت نازل ہوئی مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ ؕ (کسی مومن اور مومنہ کو شایاں نہیں کہ جب اللہ (تعالیٰ) ورسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کسی امر کا فیصلہ فرما دیں تو (اُس امر میں) اُن کو اختیار رہے) حالانکہ یہ ایک دنیا کا معاملہ تھا لیکن اس میں بھی حکم رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے سامنے چون و چرا کرنے کی اجازت نہیں ہوئی تو معلوم ہوا کہ آپ خواہ دنیا کا کام بتلاویں یا دین کا کام بتلاویں مگر جس کو فیصل کرکے فرما دیں اس سے انکار کفر ہے[1] تو اس وقت اگر ہم انکار کرتے تو فوراً کافر ہوجاتے اور اس وقت تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ مولویوں کے طرز بیان سے اِستنکاف ہے نہ کہ حکم شریعت سے تو ہمارے لئے اُس زمانہ سے بعید ہونا ہی رحمت ہوا۔ یہ صحابہؓ ہی کا حوصلہ تھا کہ اُنھوں نے اپنا مال اپنی جان اپنی اولاد گھر بار اپنے مصالح سب آپ کے سپرد کر دیئے تھے یہ حالت تھی کہ میں نے ایک مقام پر دیکھا ہے مگر اس وقت یاد نہیں کہ ایک شخص[2] ایک عورت سے نکاح کرنا چاہتے تھے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے اس کو دیکھ بھی لیا ہے مقصود یہ تھا کہ کسی تدبیر سے ایک مرتبہ اس کو دیکھ لو۔ یہ مطلب نہ تھا کہ جا کر اس عورت کے ماں باپ کو پیغام دو کہ مجھے اپنی لڑکی دکھلا دیں مگر وہ ایسے بھولے بھالے تھے کہ جا کر اُس عورت کے ماں باپ کو پیغام دیا کہ مجھے اپنی اپنی لڑکی دکھلا دو۔ اس لڑکی کے ماں باپ کو یہ بات ناگوار ہوئی۔ اُنھوں

۲۶

ف ۱ امر نبوی صلے اللہ علیہ وسلم سو جبکہ اس کا امر نبوی صلے اللہ علیہ وسلم ہونا یقینی ہو انکار کفر ہے

ف ۲ صحابہؓ کی اطاعت اور انقیاد کی ایک عجیب حکایت

کچھ کہنا چاہا۔ پس پردہ لڑکی بھی موجود تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سنکر خود ابر دہ ہٹا دیا اور اپنے ماں باپ سے کہا کہ خبردار حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کے بعد کچھ نہ بولنا اور اس شخص سے کہا کہ جب حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا ہے تو میں حاضر ہوں تم مجھے دیکھ لو۔ صاحبو! یہ محبّت کا خاصہ ہے کہ اس میں مصالح اور ننگ وعار سب بالائے طاق رکھے جاتے ہیں فرماتے ہیں ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　اے دوائے جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق خدا تجھ کو خوش رکھے تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہوجاتے ہیں اور تجھ سے تمام امراض کا علاج ہوجاتا ہے تجھ سے نخوت و ناموس کا دفعیہ ہوجاتا ہے تو ہمارے لئے مثل افلاطون اور جالینوس کے ہی)

کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ اے دوائے نخوت و ناموس ما۔ صاحبو! یہ حالت تھی کہ کثرت سے صحابیات نے مختلف اوقات میں آکر حضور میں ۲۷
عرض کیا کہ آپ ہم کو قبول فرمالیجئے اور اپنی کنیزی میں لے لیجئے اور آپ نے فرما دیا کہ مجھے ضرورت نہیں ہے پھر کیا اس فعل پر ان کی مذمت کی گئی ہرگز نہیں۔ ان کی جو قدر کی گئی اُس کو بھی سُن لیجئے۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی نے ایک مرتبہ ایسے ہی واقعہ پر یہ کہہ دیا کہ مَا اَقَلَّ حَیَاءَهَا (کیسی بے شرم ہے) حضرت انس رضی اللہ تعالےٰ عنہ بگڑ گئے اور فرمایا کہ وہ تجھ سے ہزار درجہ اچھی تھی کہ اپنے کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتی تھی۔ اور یہی راز ہے کہ غیر صحابی خواہ کتنا ہی بڑا ہو جاوے لیکن صحابی کے برابر نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی بابت پوچھا گیا تو فرمایا کہ اگر معاویہؓ گھوڑے پر سوار ہوں اور اُس کے پیروں کی گرد اڑ کر اُس گھوڑے کی ناک پر جا بیٹھے تو حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی وہ ناک کی گرد عمرو

بن عبدالعزیزؒ اور اویس قرنیؒ سے افضل ہے۔ ہم کو اس فتوے کی قدر نہیں ہو
مگر اہلِ محبت جانتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظمؒ نے کیا بات فرمائی۔ قدرِ گوہر
شاہ داند یا بداند جوہری (گوہر کی قدر بادشاہ جانتا ہو یا جوہری جانتا ہے)، تو صحابہؓ میں بڑی
بات یہ تھی کہ وہ حضرات پورے عاشق تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے
علمی عملی وہ اصلاح کی کہ نہ کوئی فلسفی اپنی قوم کی کر سکا اور نہ کوئی سلطان
اپنی رعایا کی کر سکا کیونکہ ان کے پاس تو نور ہی دوسرا تھا جس کو فرماتے ہیں
اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِى النَّاسِ (کیا جو مردہ ہو پس اس کو
ہم زندگی بخشیں اور اس کے لئے ہم ایک نور کر دیں کہ وہ اس کو لوگوں میں لئے پھرتا ہے) اس کو نور سے
تعبیر کیجئے یا برکت صحبت کہئے سب کا خلاصہ ایک ہی ہے ؎

عِبَارَاتُنَا شَتّٰى وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ ۔۔۔ وَكُلٌّ اِلٰى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(ہمارے عنوانات بیان مختلف ہیں مگر تیرا حسن ایک ہی ہے ہر عنوان اسی حسن کی طرف اشارہ کرتا ہے)

صحابہ کے ساتھ محبت مثل صحبت کے مفید ہے

۲۸ اگر ہم بھی اس مقام پر پہنچنا چاہیں جس پر صحابہ تھے (یعنی باعتبار عطا کے
کیونکہ وہ جاہ تو ہم کو کہاں نصیب) تو صورت یہ ہو کہ ہم اُن سے وابستگی
اطاعت کی پیدا کرلیں کہ اس کی بدولت انہی کے ساتھ ساتھ لگے چلے جاویں
جیسے ایک انجن پشاور سے چلے اور کلکتہ پہونچے اور ایک ٹوٹی ہوئی گاڑی
بھی کلکتہ پہونچنے کی متمنّی ہو تو اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ اس انجن
کے ساتھ اپنی زنجیر ملا دے۔ تو اب ہمارا بھی یہی کام ہونا چاہئے کہ ہم صحابہؓ
کے ساتھ تعلق پیدا کریں۔ خیر یہ سب جملِ معترضہ تھے۔ مقصود یہ تھا کہ صحابہؓ
کی محبت کا یہ عالم تھا۔ اور کفار کو بھی اِس کا علم تھا اِس لئے اُن کا مقصود
یہ تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے ان میں جدائی ہی ڈالدیں تو یہ رنگ لاتے
مگر دوستی کے پیرایہ میں ؎

رجوع بمقصود بیان

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت ۔۔۔ دام داں گرچہ ز دانہ گویدت
زانکہ صیاد آورد بانگِ صفیر ۔۔۔ تا کہ گیرد مرغ را آں مرغ گیر

(دشمن اگرچہ کوئی بات دوستانہ طریق پر تم سے کہے مگر تم اس کو دھوکہ ہی سمجھو کیونکہ شکاری جانوروں کو پکڑنے کے لئے ان ہی جیسی آوازیں نکالا کرتا ہے)

بدخواہوں کا ہمیشہ قاعدہ ہے کہ برنگِ خیر خواہی بدخواہی کیا کرتے ہیں دنیا میں بہت لوگوں نے مسلمانوں سے ایسا کیا ہے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی ان کفار نے یہی معاملہ کیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فراست عجیب تھی لیکن اس احتمال سے کہ شاید یہ اسی طرح ایمان لے آویں اس شرط کو منظور فرمالیا رہا صحابہ کے رنج کا خیال تو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ صحابہؓ تو اپنے ہیں ان کو تو اگر ساری عمر کے لئے بھی الگ کردیں تب بھی الگ ہوجاویں گے کیونکہ وہ تو طالب رضا ہیں اُن کی تو وہ حالت ہے کہ ؎

أُرِيْدُ وِصَالَه وَيُرِيْدُ هِجْرِىْ　　　فَأَتْرُكُ مَا أُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

۲۹ (میں اس کے وصال کا خواہشمند ہوں اور وہ فراق چاہتا ہے تو اسکی خواہش کی خاطر میں اپنی خواہش چھوڑ دیتا ہوں)

فرماتے ہیں ؎

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　　کہ حیف باشد از غیر او تمنائے

(کیا وصال اور کس کا فراق رضائے محبوب کی تمنا ہونی چاہیے اس سے غیر اس کی تمنا کے افسوس ہوگا)

کس کا فراق اور کس کا وصال رضا کی تمنا ہونی چاہیئے اور یہاں سے ایک اور جملہ مفیدہ یاد آگیا کہ جب عاشق پر رضائے محبوب کا اتباع ضروری ہے نیز یہ بھی معلوم ہوگیا کہ صحابہ عاجل مصلحت پر نظر نہ کرتے تھے گو مصلحت اس پر مرتب ہوجائے تو اس سے یہ بھی ثابت ہوگیا کہ احکام شرعیہ میں گو مصلحت ہو مگر اطاعت اس پر موقوف نہ ہونا چاہیئے بلکہ اطاعت محض رضا کے لئے ہو۔ دیکھئے اگر کسی عورت سے عشق ہوجاوے اور وہ حکم کرے کہ میں جب ملوں گی کہ جب تم پائجامہ چڑھا کر سر پہ ٹوکرا رکھ کر جوتے نکال کر فلاں جگہ سے فلاں جگہ تک دس چکر لگاؤ تو یہ ہرگز نہ پوچھے گا کہ اس میں

کیا مصلحت ہے ؎ رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار۔ الخ (عاشق کو مصلحت بینی سے کیا کام) اگر عاشق ہے تو بیس دفعہ کر دکھائے گا۔ کہاں کی تہذیب اور کس کی عار۔ وہ اس تہذیب کو تعذیب سمجھے گا کیونکہ مانع وصال یار ہے ایسے وقت پر تو مصلحت بینی اُس شخص کا کام ہے جو فارغ عن المحبّت ہو اور میں یہ نہیں کہتا کہ احکام شرعیہ میں حکمتیں نہیں ہیں۔ حکمتیں ضرور ہیں مگر اوّل تو ہم کو ان کا احاطہ نہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کے درک کا طریقہ نہیں جو اختیار کیا گیا ہے۔ بلکہ وہ محض موہوب ہیں جن کا اکثر ترتب تقویٰ پر ہوا ہے۔ ذرا تاریخ میں دیکھئے کہ اُمت میں جو بڑے بڑے لوگ جیسے شاہ ولی اللہؒ ابن العربیؒ عبدالکریم جیلیؒ وغیرہ گذرے ہیں اور انھوں نے حکم و اسرار شریعت کے لکھے ہیں تو کیا انھوں نے ان اسرار کو کسی مدرسہ میں سیکھا تھا یا کسی مناظرہ سے حاصل کیا تھا ہرگز نہیں مگر بات کیا تھی کہ مدرسہ سے نکل کر علم پر عمل
۳۰ کرنا شروع کر دیا۔ خلوص اختیار کیا اس سے اُن کے قلب میں ایک نور پیدا ہوا جس کی بدولت ان کو سب کچھ منکشف ہو گیا۔ اسی کو کہتے ہیں ؎

بینی اندر خود علوم انبیار　　بے کتاب و بے معید و اوستا

(تم کو بے معین اور بغیر استاد و کتاب کے انبیار جیسے علوم حاصل ہوں گے۔)

تو اگر اسرار معلوم ہونے کا کوئی طریقہ ہے تو یہ ہے لیکن اس پر بھی طالب حق کو اسرار کی ہوس نہ ہونا چاہئے۔ اِس لئے کہ یہ محبت کے خلاف ہے۔ جب ایک مردار کا عاشق اس کی فرمائش کا راز دریافت نہیں کرتا اور خواہ بعد میں یہی معلوم ہو کہ اس میں خاک بھی مصلحت نہ تھی۔ مگر اطاعت میں کس طرح دوڑتا ہے تو طالب حق اور عاشق خدا کو ایسی کاوش کب زیبا ہے۔ غرض ایسی کاوش طریق محبت کے بالکل خلاف ہے۔ طریق عشق تو اطاعت میں دیوانہ ہونا ہے کہ ؎ اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد (وہی دیوانہ ہے جو دیوانہ نہ ہوا تھا جیسے) اگر آپ اس کے نظائر دنیا میں دیکھتے تو معلوم ہو آپ سے

احکام شرعیہ میں حکمتیں ہیں مگر ان کے علوم کا طریقہ اکثر تقویٰ پر ہے

ہرگز یہ خطاب نہ کرتا لیکن جبکہ آپ محبوبانِ مجازی کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے ہیں کہ ان کے ہر حکم کو بغیر دریافت اسرار پورا بجالاتے ہیں نیز حکام مجاز کے ساتھ بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے کہ اگر صاحب کلکٹر آپ سے یہ کہے کہ ہم کو آج رات کے وقت دو بجے فلاں مقام پر تم سے فلاں امر میں مشورہ کرنا ہے جس کو ہم پرسوں انجام دیں گے تو آپ کے دل میں کبھی یہ وسوسہ بھی نہ آویگا کہ جب پرسوں اس کام کو کیا جاویگا تو کل دن میں بھی تو اُس کی بابت مشورہ ہوسکتا ہے پھر رات کو مجھے بیچین کرنے سے کیا فائدہ ۔ اور اگر وسوسہ آویگا بھی تو آپ اس کو دفع کریں گے کہ خواہ کوئی مصلحت ہو یا نہ ہو ہمیں تو ان کی رضا مندی مقصود ہے تو جب اہل محبت اور اہل حکومت کے ساتھ آپ کا یہ برتاؤ ہے تو خدا تعالیٰ کے ساتھ کیوں نہیں ہے کیا خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی تحقیقات مصالح کی مشق کے لیے تم کو ملے ہیں اور اگر دونوں موقعوں میں کوئی فرق ہے تو ۳۱
بتلایئے اور فرق نہیں تو پھر یہاں لِمَ كَانَ كَذَا اور كَيْفَ كَانَ كَذَا (یہ کیوں ہوا اور کیسے ہوا) کیوں ہے بلکہ خدا تعالیٰ تو محبوب بھی ہیں اور حاکم بھی تو یہاں تو بدرجہ اولیٰ یہ حالت ہونی چاہیئے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی رضائے تو ‏ ‏ ‏ جان شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

(آپ اگر زندگی بخشیں تو زہے نصیب اور موت دیدیں تو زہے قسمت جب دل آپکا عاشق ہو گیا تو پھر آپ جو چاہیں کریں)

؎ زبان تازہ کردن باقرار تو ‏ ‏ ‏ نینگیختن علت از کار تو

(آپ کی ربوبیت کا اقرار کرنا آپ کے کاموں میں علتیں نکالنے کو مانع ہے)

کیا معنے چون وچرا کے اور ہمارا حق ہی کیا ہے ہم کو نسبت ہی کیا ہے کہ ہم چون وچرا کریں ہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ مخالفان اسلام کا منہ بند کرنے کے لیے ہم اسرار پوچھتے ہیں اور اُن کا منہ بند کرنا ضروری تو ہم کو اسرار بتلانا بھی ضروری ۔ لیکن اگر میں مخالفین کے لئے اس سے اچھا جواب آپ کو بتلا دوں

اور آپ کے اِس جواب کا مخدوش ہونا ثابت کر دوں پھر تو یقیناً اِس شبہ کی گنجائش نہ رہے گی اس کا بیان یہ ہے کہ مسلمان دو قسم کے ہیں ایک اہلِ علم دوسرے عوام تو اگر آپ عوام میں سے ہیں تب تو سیدھی بات یہ ہے کہ معترض کو عالم کا نام بتلا دیجئے کہ ان سے پوچھو ہم زیادہ نہیں جانتے اور اگر اہلِ علم میں سے ہیں یا وہ آپ کو ذی علم سمجھتا ہے تو اس کے لئے دوسرا جواب ہے وہ یہ کہ آپ یوں کہئے کہ احکام قوانین ہیں اُن کے اسرار اسرار قوانین ہیں اور ہم قانون کے جاننے والے ہیں اسرار قانون ہم نہیں جانتے نہ ان کا بتلانا ہمارے ذمہ واجب ہے۔ دیکھئے اگر صاحب جج کسی مقدمہ میں ڈگری دیدیں تو مدعا علیہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس قانون کی رو سے آپنے ڈگری دی ہے میں اس قانون کو تو مانتا ہوں لیکن مجھ کو خود اِس میں یہ کلام ہے کہ یہ قانون مصلحت کے خلاف ہے اس لئے آپ اس کا راز بتلا دیں اور اگر وہ ایسا کہے بھی تو اس کو توہین عدالت اور جرم سمجھا جاویگا اور اس پر صاحب جج کو حق ہوگا کہ توہین عدالت کا اُس پر مقدمہ کرے اور اگر مقدمہ بھی قائم نہ کیا تو اتنا تو ضرور کریگا کہ کان پکڑ کر اس کو عدالت سے باہر کر دیگا۔ اور اگر اُس وقت اس کی طبیعت میں حکومت کے بجائے حکمت غالب ہوئی تو یہ جواب دیگا کہ ہم عالمِ قانون ہیں واضع قانون نہیں مصالح واضع سے پوچھو۔ تو کیا کسی عقلمند کے نزدیک یہ جواب نامعقول جواب ہے یا بالکل عقل کے موافق۔ اگر عقل کے موافق ہے تو آپ مولوی بن کر یہ جواب کیوں نہیں دیتے کہ ہم عالمِ قانون ہیں واضع قانون خدا تعالےٰ ہے مصالح ان سے پوچھ لینا۔ وہ جواب دیں گے خواہ اسرار بتلانے سے خواہ دماغ کی اصلاح کرنے سے اور یہ فروع اسلام کے متعلق جواب ہے۔ البتہ اگر مخالف اسلام کو نفس اسلام کی حقانیت تحقیق کرنا منظور ہے تو اُصولِ اسلام میں عقلی گفتگو کریں ان میں ہم یہ مذکور جواب نہ دیں گے بلکہ ۳۲

اس کی حقانیت کے دلائل عقلیہ بتلائیں گے خواہ دس برس تک ہم سے کوئی پوچھے جائے اور اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی شخص سلطنت سے باغی ہو جائے اور بادشاہ کو بادشاہ نہ مانتا ہو اور آپ اسے منوانا چاہیں اور وہ اس کے ماننے کے لئے یہ طریق اختیار کرے کہ آپ سے ہر قانون کی مصلحت دریافت کرے تو آپ ہرگز اس کو یہ راہ نہ دیں گے اور اس کو ایک تطویل لاطائل سمجھیں گے اور اس شغل کو فضول قرار دیں گے البتہ یہ کریں گے کہ بدلائل بادشاہ کو بادشاہ ثابت کریں گے اور قانون کو اُس کا قانون ثابت کریں گے پھر جس قانون کی نسبت وہ دریافت کریگا اور اُس کی مصلحت پوچھے گا آپ اس کے جواب میں یہی کہیں گے کہ ہم اسکی مصلحت نہیں جانتے۔ وہ بادشاہ ہے اور یہ اُس کا قانون ہے اور بادشاہ کا قانون واجب العمل ہوتا ہے پس یہ بھی واجب العمل ہے۔ بعینہ یہی تقریر خدا تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کے احکام میں بھی جاری کریں گے کہ دلائل عقلیہ سے ایک اُن کا صادق ہونا دوسرا ان احکام کا اُن کیطرف منسوب ہونا ثابت کر دیں گے۔ اور فروع میں اتنا ہی کہدیں گے کہ صادق کے احکام ہیں اور ایسے احکام واجب الامتثال ہیں۔ دوسری نظیر لیجئے حکیم عبدالمجید خاں کا حکیم ہونا تو محتاج دلیل ہے لیکن ان کے حکیم مان لینے کے بعد کسی مریض کو یہ اختیار نہیں کہ اُن کی تجویز کردہ اوزان ادویہ میں چون و چرا کرے اور اس کی لِم اُن سے دریافت کرے۔ پس جب دنیاوی معاملات میں یہ امر مسلّم ہے تو شریعت کے احکام میں کیوں چون و چرا کیا جاتا ہے۔ صاحبو! یہ نہ سمجھیں کہ مولوی احکام کے مصالح نہیں جانتے۔ ان کے پاس سب کچھ ذخیرہ موجود ہے لیکن ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبری نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز آشکارا ہو جائے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی ایسی خبر نہیں کہ معلوم نہ ہو)

میرے پاس اگر کوئی دو برس رہے تو میں انشاء اللہ تعالیٰ ثابت کر دوں گا کہ
ہر حکم شریعت میں حکم عقلیہ ہیں مگر ہم اُن کو علوم عظمیہ نہیں سمجھتے کیونکہ وہ سب
ظنی ہیں۔ لوگوں نے بہت سے حکم لکھے ہیں اور اب بھی الہام سے ہوتے ہیں مگر
یہ سب علوم ظنیہ ہیں اِس لئے علماء اس میں مشغول نہیں ہوتے۔ دوسرے اس
میں یہ بھی خرابی ہے کہ اگر کبھی وہ ظنیت کے سبب مخدوش ہوگئے اور حکم بزعم
سامع اسی پر مبنی تھا تو اُس کے منہدم ہو جانے سے حکم شریعت بھی منہدم ہو
جاویگا۔ لہٰذا بیان اسرار سے جواب دینا بے غبار رستہ نہیں صاف جواب
یہی دینا چاہیئے کہ ہم اسرار نہیں جانتے قیامت میں خدا تعالیٰ اور رسول اللہ
صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھ لینا۔ دیکھو اگر ابھی ایک منادی کرنے والا
منادی کرے کہ صاحب کلکٹر کا یہ حکم ہے تو کوئی بھی اس سے گلخپ ہوتا ہے کہ
حکمت اس حکم کی بیان کرو ورنہ نری منادی تعصب ہے۔ پس ہم کہیں گے کہ
۲ جب منادی کرنے والے سے گلخپ ہوگے اور اُس کو اُس منادی کے مصالح
بتلانے پر مجبور کروگے تو ہم بھی بتلا دیں گے۔ غرض حِکَم (حکمتیں) و اسرار کا علم ہم کو بھی
الحمدللہ ہم جانتے ہیں لیکن وہ ظنی ہیں۔ علم قطعی یہ ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کا حکم ہے
اور خدا تعالیٰ کا حکم قطعی ہے لہٰذا یہ قطعی۔ بس یہ ہے علم قطعی۔ مگر بات یہ
ہے کہ قطعی علم میں مزا نہیں ہوتا اور اختراعیات میں لذت ہوتی ہے۔ یہ
ہے اِس مرض کی اصل وجہ۔ اِس پر مجھے حکایت یاد آئی کہ میں شاہجہانپور
سے سفر کر رہا تھا۔ ایک جنٹلمین گاڑی میں بیٹھے تھے ایک اِسٹیشن پر ان کے
خادم نے آکر اطلاع دی کہ حضور وہ تو سنبھلتا نہیں کہنے لگے کہ یہاں پہونچا
دو۔ یہ سُنکر مجھے تعجب ہوا کہ وہ کون چیز ان کے ساتھ ہوگی جو خادم سے
نہیں سنبھل سکی اور اب یہ گاڑی میں منگا کر اس کو سنبھال لیں گے آخر
چند منٹ بعد دیکھا کہ خادم صاحب ایک بہت بڑے اونچے کتے کو زنجیر
میں باندھے ہوئے لا رہے ہیں اور وہ کتا زور کر رہا ہے۔ آخر وہ اُن کے

احکام شرعیہ کو علوم ظنیہ پر مبنی کرنے کی خرابی

ایک جنٹلمین اور اس کے سوال کا جواب

سپرد کیا گیا۔ اُنھوں نے ریل کی آہنی سلاخوں سے اس زنجیر کو باندھ دیا اُس کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ جناب! کُتّے کا پالنا کیوں حرام ہوا۔ باوجودیکہ اِس میں فلاں وصف ہے اور فلاں وصف ہے کتے میں۔ انھوں نے اتنے وصف بیان کئے کہ شاید ان میں بھی نہ ہوں۔ میں سب سُنتا رہا۔ جب وہ کہہ چکے تو میں نے کہا کہ جناب میں نے سُن لیا اِس کے دو جواب ہیں ایک عام کہ وہ اِس کے علاوہ اور بھی بہت سے شبہات کا جواب ہے اور ایک خاص کہ وہ خاص اسی کے متعلق ہے کونسا عرض کروں فرمانے لگے دونوں کہہ دیجئے۔ میں نے کہا جواب عام تو یہ ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے پالنے کی ممانعت فرمائی ہے اور یہ جواب عام اِس لئے ہے کہ قیامت تک کے لئے شبہات کا جواب ہے البتہ اِس میں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ آپ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے دوسرے یہ کہ
۳ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے اگر ان میں کلام ہو تو ثابت کروں کہنے لگے کہ یہ تو ایمان ہے یہ تو عام جواب تھا اور یہ علمی اور حقیقی جواب تھا لیکن ان کو اس کی قدر نہ ہوئی اور کچھ حظ نہ آیا۔ کہنے لگے کہ جناب اور جواب خاص کیا ہے میں نے کہا کہ وہ یہ ہے کہ کُتّے میں جس قدر اوصاف آپ نے بیان کئے واقعی وہ سب ہیں لیکن باوجود ان اوصاف کے اس میں ایک عیب اتنا بڑا ہے کہ اس نے تمام اوصاف کو خاک میں ملا دیا وہ یہ کہ اِس میں قومی ہمدردی نہیں ہوتی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک کتّا دوسرے کتے کو دیکھ کر کس قدر از خود رفتہ ہو جاتا ہے۔ اِس جواب کو سُنکر وہ بہت ہی محظوظ ہوئے اور وہ اس کو جواب قطعی سمجھے۔ حالانکہ یہ محض ایک محض نکتہ ہے۔ مجھے تو خبر نہ تھی کہ یہ کون ہیں اتفاق سے جب میں اٹاوہ سے بریلی آیا تو مولوی ظہور الاسلام صاحب تحصیلدار کہنے لگے کہ آپ سے اِس قسم کی گفتگو کسی سے ہوئی تھی۔ میں نے کہا کہ ہوئی تو تھی فرمانے لگے کہ

علیگڑھ کالج کے طالب علم اِس جواب کا تذکرہ کر رہے تھے اور اِس جواب سے بہت خوش تھے۔ مجھ کو اِس سے گمان ہوا کہ شاید وہاں کے تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے اِس کو اس لئے ذکر کیا ہے کہ میں یہ بتلا دوں کہ جس جواب پر وہ اِس قدر خوش تھے علاوہ فضول ہونے کے میری نظر میں اس کی کچھ بھی وقعت نہ تھی اور میں اس کو جواب ہی نہیں سمجھتا تھا۔ غرض علت اور حکمت کا دریافت کرنا عشق و محبت کے بھی بالکل خلاف ہے جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ہاں اگر یہ کہو کہ ہم عاشق ہی نہیں تو دوسری بات ہے لیکن خدا تعالےٰ اس کی بھی نفی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ (اور مومنین اللہ تعالےٰ کی محبت میں زیادہ شدید ہیں) شدت ہی کو عشق کہتے ہیں

اشد حُبّاً سے مراد عشق ہے

عشق چونکہ پامال لفظ تھا اس لئے قرآن و حدیث میں اِس کو کہیں استعمال نہیں کیا گیا۔ اور اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ

۴ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہ میں عشق کا لفظ استعمال کرنا بے ادبی ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص وائسرائے کی تعریف کرنے لگے اور یہ کہے کہ اُن کو کنسٹبل کے اختیارات بھی حاصل ہیں تو اگرچہ واقع کے اعتبار سے یہ صحیح ہے لیکن یہ مدح سخت ہجو اور بے ادبی ہی بلکہ بعض اوقات بعض ایسے امر کی نفی بھی موہم نقص ہوجاتی ہے ؎

قرآن و حدیث میں عشق کا لفظ نہ آنے کی وجہ

شاہ را گویدکسے جولاہہ نیست ایں نہ مداح است او مگر آگاہ نیست

(بادشاہ کو کوئی شخص کہے کہ وہ جولاہہ نہیں یہ اس کی تعریف نہیں ہو بلکہ وہ بادشاہ کے مرتبہ سے واقف نہیں ہے)

تو جس کی نفی بھی مدح نہ ہو اس کا اثبات تو کیسے مدح ہوجاویگا وہ تو اور بھی زیادہ قدح ہوگا تو لفظ عشق کو خدا تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نہ استعمال کرنا چاہئے۔ قرآن و حدیث میں بھی اس کو استعمال نہیں کیا گیا ہے ہاں شدتِ حُب کا لفظ آیا ہے تو جب خدا تعالےٰ ہی فرما چکے ہیں کہ تم عاشق ہو تو عشق سے انکار کیسے کر سکتے ہو۔ پس عاشق کا

مذہب اختیار کرو۔ خوب کہا ہے ؎

یا مکن با پیلبانان دوستی یا بنا کن خانہ بر انداز پیل

(یا تو ہاتھی والوں سے دوستی نہ کرو ورنہ اپنا گھر اتنا بڑا بنواؤ کہ اس میں ہاتھی آسکے)

یا مکش بر چہرہ نیل عاشقی یا فرو شو جامہ تقویٰ بہ نیل

(یا تو چہرہ پر عاشقی مت گداؤ یا جامہ تقوے کو نیل سے دھو ڈالو)

الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ زبردستی کھینچکر ہم کو عاشقین میں داخل کیا گیا ہے۔ گویا ہماری وہ حالت ہے کہ ہم بھاگتے ہیں اور ہم کو پکڑ پکڑ کر بلایا جاتا ہے کہ تم تو ہمارے ہو تم کہاں چلے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے بہت تعجب کرتے ہیں یعنی خوش ہوتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑ کر جنت میں داخل کئے جاتے ہیں۔ سو صحابہ کرام کا انداز بھی عشق تھا جیسا اوپر مذکور ہوا وہی تم بھی اختیار کرو۔ اور اس کے برکات میں سے ایک
5 یہ بھی ہے کہ ممکن ہے کہ تم کو وہ علوم بھی عطا ہو جاویں جن کے تم طالب ہو یعنی اسرار۔ دیکھو اگر کوئی بادشاہ سے کہے کہ ہم کو اپنا خزانہ دکھلاؤ تو اس کو گستاخ سمجھا جاویگا۔ البتہ اگر خزانہ دیکھنے کی تمنا ہے تو اس کی اطاعت کرو اس سے بے تکلفی پیدا کرو پھر ممکن ہے کہ ایک دن ہو کہ ایسی عنایت بادشاہ تم کو خود ہی خزانہ پر لیجا کر کھڑا کر دے۔ خوب کہا ہے ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم و خاطر تیز کرنا یہ حق تک پہونچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے بجز شکستہ لوگوں کے فضل خداوندی کسیکو قبول نہیں کرتا)

یعنی بدوں شکستگی اور پستی کے کچھ نہیں ہوتا۔ اور پستی ہی میں یہ اثر ہے ؎

(بقیہ حاشیہ ص۱۲۲) کیسے دیگی جواب یہ ہے کہ عشق تو سب میں ہے مگر عوارض میں مستور ہے۔ چنانچہ محرک کے ورود پر ہر شخص میں اس کا ظہور ہوتا ہے پس جس وقت وہ مستور ہوتا ہے اس وقت لِمَ اور کَیف (کسلئے اور کیسے) بھی سوجھتا ہے لیکن مقصود مقام کا یہ ہے کہ ان محرکات کو کہ ان میں تفکر بھی کام میں لاؤ اور آثار سے متلون ہو کر ان آثار میں سے لِمَ اور کیف کا قطع ہونا بھی ہو ۱۲ منہ

ہر کجا پستی است آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

(جس جگہ نیچان ہوتا ہے پانی وہیں مرتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے)

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جس جگہ بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں رنج ہوتا ہو وہاں شفا پہونچتی ہے)

سالہا تو سنگ بودی دلخراش آزموں را یک زمانے خاک باش

(تم نے برسوں پتھر کی طرح سخت رہ کر دیکھ لیا اب ذرا آزمانے ہی کو کچھ دن خاک ہو کر دیکھ لو)

در بہاراں کے شود سرسبز سنگ خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

(موسم بہار میں پتھر کب سرسبز ہوتے ہیں خاک ہو جاؤ تو رنگ برنگ کے پھول اُگیں گے)

خلاصہ یہ ہے کہ تفویض و تسلیم سے کام چلتا ہے اور بالکل خاک میں رل جانے سے۔ اور جس کو یہ دولت ملی ہے اسی طرح ملی ہے۔ اور جو ساری عمر قیل و قال میں رہے تو کچھ بھی نہیں ہوا۔ پس پہلا طریقہ محمود اور ہدایت
4 اور دوسرا طریقہ مذموم اور ضلالت ہے ھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ ہم نے دونوں رستے دکھلا دیئے اب جس کا جدھر جی چاہے چلا جاوے۔ مضمون بہت بڑھ گیا مقصود یہ ہے کہ صحابہؓ کو ایسی محبت تھی کہ اگر آپ فرماتے کہ ساری عمر ہم کو نہ دیکھو تو وہ ایسا ہی کرتے چنانچہ دو واقعے ہوئے بھی۔ ایک اویس قرنیؒ کا کہ انھوں نے باوجود شدت اشتیاق زیارت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم شرعی سنکر کہ والدہ کی خدمت نہ چھوڑنا تمام عمر زیارت نہیں کی مجھے تعجب ہے ان لوگوں پر کہ جو زیارت فی المنام (سونے میں زیارت) کی تمنا کرتے ہیں اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت احکام میں نہیں کرتے حالانکہ زیارت فی المنام (خواب میں زیارت) موخر ہے رتبہ میں زیارت فی الیقظ (بیداری میں زیارت) سے تو حضرت اویسؒ نے یہاں تک اطاعت کی کہ زیارت فی الیقظ (بیداری میں زیارت) بھی نہیں کی۔ کیونکہ سمجھتے تھے کہ اطاعت کا تو کچھ بدل نہیں اور زیارت کا بدل ہے۔ وہ یہ کہ اگر یہاں نہ ہوگی تو

بیان محبت صحابہؓ

حضرت اویس قرنیؓ کی اطاعت والدہ بجائے زیارت

زیارت فی المنام سے اطاعت افضل

آخرت میں ہو جاویگی۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

کششے کہ عشق دارد نگذاردت بدیں سان بجنازہ گر نیائی بمزار خواہی آمد

(عشق میں جو کشش ہے وہ تجھے یوں ہی نہ چھوڑ دیگی بلکہ اگر تو جنازہ پر نہ آیا تو مزار پر ضرور آئیگا)

اِس میں بھی بدل کا مضمون ہے۔ جب اویس قرنیؒ سے کہ تابعی ہیں ایسا واقعہ ثابت ہے تو صحابہؓ کا کیا کہنا ہے۔ دوسری حکایت حضرت وحشیؓ کی ہے اگرچہ یہ صحابی مشہور نہیں ہیں لیکن ہیں صحابی۔ گو حضرت عمرؓ اور حضرت ابو بکرؓ کے درجہ کے نہیں ہیں ؎

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود لیک بس عالیست پیش خاک تود

(آسمان اگرچہ عرش کی نسبت پست ہے مگر ایک خاک کے ٹیلہ کے سامنے تو بہت بلند ہے)

تو ان کا واقعہ یہ ہوا کہ اُنھوں نے حضرت حمزہؓ کو شہید کر دیا تھا۔ جب یہ مسلمان ہو کر آئے تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ هَلْ تَسْتَطِيعُ اَنْ تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي (کیا اپنا چہرہ مجھ سے غائب رکھ سکتے ہو) یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے چچا سے اِس قدر محبت تھی کہ اُن کی بدولت ایک مسلمان سے ایسے رنجیدہ رہے کہ اُن کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں فرماتے تو یہ تو بڑی رنج کی بات ہے کہ آپ خلاف مزاج امر سے اِس قدر متاثر ہوتے ہیں تو اس حالت میں عاصی آپ سے کیا اُمید کریں خدا جانے آپ کتنے ناخوش ہوں اور ہم کو کہاں دور پھینک دیں مگر ہم کو اس واقعہ ہی سے ایک بہت بڑی بات بشارت کی ہاتھ آئی۔ یہی واقعہ ہے کہ جس سے اِنشاء اللہ تعالےٰ ہماری تمام مشکلات حل ہونگی۔ کیونکہ اِس سے معلوم ہوا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسے متاثر ہونے والے ہیں کہ ایک منتسب کی دنیاوی تکلیف کی آپ کو سہار نہیں تو قیامت میں اگر ہم حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن پکڑ کر کھڑے ہو جاویں گے تو یقیناً حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری مصیبت کو دیکھ نہ سکیں گے

اور ہماری مدد فرماویں گے۔ اور صحابہ کرام نے اسی قسم کی ایک حدیث سے ایک ایسی ہی عجیب بات سمجھی تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک حدیث بیان فرما رہے تھے صحابہؓ نے اس پر عرض کیا ھَلْ یَضْحَکُ رَبُّنَا یَا رَسُوْلَ اللہِ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی کیا اللہ میاں ہنستے بھی ہیں۔ اور یہیں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ صحابہ کرام کا علم کیسا عمیق تھا کہ اللہ میاں کے ہنسنے کو تو پوچھا لیکن آجکل کے طباعوں کی طرح اُس کی کیفیت نہیں پوچھی۔ کیونکہ جانتے تھے کہ جب خدا تعالےٰ ہی کو پوری طرح نہیں پہچانا تو اُس کی صفات کی کیفیت کیسے سمجھ میں آسکتی ہے ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

(جب تو نے کبھی سلیمان علیہ السلام کو دیکھا ہی نہیں تو پھر پرندوں کی بولیاں کیسے سمجھے گا۔)

ایک بزرگ سے کسی نے شب معراج کی مفصل گفتگو کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب میں کیا خوب فرمایا ؎ 8

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(کس کی ہمت اور حوصلہ ہو کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

غرض صحابہؓ نے اُس حدیث کو سنکر عرض کیا کہ انشاء اللہ تعالیٰ ایسے رب سے خیر کے ملنے سے محروم نہ رہیں گے جو ہنستا بھی ہے یعنی اب کچھ غم نہیں کیونکہ نہیں معلوم کس بات پر ہنس پڑیں گے اور ہمارا کام بن جاویگا۔ صاحبو صحابہؓ کے یہ علوم ہیں۔ اب اِن میں ہمیں اِس لئے لطف نہیں آتا کہ ہمارا قلب مثل عنین کے ہوگیا ہے اس کو حس نہیں رہی جیسے عنین کو عورت میں لطف نہیں آتا۔ اِسی طرح ہم باعتبار قلب کے عنین اور نابالغ ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

خلق اطفال اند جز مست خدا نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(ساری مخلوق بچوں کی طرح ہو سوائے اُس شخص کے جو حق تعالیٰ کا مست ہو لبس بالغ وہی ہو جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا)

تو صحابہؓ نے جیسے اُس حدیث سے سمجھا اُسی انداز پر اس وقت خدا تعالیٰ نے حضرت وحشیؓ کے متعلق ارشادِ نبوی صلے اللہ علیہ وسلم سے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ اگر ہم مچل جاویں گے تو ضرور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ہماری مدد فرماویں گے غرض حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت وحشیؓ سے فرمایا اور انھوں نے کرکے دکھلا دیا کہ تمام عمر سامنے نہیں آئے ؎

اُرِیْدُ وِصَالَہٗ وَیُرِیْدُ ھِجْرِیْ   فَاَتْرُکُ مَا اُرِیْدُ لِمَا یُرِیْدُ

(میں اس کے وصال کا ارادہ کرتا ہوں وہ میرے فراق کا ارادہ کرتا ہے۔ پس میں اپنی مراد کو اس کی مراد کی وجہ سے چھوڑتا ہوں)

کیا کیا لہریں ان کے دل میں اٹھتی ہوں گی کہ ؎

از فراق تلخ میگوئی سخن   ہرچہ خواہی کن ولیکن ایں مکن

(فراق کی تلخ باتیں کرتے ہو اور جو چاہو سو کرو یہ نہ کرو۔)

٩ اگر گردن بھی کاٹ لیتے تو یہ غم نہ ہوتا۔ ایک تو جُدائی کا غم دوسرا یہ غم کہ لوگوں کی نظروں میں کیسی ذلت ہوگی مگر عاشق تھے کچھ بھی پروا نہ کی۔ جان و مال و آبرو سب فدا کردیا۔ اور دوسرے صحابہؓ بھی کیسے مہذب کہ کسی نے اُن کو ذرا نہیں چڑایا بلکہ اُن کی زیارت کرنے ملک شام میں جاتے تھے چنانچہ اُن سے ایک صحابی ملنے گئے اور اُن سے حضرت حمزہؓ کے قتل کا واقعہ پوچھا۔ کہنے لگے خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس کا کفارہ بھی ہوگیا کہ میں نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا۔ تو صحابہؓ جب ایسے تھے کہ اتنی بڑے امر میں اطاعت کرلی تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو یقین تھا کہ اگر ہم ایسا کرلیں کہ ان رؤسا کے آنے کے وقت اِن غرباء کو مجلس میں رہنے سے منع کردیں تو اُن کو تو ذرا بھی ناگوار نہ ہوگا اور شاید یہ رؤسا ایمان لے آویں ورنہ اتمام حجت ہی ہوجاویگا۔ اِس لئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم سوچ رہے تھے کہ ایسا کریں یا نہ کریں کہ یہ آیت نازل ہوئی وَاصْبِرْ

نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (اور آپ اپنے کو ان لوگوں کیساتھ مقید رکھا کیجئے جو اپنے رب کی عبادت صبح و شام محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیاوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانیئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے اور اپنی نفسانی خواہش پر چلتا ہے اور اس کا یہ حال حد سے گذر گیا ہے۔)

یہ شانِ نزول بیان کیا تھا جس میں بعض اور ضروری مضمون بھی بیان ہو گئے اب میں ترجمہ بیان کرتا ہوں فرماتے ہیں وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ الاٰیۃ رکھو اپنے کو اُن لوگوں کے ساتھ جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت اس طرح کرتے ہیں کہ اُس عبادت میں ارادہ کرتے ہیں محض خدا تعالیٰ کی رضا کا یعنی اپنے نفس کو مقید کر کے رکھئے یعنے اُن کو اُٹھانے کی اجازت تو کہاں ہے خود بھی نہ اُٹھئے۔ مثلاً خود ہی اُٹھ کر ان رؤسا کو دوسری مجلس میں لیکر بیٹھ جاتے جس میں اُن غرباء کی ذلت بھی نہیں ہوتی دیکھئے وَاصْبِرْ نَفْسَكَ (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) ارشاد ۱۰
ہے کہ اے محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بھی تقاضا ہو قلب میں کہ میں اُٹھوں کیونکہ اس اُٹھنے کا داعی بھی دین ہی تھا مگر صبر کر کے بیٹھئے اس سے سمجھئے کہ کیا چیز ہیں مساکین۔ محض اس لئے کہ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (محض اس کی رضا جوئی کا ارادہ کرتے ہیں) خوب کہا ہے ؎

مبیں حقیر گدایانِ عشق را کیں قوم
شہاں بے کمر و خسرواں بے کلہ اند

(گدایانِ عشق کو حقیر نہ سمجھ کیونکہ یہ لوگ بے تاج و تخت کے بادشاہ ہیں ۱۲)

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں
کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں لیکن مستی کی حالت میں دیکھو کہ آسمان پر ناز اور ستاروں پر حکم کرتا ہوں ۱۲)

جب ہی تو یہ بات ہے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ دوجہان کے بادشاہ ہیں فرماتے ہیں اَللّٰهُمَّ[عہ] اَحْيِنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِيْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِيْ فِيْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ

عہ اے اللہ زندہ رکھ مجھ کو مسکین اور موت دے مجھ کو مسکنت کی حالت میں اور محشور فرما مجھ کو مساکین کے گروہ میں ۱۲

دیکھئے یہ نہیں فرمایا کہ مساکین کا حشر میرے ساتھ ہو بلکہ یہ فرمایا کہ میرا حشر مساکین کے ساتھ ہو یعنی وہ لوگ تو اپنی جگہ رہیں میں اُن کے ساتھ ہو جاؤں جہاں مسکین ہوں وہیں میں ہوں ورنہ یہ بھی فرما سکتے تھے کہ جہاں میں ہوں وہاں یہ آجاویں۔ اور یہ یہاں سے اندازہ ہوگا کہ مسکنت کیا چیز ہے۔ صاحبو وہ اتنی بڑی چیز ہے کہ ایک ایسے بڑے سخت مرض کا علاج بھی ہے کہ وہ تمام مفاسد کی جڑ ہے اس سے تمدن اور دین دونوں بگڑتے ہیں اور وہ مرض کبر اور نخوت ہے کہ جتنی متعدی خرابیاں ہوتی ہیں۔ لڑائی غیبت حسد یہ سب تکبر کی بدولت ہوتے ہیں ہمارے مرشد حاجی صاحبؒ نے ایک مرتبہ ایک ایسی عجیب اور گہری بات فرمائی کہ جو آجتک کسی رفارمر کی زبان پر بھی نہیں آئی۔ فرمانے لگے کہ لوگ اِتفاق کی کوشش کرتے ہیں اور اُس کی جڑ کی خبر نہیں ہے۔ اتفاق کی جڑ ہے تواضع۔ ہر شخص اپنے اندر تواضع پیدا کرے کیونکہ نا اتفاقی ہمیشہ کبر سے ہوتی ہے۔ کیونکہ جب ہر شخص اپنے کو دوسرے سے بڑا سمجھے گا تو بہت سی باتوں میں اپنے حقوق کی اضاعت بھی سمجھے گا ہر بات میں اپنے کو دوسرے پر بڑھانا چاہے گا اور اس سے نا اتفاقی پیدا ہوگی۔ اور جب ہر شخص میں تواضع ہوگی تو ہر شخص اپنے اوپر دوسرے کے حقوق سمجھے گا اور اُن میں اپنے کو قاصر پاوے گا تو سب کے سب ایک دوسرے کے سامنے لچیں گے اور یہی اتفاق ہے۔ ہمارے عقلاء اتفاق کی کوشش کر رہے ہیں مگر ساتھ ساتھ کبر و نخوت کا بھی اہتمام کرکے اُسی اتفاق کی جڑ کاٹ رہے ہیں بعینہ وہی حالت ہے ؎

یکے بر سر شاخ و بن مے برید | خداوند بستاں نگہ کرد دید

(ایک آدمی ٹہنی پر ہے اور جڑ کاٹ رہا ہے مالک باغ نے نظر کی اور دیکھا)

تو ہم شاخِ اِتفاق پر بیٹھے ہیں لیکن کبر کے تبر سے اُس کی جڑ کاٹ رہے ہیں

مسکنت کے فضائل

اتفاق کی اصل جڑ تواضع ہے

11

بعض عقلاء اتفاق کی کوشش کرتے ہیں مگر ساتھ ہی کبر کرتے ہیں

آج خودداری تکبر کی تعلیم کی جاتی ہے اور اُس کا نام رکھا گیا ہے اولوالعزمی صاحبو اولوالعزمی یہ ہے کہ سلطنت پر لات مار دی اور حالت یہ ہو کہ لنگے زیر و لنگے بالا (ایک لنگی باندھے ہوئے اور ایک لنگی اوڑھے) اولوالعزمی کا حاصل یہ ہے ؎

موحد چہ بر پائے ریزی زرش　　چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
اُمید و ہراسش نباشد زکس　　ہمیں است بنیاد توحید و بس

(موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیریں یا اس کے سر پر تلوار رکھیں اُمید و خوف اس کو بجز خدا کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے ۱۲)

اور وہ حالت ہو ؎

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند　　فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

(جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہو گئی اس کو جان اور فرزند و اسباب کی پروا نہیں ۱۲)

۱۲ صاحبو! اولوالعزمی وہ ہے جو صحابہ نے کر کے دکھلا دی کہ ماہان ارمنی کے دربار میں جب حضرت خالد رضی اللہ تعالےٰ عنہ سو آدمیوں کو ہمراہ لیکر تشریف لے گئے تھے۔ ماہانؔ ارمنی نے حریر کا فرش بچھایا ہوا تھا۔ حضرت خالدؓ نے اس کو اُٹھا دیا۔ ماہانؔ نے کہا کہ اے خالدؓ میں نے تمہاری عزت کے لئے یہ فرش بچھایا تھا۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ خدا تعالےٰ کا فرش تیرے فرش سے بہت اچھا ہے اب غور کیجئے کہ حضرت خالد صرف سو آدمیوں کے ساتھ ہیں اور ماہانؔ ارمنی کے پاس دو لاکھ فوج ہے۔ لیکن حضرت خالدؓ کیا گفتگو کرتے ہیں۔ ماہانؔ ارمنی نے کہا کہ اے خالدؓ میرا جی چاہتا ہے کہ تم کو بھائی بنا لوں حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ بہتر ہے کہو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں) ماہانؔ ارمنی نے کہا کہ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا تو اس حالت میں ہم نے حقیقی بھائیوں کو بھی چھوڑ دیا تجھ کو

اولوالعزمی کے ... | اولوالعزمی کا ... | حضرت خالدؓ ... کی حکایت

کیا بھائی بناتے۔ پھر حضرت خالدؓ نے فرمایا اے ماہان تو مسلمان ہوجا ورنہ وہ دن قریب نظر آرہا ہے کہ تو حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے سامنے اِس طرح حاضر کیا جاویگا کہ تیرے گلے میں رسّی ہوگی اور تجھ کو ایک شخص گھسیٹتا ہوگا۔ اِس پر ماہان ارمنی آگ ہوگیا غضبناک ہوکر کہا کہ پکڑو اِن لوگوں کو حضرت خالدؓ فوراً کھڑے ہوگئے اور ہمراہیوں سے خطاب کرکے فرمایا کہ خبردار اب ایک دوسرے کو مت دیکھنا اب انشاء اللہ تعالیٰ حوض کوثر پر ملاقات ہوگی اور فوراً میان سے تلوار کھینچ لی۔ یہ ہیئت دیکھ کر ماہان مرعوب ہوگیا اور کہنے لگا کہ میں تو ہنسی کرتا تھا۔ جب حضرت خالدؓ درست ہوکر بیٹھے یہ ہے اولوالعزمی نہ یہ کہ غایت کبر و نخوت و تنفرعن المساکین (مسکین سے نفرت) سے جنگل میں جا بسے کہ نہ مسلمان اُن کو دیکھ سکیں نہ یہ مسلمانوں کو دیکھ سکیں نیز جس کا نام آج اولوالعزمی رکھا گیا ہے وہ وہ ہے جس کی
۱۳ بابت قرآن مجید میں ارشاد ہے لَا یُرِیۡدُوۡنَ عُلُوًّا فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فَسَادًا (نہیں ارادہ کرتے ہیں بڑائی کا زمین میں اور نہ فساد کا ۱۲) تو اولوالعزمی صحابہؓ نے کرکے دکھلائی ہے اور وہ توحید سے ہوتی ہے۔ آجکل تکبّر کا نام اولوالعزمی رکھا گیا ہے اور اُس کی تعلیم دیجاتی ہے۔ صاحبو! کیسے افسوس اور رنج کی بات ہے آج بچّوں کو وہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اُن میں بچپن ہی سے اینٹھ مروڑ پیدا ہوجاوے۔ مجھ سے ایک رئیس نے پوچھا کہ اگر بچہ نوکر کی خطا کرے تو کیا کرنا چاہیئے یعنی اِس حرکت پر اُس کو کسی قسم کی تنبیہ کرنی چاہیئے یا نہیں۔ میں نے کہا اُس بچّہ کو کہنا چاہیئے کہ اُس نوکر سے عذر کرے۔ کہنے لگے کہ یہ تو بڑی ذلت کی بات ہے۔ اِس سے اولوالعزمی میں ضعف ہوتا ہے۔ پھر جب میں نے اس اولوالعزمی کی حقیقت سمجھائی کہ یہ بدخلقی اور تکبّر ہے تب اُن کی سمجھ میں آگیا۔ صاحبو واللہ لوگوں کو پرورش اور تربیت نہیں آتی۔ تربیت یہ تھی کہ جو پہلے اتالیق کرتے تھے۔ ایکؒ شاہزادہ کی

حکایت ہے کہ وہ ایک معلّم کے پاس پڑھتا تھا۔ ایک روز بادشاہ جو مکتب میں گئے تو دیکھا کہ نہ شاہزادہ ہے اور نہ معلّم ہے۔ دوسرے لڑکوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ معلّم صاحب گھوڑے پر سوار ہوکر گئے ہیں اور شاہزادہ اُن کے پیچھے ساتھ گیا ہے۔ بادشاہ کو یہ حرکت ناگوار ہوئی اور جس طرف اُن کا جانا سُنا تھا خود بھی اُسی طرف کو چلا۔ آخر ایک جگہ ملاقات ہوئی۔ بادشاہ نے دیکھا کہ میاں جی گھوڑے پر سوار ہیں اور شاہزادہ گھوڑے کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ بادشاہ نے معلّم سے پوچھا کہ آخر اس کا کیا سبب ہے۔ کہنے لگے کہ جناب آپ کو معلوم ہے کہ یہ شاہزادہ ہے اور خدا تعالیٰ نے کیا تو یہ تخت سلطنت پر بھی متمکن ہوگا اُس وقت ایسے بھی مواقع ہوں گے کہ یہ سواری پر ہو اور اِس کے ساتھ اِس کے حشم خدم بھی ہوں۔ پس میں ابھی وقت سے اِس کو گھوڑے کے ساتھ بھگا کر یہ بتلا رہا ہوں کہ خدام کو پیادہ دوڑنے میں ایسی تکلیف ہوا کرتی ہے تاکہ یہ اپنی تکلیف کو یاد کرکے اپنے حشم 14
خدم پر رحم کرے اور وسعت سے زیادہ تکلیف اُن کو نہ دے۔ یہ سُنکر بادشاہ بہت خوش ہوا اور کہا جزاک اللہ (اللہ تعالیٰ تجھ کو جزا دے) تم نے بہت بڑی اصلاح کی۔ تو یہ ہے تربیت کا طریق۔ اب تکبّر کا ایسا چرچا ہوا ہے کہ خدا تعالیٰ کی پناہ اور یہی ہماری تباہی کا سبب ہے اور اس کا علاج ہے مسکنت جو بات دس برس کے مجاہدہ میں بہ دِقّت حاصل ہوسکتی ہے وہ مسکنت سے ایک دن میں حاصل ہوجاتی ہے اور یہ مسکنت کی وہ منفعت ہے جو میری سمجھ میں آئی ورنہ اصل یہ ہے کہ مسکنت فی ذاتہا بھی محبوب عند اللہ ہے۔ پیا جس کا چاہے وہی سہاگن ہوئے۔ شاید اِس تقریر سے کسی کے دل میں یہ بات پیدا ہو کہ ہم بھی گھر لُٹا دیں گے اور مساکین میں داخل ہوجاویں گے۔ صاحبو ہرگز ایسا مناسب نہیں۔ مساکین میں داخل ہونے کا یہ طریق ہے کہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ (آدمی اس شخص کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرتا ہے)

تکبر کا علاج

آج تصدر والعنبر فقراء و صحبت مساکین کی فضیلت

تم اُن سے محبت رکھو انشاء اللہ تعالےٰ انھیں کے درجہ پر پہونچ جاؤ گے۔ اسی لئے فرماتے ہیں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم یَا عَائِشَۃُ قَرِّبِی الْمَسَاکِیْنَ وَجَالِسِیْہِمْ (نزدیک ہو تو مساکین کے اور ان کے پاس بیٹھ) لفظ قربی (نزدیک ہو تم) میں تو اُن کو آنے دینے کے لئے فرمایا اور لفظ جالسیہم (بیٹھ تو ان کے پاس) میں اس سے بڑھ کر یہ بتلا دیا کہ اگر وہ خود نہ آویں تو جا کر بیٹھو۔ دیکھئے کتنی بڑی عزت ہے مساکین کی یہ ہی مسکنت ہے جس سے خود حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ارشاد ہوا کہ اِصْبِرْ نَفْسَکَ الخ (جمائے رکھئے اپنے نفس کو) یہ بیان تھا ترجمہ آیت کا۔ اور آیت کے ترجمہ سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مقصود میرا کیا بیان کرنا ہے مگر میں تصریحاً بھی کہے دیتا ہوں سو مدلول لغوی آیت کا تو یہ ہے جو کہ میں نے بیان کیا مگر اس کی ایک غایت ہے اُس غایت سے میرا مقصود اچھی طرح سمجھ میں آجاویگا میں نے سوچا تھا کہ کوئی صریح آیت سمجھ میں آجاوے مگر جلدی میں سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن خیر اب سمجھئے کہ غایت اس اِصْبِرْ سے کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ 15
رعایت نفع صحابہ کی کیونکہ دو حال سے خالی نہیں کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے مساکین کو نفع پہونچتا ہے یا نہیں اگر نہیں پہونچتا تو پھر اِس حکم سے کیا فائدہ ہوتا۔ اور اگر کوئی کہے کہ شاید حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو نفع پہونچتا ہو اجر تبلیغ کا تو یہ بالکل غلط ہے کہ صرف اِس کو مدار حکم کہا جاوے۔ اس میں صحابی کی کیا تخصیص ہے یہ تو تبلیغ الی الکفّار (کفار کی تبلیغ) میں بھی مشترک ہے پس معلوم ہوا کہ اِن مساکین کو آپ سے نفع پہونچنا بڑی غایت ہے اِس حکم کی یعنی اگر یہ آپ کے پاس بیٹھیں گے تو ان کو نفع ہوگا۔ اِس سے ثابت ہوا کہ مقبولانِ الٰہی کے پاس بیٹھنے سے نفع ہوتا ہے۔ یہ چھوٹا سا جملہ ہے مگر میں اس کی تفصیل کروں گا اور یہ ہی میرا مقصود ہے بیان سے اور مسئلہ سب کے نزدیک مسلّم بھی ہے اور قرآن شریف میں منصوص بھی ہے اِتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (اللہ تعالےٰ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو) اِس آیت

میں تو یہ مصرح ہی ہے اور جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اُس میں گو مصرح نہیں لیکن حسب تقریر مذکور لازم آگیا۔ پھر یہ کہ اُس کا مسلّم ہونا ہی کافی ہے لیکن باوجود مسلّم ہونے کے افسوس ہے آپ کے دلوں میں درجہ ضرورت میں یہ کبھی نہیں آیا اور یہ ہی ضرورت داعی ہوئی اس کے بیان کی۔ یہ تو عام خیال ہے کہ نیک صحبت نافع ہوتی ہے لیکن اس کا ضروری ہونا سو عقیدہ کے درجہ میں بھی اِس سے غفلت ہے اور عمل کے اعتبار سے بھی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ تمام لوگ اپنے لئے اپنی اولاد کے لئے دنیا کی فلاح کی کوشش کرتے ہیں۔ اُن میں جو دین کا مذاق غالب رکھتے ہیں وہ دین کے لئے مولوی بناتے ہیں جو دنیادار ہیں وہ معاش کے لئے تیار کرتے ہیں۔ غرض ایک نے دین کی فلاح کی کوشش کی اور ایک نے دنیا کی فلاح کی کوشش کی لیکن اِس فہرست مساعی میں کہیں یہ فکر نہیں جس کا نام
۱۶ نیک صحبت ہے یعنی بالاستقلال اِس کا اہتمام کسی نے بھی نہیں کیا۔ جیسے اور کاموں کو ضروری سمجھتے ہیں اِس کو کسی نے بھی ضروری نہیں سمجھا۔ مثلاً ہفتہ بھر میں ایک دن یا مہینہ بھر میں ایک دن یا سال بھر میں ایک مہینہ کسی نے اِس لئے دیا ہو کہ اِس میں صحبتِ نیک سے مستفید ہوں تو ہمارا یہ عمل اِس کی شہادت دے رہا ہے کہ ہم نے اِس کو کسی درجہ میں بھی ضروری نہیں سمجھا۔ دیکھئے سارے کاموں کے لئے وقت مقرر ہیں کھانے کے لئے بھی آرام کے لئے بھی سیر کے لئے بھی مگر صحبتِ نیک کے ذریعہ سے محض تہذیب اخلاق کے لئے بھی کسی نے وقت مقرر کیا ہے؟ اِس کے جواب میں محض صفر ہے۔ یہ ہے وہ مضمون جس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے اس لئے کہ اس کی طرف سے غفلت عام اور ضرورت اس کی بیحد کہ دنیا کا یا دین کا کوئی کمال بغیر صحبت کے نہیں ہو سکتا۔ ہاں نام کو جو چاہے ہو جاؤ باقی واقع میں وہ حال ایسا ہی ہے کہ ؎

نیک صحبت کی ضرورت اور لوگ اس کو ضروری نہیں جانتے

خواجہ پندارد کہ دارد حاصلے   حاصل خواجہ بجز پندار نیست

(خواجہ کا گمان ہے کہ اس کو کچھ حاصل ہے خواجہ کو بجز غرور کے کچھ حاصل نہیں۔)

اِس وقت لوگ مطالعہ کتب کو کمال سمجھتے ہیں۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ کوئی کمال بدون ماہر سے حاصل کئے نہیں آسکتا اور ماہر سے حاصل کرنا موقوف ہے صحبت پر۔ اور دنیاوی کمالات کو جانے دیجئے اس کا مجھے تجربہ نہیں نہ مجھے اُس کے متعلق گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیث خواب گویم   چو غلام آفتابم ہمہ از آفتاب گویم

(میں نہ شب ہوں نہ شب پرست کہ خواب کی تعبیر بیان کروں محبوب حقیقی کا غلام ہوں محبوب ہی کی باتوں کو مجھ سے سنو)

17 گو مولویوں پر یہ بھی اعتراض ہے کہ دنیا کی اِصلاح کا کوئی طریقہ نہیں بتلاتے مگر میں اِس کا ایک جواب دیا کرتا ہوں کہ یہ اعتراض ایسا ہے کہ جیسے حکیم محمود خاں کے پاس کوئی مدقوق جاوے اور وہ نبض دیکھ کر ایک نسخہ لکھ دیں جب وہ نسخہ لیکر باہر آیا تو دروازہ پر ایک چمار ملا کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے کیا بتلایا۔ مریض نے نسخہ دکھلا دیا دیکھ کر کہنے لگا کہ تمہاری جوتی ٹوٹی ہوئی ہے اس کے متعلق بھی کچھ بتلایا۔ مریض نے کہا کوئی نہیں کہنے لگا کہ حکیم محمود خاں بھی دنیا کی ضرورت سے بالکل ہی غافل ہیں۔ صاحبو اِس مشیر کو کیا جواب دیجئے گا بجز اس کے کہ یہ حکیم صاحب کا منصب ہی اور یہ تیرا کام ہے۔ اِسی طرح ہم دق روحانی کا نسخہ بتلاتے ہیں اور دنیاوی مقاصد کو جوتی سینے کے درجہ میں سمجھتے ہیں۔ تو پھر ہم پر ہمارے خلاف منصب کیوں الزام دیا جاتا ہے۔ صاحبو! غضب ہے کہ ستار کے پاس کھڑ یا لیجاؤ کہ اس کو بنا دے یا قاضی شہر سے چار پائی بنواؤ وہاں اگر حکیم محمود خاں جوتی بنوانے سے منع کریں تو وہ مجرم ہیں۔ لیکن اگر جوتا اِس طرح سے سلوایا جاوے کہ کھال میں کو ستالی نکلنے لگے تو حکیم محمود خاں پر فرض ہے کہ منع کریں اور کہیں کہ اِس زخم سے تمہارا سارا بدن سڑ

علماء پر دنیا حاصل کرنیکا طریقہ بتلانا واجب نہیں بلکہ بتلانا خلاف منصب ہے

(علماء دنیا حاصل کرنے کو منع نہیں کرتے)

جاویگا۔ بس اِسی طرح اگر مولوی جائز طریقوں سے دنیا کمانے کو منع کریں تو بیشک مولویوں پر الزام ہے لیکن اگر دین میں نتسالی نکالنے لگے گی تو وہ ضرور منع کریں گے اور یہ منع کرنا واقع میں ترقی سے روکنا نہیں ہے۔ صاحبو! اگر ایک شخص جیب میں اشرفیاں بھرے اور جب جگہ رہ جاوے تو اوپر سے کوڑیاں بھرنے لگے اور کوڑیوں کو ٹھونس ٹھونس کر بھرنے کے بوجھ سے جیب پھٹنے لگے کہ اشرفیاں نکلنے لگیں اور یہ حالت دیکھ کر کوئی شخص اس کو اِس طرح کوڑیاں بھرنے سے منع کرے تو اس کو مانع ترقی کہا جاوے گا ہرگز نہیں۔ وہ کوڑیاں کس کام کی جو اشرفیاں کھو کر حاصل کی گئیں ہوں۔ پس جب آپ کا دین کہ اشرفیوں سے زیادہ قیمتی ہے برباد ہو رہا ہے تو دنیا کی چند کوڑیاں جمع کرکے آپ کو کیا فلاح ہوگی تو اس حالت میں مولوی ضرور منع کریں گے اور اگر یہ امر آپ کی سمجھ میں آجاویگا تو آپ بھی کہنے لگیں گے ؎ ۱۸

مبادا دلِ آں فرومایہ شاد   کہ از بہر دنیا دہد دیں بباد

(وہ کمینہ خوش دل نہ رہے جس نے دنیا کی وجہ سے دین کو خراب کیا۔)

ہم کو گو یہ بھی جائز ہے کہ ہم آپ کو آپ کے دنیاوی نقصانات سے بھی بچاویں لیکن ہم اس کو اپنا منصب نہیں سمجھتے اِس لئے دوسرے مشاغل دینیہ کے غلبہ سے قصداً ایسا نہیں کرنا چاہتے کیونکہ ؎

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم   الا حدیث یار کہ تکرار مے کنیم

(جو کچھ ہم نے پڑھا سب کو فراموش کر دیا بجز محبوب حقیقی کی باتوں کے کہ ان ہی کا تکرار کرتے ہیں۔)

دیکھئے انگریزوں کا فتویٰ ہے کہ ہر کام کے لئے ایک جماعت رہنی چاہیئے تو اس فتوے کے مطابق مولویوں کو صرف دین کے کام کے لئے رکھو۔ مگر آجکل عجب اندھیر ہے کہ سارے کام ایک ہی جماعت کے ذمے سمجھے جاتے ہیں اور سارے کاموں کے الزام مولویوں ہی پر ہیں۔ اور اگر مولوی کچھ

کرتے بھی ہیں اور روپیہ کی نسبت ان حضرات سے کہتے ہیں کہ روپیہ ہمارے پاس نہیں وہ جمع کیجئے تو جواب ملتا ہے کہ تم ہی چندہ بھی کر لو۔ مجھے ایسے لوگوں کی حالت پر اکبر کے زمانہ کا ایک قصہ یاد آیا کرتا ہے کہ اکبر نے کبھی خوشی میں اپنے بھانڈ کو ایک ہاتھی دیدیا تھا وہ کھلاوے کہاں سے آخر اُس نے ایک ڈھول اُس کے گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا۔ اکبر شاہ نے اتفاقاً اس ہیئت میں دیکھا۔ پوچھا۔ اُس نے کہا حضور جب مجھ سے کھلایا نہ گیا میں نے ڈھول گلے میں ڈال کر چھوڑ دیا کہ بھائی مانگ اور کھا۔ تو گویا مولوی اکبر کے بھانڈ کے ہاتھی ہیں۔ کیوں صاحب مولویوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ روپیہ مانگیں۔ ہمارا کام زبان اور ہاتھ کا ہے۔ باقی روپیہ دینا یا جمع کرنا یہ آپ کا کام ہے۔ بیان اس کا تھا کہ دنیاوی اصلاحات میں دخل دینا مولویوں کا کام نہیں ہے بلکہ اُن کا حسن تو یہ
۱۹ ہے کہ اس سے یہ واقف بھی نہ ہوں۔ بچہ کا کمال یہ ہے کہ وہ بالکل بھولا ہو۔ دوسرے ایک بڑی خرابی ان کے دنیا سے باخبر ہونے میں یہ بھی ہے کہ اگر ان کو دنیا کا کام آوے تو نفس ان کے بھی ساتھ ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر یہ چند روز میں شکر فروش اور چاول فروش ہوں گے۔ دیکھو اگر ڈرائیور کو سیکنڈ کی سواری ملے تو وہ کبھی انجن میں نہ بیٹھے گا تو مولوی دُنیا سے ناواقف ہی رہنے چاہئیں۔ اور صاحبو غضب ہے کہ ایک تو ہم تکلیف کے انجن میں بیٹھ کر آپ کی راحت رسانی کے لئے اپنا بدن اور کپڑے سیاہ کریں اور پھر یہ اعتراض ہم پر ہو کہ تم گارڈ کیوں نہیں بنتے۔ اس لئے میں دنیا کی اصلاح کا ذکر ہی نہیں ہوتا گو وہ بھی موقوف صحبت ہی پر ہے مگر میں صرف دینی اصلاح کا ذکر کرتا ہوں کہ دین کی اصلاح محض کتابیں دیکھ کر نہیں ہوسکتی۔ یہ صحبت ہی سے ہوسکتی ہے مطالعہ کتب سے اس کی کوشش کرنا ایسا ہے جیسے طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص

بیوی کو مسہل دینے لگے اور حکیم محمود سے نہ پوچھے محض اس لئے کہ قرابا دین اعظم ہمارے پاس ہے جس کسی سے بھی ایسا کہنے کو کہو وہ یہی کہے گا کہ صاحب ہر فن کے کچھ دقائق ہوتے ہیں جن کو صاحبِ فن ہی سمجھ سکتا ہے میں بدون حکیم کے مسہل دینے کی جرات نہیں کرتا۔ پس اسی طرح اس فن دین میں بھی کچھ غوامض ہیں لہذا کتابوں پر اکتفا کرنا سخت غلطی ہے ہرگز کتابوں پر اکتفا نہ کیجئے بلکہ صحبت اختیار کیجئے چونکہ وقت کم رہ گیا ہے اس لئے مختصر کر کے ختم کرتا ہوں (سامعین نے التجا کی کہ مختصر نہ کیا جاوے اس کے بعد پھر فرمایا) غرض صحبتِ نیک کی سخت ضرورت ہے مگر اس کی طرف لوگوں کو مطلق توجہ نہیں۔ حالانکہ بدون صحبت معمولی کام کا بھی سلیقہ نہیں ہوتا۔ دیکھئے رسالہ خوان نعمت کو دیکھ کر کبھی گلگلے نہیں پکا سکتا تو جب جزئیات دنیویہ بھی بدون صحبت کے حاصل نہیں ہوسکتے تو فنون شریفہ تو کیسے حاصل ہوسکتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میرے بچپن میں ایک وکیل صاحب میرے ہاں مہمان ہوئے میں نے اُن سے ترجمہ قانون لیکر دیکھا اور اپنے نزدیک اس کو سمجھا پھر میں نے وکیل صاحب سے پوچھا کہ آیا اس کے معنی یہی ہیں جو میں نے سمجھے ہیں کہنے لگے کہ نہیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں اور ان کے بیان کرنے کے بعد وہی معنے صحیح معلوم ہوئے جو انھوں نے بتلائے تھے۔ تو دیکھئے اُردو مادری زبان ہے مگر چونکہ اس فن سے واقفیت نہ تھی اس لئے صحیح معنی سمجھ میں نہ آئے تو اگر کسی دوسری زبان کی کتاب ہو یا اس سے ترجمہ کر کے آئی ہو تو چونکہ غیر زبان کے دقائق پر تو بدون مہارت اطلاع علی وجہ الکمال نہیں ہوتی۔ اور ترجمہ میں وہ خصوصیات محفوظ نہیں رہتیں جو اصل زبان کے الفاظ میں تھیں۔ اس لئے محض کتاب دیکھ کر کبھی کوئی شخص اصل بات کی تہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ دیکھو اگر ذوق کا ایک شعر لیکر فارسی میں اس کا ترجمہ کردو تو ہرگز وہ لطف نہ آویگا۔ بس یہی حالت

صحبت نیک کی ضرورت اور بدون صحبت کوئی فن حاصل نہیں ہوتی ۲

قرآن و حدیث کی ہے۔ تو اوّل زبان سیکھو پھر ماہر فن کے متعلق اہل فن سے اس کے احکام سیکھو تب وہ فن حاصل ہوگا۔ ورنہ قرآن بدون مفسّر کے اور حدیث بدون محدّث کے ہرگز حل نہیں ہو سکتی اور علماء کو اس کا اندازہ ہوگا کہ باوجود اس کے کہ وہ دن رات اس میں رہتے ہیں مگر پھر بھی اُن کو گاہے پوچھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میں نے بعض اوقات اپنے اساتذہ کے سامنے اُن کے مطلب بیان فرمانے پر اس کے خلاف اس مقام کی تقریر کی اور انھوں نے اُس کو قبول کیا۔ تو جب شاغلین کی یہ حالت ہے تو جن لوگوں کو یہ مشغلہ ہی نہیں وہ محض اپنے فہم پر کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک مسئلہ کے ساتھ دوسری قیود جو اُس مقام پر مذکور نہیں ملحوظ ہوتی ہیں جس میں نہایت ماہر کی ضرورت ہوتی ہے اسی لئے میں نے ایک طالب علم شافعی المذہب کی درخواست پر اُس کو فقہ شافعی
۲۱ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ کبھی ایک مسئلہ میں ایک قید معتبر ہوتی ہے لیکن وہ اُس خاص جگہ مذکور نہیں ہوتی بلکہ دوسری جگہ مذکور ہوتی ہے تو ایسے مقام پر بوجہ عدم استحضار و عدم مہارت مجھے فروگزاشت ہوتی۔ میں مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ لفظ اِخْتَارِیْ (اختیار کر تو) کنایات میں سے ہے اس کو باب الکنایات میں دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ لغزش ہوئی کہ وہ یہ سمجھے کہ اگر کوئی اپنی بیوی کو بہ نیت طلاق یہ لفظ کہدے تو طلاق ہو جاوے گی۔ حالانکہ یہ مسئلہ ایک تو باب تفویض طلاق سے متعلق ہے اور دوسرے باب کنایات سے تو باب کنایات میں تو یہ لکھا ہے کہ یہ کنایہ ہے اور باب تفویض میں یہ لکھا ہے کہ وقوع کی شرط یہ ہے کہ عورت اِخْتَرْتُ نَفْسِیْ (میں اپنے نفس کو اختیار کیا) بھی کہے اور اگر عورت کچھ نہ کہے تو مرد کے صرف اِخْتَارِیْ (اختیار کر) کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی اسی لئے میں نے ان شافعی المذہب سے انکار کر دیا۔ اور مولوی طیّب صاحب

عرب شافعی کا نام بتلا دیا تھا کیونکہ دیانت کی بات یہی تھی۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں کہ جب تک کاہل شیخ اس کے غوامض پر مطلع نہ کرے اُس وقت تک وہ حل نہیں ہوسکتیں۔ اِس لئے صحبت کی حاجت ہوئی سو ایک ضرورت تو صحبت کی اصلاح علمی کے لئے ہے اور دوسری اِصلاح دین کی عمل ہے جس کے لئے ضرورت ہے تربیت کی اور وہ بھی موقوف ہے صحبت پر اور عمل کا موقوف ہونا تربیت پر اور محض علم کا اس کے لئے کافی نہ ہونا اِس سے ظاہر ہے کہ عمل میں علماء بھی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم جیسوں کی یہ حالت ہے کہ ؎

دوسرا اصلاح عملی کی

واعظاں کیں جلوہ برمحراب و ممبر میکنند ۔ چوں بخلوت میروند ایں کار دیگر میکنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس ۔ توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر میکنند

(واعظ لوگ محراب و منبر پر جلوہ فرما ہوتے ہیں جب خلوت میں جاتے ہیں دوسرا کام کرتے ہیں۔ ایک اشکال مجھ کو پیش آیا ہے دانشمند مجلس سے دریافت کر توبہ کا حکم کرنے والے خود توبہ نہیں کرتے ۱۲)

۲۲ آخر کیا وجہ ہے کہ غیبت کی بُرائی جانتے ہیں مگر مبتلا ہیں۔ جانتے ہیں کہ کینہ رکھنا بُرا ہے مگر سینکڑوں اہلِ علم اس میں مبتلا ہیں سو وجہ یہی ہے کہ تربیت نہیں ہے اور اس کی وجہ سے عمل کمزور ہے تو عمل کے لئے فقط علم اور ارادہ کافی نہیں تربیت کی بھی حاجت ہے لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ عمل ارادی چیز ہے تو اس کے لئے ارادہ کافی ہوگا مگر اس میں غلطی یہ ہوئی کہ خود ارادہ کے لئے بھی قوت کی ضرورت ہے اس پر نظر نہیں کی گئی یا یوں کہئے کہ ارادہ جب ہی کافی ہے کہ مواقع موثر نہوں اور بدون تربیت موانع ہوتے ہیں مثلاً منازعات نفس بھی موانع ہیں کہ آپ سردی میں اُٹھ کر نماز پڑھنا چاہتے ہیں لیکن نفس آپ کو روکتا ہے تو اس کے لئے ضرورت ہے تربیت کی اس سے منازعات ضعیف الاثر ہوجاتے ہیں گو بالکل ان کے مواد کا استیصال نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کو اس میں یہ دھوکہ

منازعات نفس کا علاج ہے بالکل نہیں زائل ہوتا

ہوجاتا ہے کہ مجاہدات سے منازعات بالکل باطل ہوجاتے ہیں لیکن یہ غلط ہے ہاں ضعیف ہوجاتے ہیں ؎

نفس اژدرہاست او کے مردہ است از غمِ بے آلتی افسردہ است

(نفس اژدہا ہے وہ نہیں مرا ہاں غم بے آلتی سے افسردہ ہے)

مولاناؒ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک اژدہا سردی میں ٹھٹھرا پڑا تھا اُس کو ایک مارگیر نے مُردہ سمجھ کر رسوں میں جکڑ لیا اور گھسیٹ کر شہر میں لایا لوگ جمع ہوگئے وہ شیخی بگھار رہا تھا کہ میں نے اِس طرح اس کو گرفتار کیا ہے اور اس طرح اس کو مارا ہے لوگ بھی تعجب کر رہے تھے اتنے میں دھوپ جو نکلی وہ اس کی حرارت سے جنبش کرنے لگا معلوم ہوا کہ زندہ ہے مخلوق بھاگی اور ساری شیخی اس کی کرکری ہوگئی۔ اس کو ذکر کرکے مولاناؒ فرماتے ہیں ؎

۳، نفس اژدرہاست او کے مردہ است از غمِ بے آلتی افسردہ است

یعنی نفس تو ایک اژدر ہے وہ مرا نہیں ہاں غم بے آلتی سے افسردہ ہوگیا ہے تو افسردگی کے اسباب کو نہ چھوڑنا چاہیئے اور وہ مجاہدات و اشغال اور تدابیر خاصہ ہیں اِس لیۓ تعلیم اصلاح کے ساتھ ان تدابیر کی تعلیم بھی ضروری کرنا چاہیئے۔ اکثر ہمارے مُصلحین اوامر و نواہی اور وعدہ وعید کو ہمیشہ ذکر کرتے ہیں مگر اس کے ساتھ تدابیر نہیں بتلاتے حالانکہ اس کی سخت ضرورت ہے کیونکہ اس میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جھوٹ نہ بولیں مگر نفس کہتا ہے کہ اب فلاں مصلحت ہے بول ہی لینا چاہیئے اور ہم نفس سے مجبور ہوجاتے ہیں۔ دیکھو اگر بدن میں صفرا بہت بڑھ جاوے تو نرے مُسکّنات (تسکین دینے والی دوائیں) سے تسکین نہیں ہوتی بلکہ مزیل (زائل کرنیوالی ادویہ) کی ضرورت ہوگی۔ تو محض نصیحت بمنزلہ مسکّن ہے اور تدابیر بمنزلہ مزیل۔ غرض ان منازعات کے لئے تربیت کی حاجت ہوتی

حاصل تقریر یہ ہوا کہ دو چیزوں کی ضرورت ثابت ہوئی۔ ایک علم دوسرا عمل جو موقوف ہے تربیت پر۔ اوّل کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے اور دوسرے کے لئے خاص قسم کے شیوخ کی ضرورت ہے۔ پس علم و عمل دونوں موقوف ہوئے صحبت پر مگر ہم لوگ اس سے غافل ہیں۔ چونکہ میں نے کہا تھا جس کی ضرورت ہو اور اُس سے غفلت ہو اُس کے بتلانے کی سخت ضرورت ہوتی ہے اسی لئے میں اس کو بتلانے کو عرض کر رہا ہوں کہ صحبت وہ چیز ہے کہ علم اور عمل کا کمال دونوں اس پر موقوف اور علم و عمل دونوں ضروری اور موقوف علیہ ضروری کا ضروری پس کس قدر ضروری ٹھیری۔ اب یہ بات کہ علم اور عمل دونوں ضروری ہیں سو اس کا مختصر بیان یہ ہی کہ جو خرابی دنیوی یا اُخروی واقع ہوتی ہے یا اخلال علم سے ہوتی ہی یا اخلال عمل سے۔ اُخروی خرابی کا ترتب تو ظاہر ہے اور اس کے واسطے نصوص وعید دلیں کافی ہیں اور دُنیوی خرابی کا ترتب اس طرح ہے کہ جس کا جی چاہے ۲۴
دیکھ لے کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرکے ہر پریشانی سے نجات ہوتی ہے اور اسی طرح مخالفت کرنے سے پریشانی کا ہجوم ہوتا ہے۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ عمل کرنے سے ہر تعب سے نجات ہوتی ہے مگر پریشانی سے ضرور نجات ہوتی ہے اور اصل کلفت یہی ہے اور اگر پریشانی نہ ہو تو خود تعب و مشقت میں بالذات کوئی کلفت نہیں۔ اسی پر حکایت یاد آئی کہ مولوی غلام مصطفےٰ جو میرے ایک دوست ہیں وہ ایک رئیس کے لڑکوں کو پڑھاتے تھے اور نماز بھی پانچوں وقت پڑھواتے تو ان لڑکوں کی ماں کوستی تھی کہ اس مولوی نے میرے بچّوں کو زکام میں مبتلا کردیا صبح کو وضو کراتا ہے۔ سو صاحب ایسی مشقت تو دین میں ہوتی ہی مولانا فضل الرحمٰن صاحب علیہ الرحمۃ سے ایک شخص نے آکر پوچھا کہ ایک عورت کا شوہر گم ہوگیا ہے۔ مولوی صاحب رحؒ نے فرمایا کہ مرد کی تو سے

دین کی اصلاح کے لئے علم و عمل دونوں ضروری ہیں
علم و عمل کے لئے صحبت کی ضرورت
علم و عمل کی کمی سے دنیوی خرابی

برس کی عمر تک انتظار کرو۔ کہنے لگا کہ جناب اِس میں تو بڑا حرج ہے اور دین میں حرج ہے نہیں۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ بھائی اگر یہ حرج ہے تو جہاد میں بھی حرج ہے سو حرج کے یہ معنی نہیں۔ حَرَج کہتے ہیں پریشانی اور اُلجھن کو سو اسلام میں یہ نہیں ہاں تعب و مشقت ہی تو کیا دنیا کے کاموں میں تعب اور مشقت نہیں ہے واللہ جو شخص شریعت پر عمل کریگا تمام پریشانیوں سے نجات میں رہے گا۔ اِس پر شاید کوئی یہ کہے کہ ہم بہت دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اکثر تکلیف میں رہتے ہیں مثلاً اُن کی آمدنی کم ہوتی ہے اور خرچ تنگی سے ہوتا ہے تو جواب یہ ہے کہ یہ تکلیف جسم پر ہے روح پر نہیں اور پریشانی ہوتی ہے روح کی تکلیف ہے پس اس کی مثال دلدادگان شریعت کے اعتبار سے ایسی ہے جیسے کسی عاشق سے کوئی مدت کا بچھڑا ہوا محبوب ملے اور دور ہی سے دیکھ کر
یہ محب اس کو سلام کرے اور اُس کے گلے سے لگا لینے کا متمنی ہو اور اس ۲۵
کی عین تمنا کے وقت وہ محبوب دوڑ کر اُس کو گلے سے لگا لے اور اِس قدر زور سے دباوے کہ اُس کی ہڈیاں بھی ٹوٹنے لگیں۔ اب میں اہلِ وجدان سے پوچھتا ہوں کہ اِس دبانے سے عاشق کو کچھ تکلیف ہوگی یا نہیں۔ یقیناً تکلیف ہوگی۔ لیکن یہ ایسی تکلیف ہے کہ ہزاروں راحتیں اس تکلیف پر قربان ہیں۔ اگر عین اسی تکلیف کی حالت میں محبوب کہے کہ اگر تجھ کو کچھ تکلیف ہو تو چھوڑ دوں اور جو تیرا رقیب سامنے موجود ہے اس کو اسی طرح دبالوں تو وہ کیا جواب دیگا۔ ظاہر ہے کہ یہ جواب دیگا کہ ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ تمہاری تلوار سے ہلاک ہو۔ دوستوں کا سر سلامت رہے کہ آپ اس پر خنجر آزمائی کریں)

اور یہ کہے گا کہ ؎

اسیرت نخواہد رہائی ز بند شکارت نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اس کا شکار جال سے رہائی نہیں ڈھونڈتا ۔۱۲)

غرض اگر عشق و محبت ہے تو اس تکلیف کی اُس کو ذرا پرواہ نہ ہوگی بلکہ اس میں ایک گونہ لذت ہوگی ۔ یہ تجربہ کی بات ہے ۔ آپ اہل اللہ کی حالت کو مشاہدہ کریجئے کہ اُن کو اِس قلتِ مال و تنگئ خرچ سے ذرا روحانی تکلیف نہیں ہوتی بلکہ جس طرح آپ کو ان کی ناداری پر رحم آتا ہے اُنکو آپ کی مالداری پر رحم آتا ہے ۔ حضرت شبلی صاحب رحؒ کسی متنعم کو دیکھتے تو فرماتے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ عَافَانِیْ مِمَّا ابْتَلَاکَ بِہٖ وَفَضَّلَنِیْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقَ تَفْضِیْلًا ط (خدا تعالٰے کا شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اس چیز سے عافیت میں رکھا جس میں تجھ کو مبتلا کیا ہے اور مجھ کو اپنی مخلوق میں سے بہتوں پر فضیلت دی) تو آپ اہل اللہ پر اُن کی ظاہری تکلیف کو دیکھ کر رحم کرتے ہیں مگر اُن کو اپنے اوپر رحم نہیں آتا اس واسطے کہ وہ اس کو پریشانی ہی نہیں سمجھتے اور واقع میں یہ پریشانی نہیں ہے ۔ میں پھر دعوٰی کرتا ہوں کہ متبع سُنّت کو کبھی پریشانی نہیں ہوتی ۔ اُس کی ہر وقت یہ حالت ہوتی ہے ؎ ۲۶

کوے نومیدی مرو کامیدہاست ۔۔۔ سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(ناامیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی اُمیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ چلو بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالٰے سے ناامید نہ ہو بلکہ اُمیدیں رکھو۔)

اور اُمید وہ چیز ہے کہ جن لوگوں نے بی ۔ اے پاس کیا ہے ان سے پوچھئے کہ امتحان کی تیاری میں کیا کیا مشقتیں اُٹھائی ہیں محض اُمید کامیابی پر کسی نے خوب کہا ہے ؎

اگرچہ دُور اُفتادم بایں اُمید خورسندم ۔۔۔ کہ شاید دست من بار دگر جانانِ من گیرد

(اگرچہ میں محبوب سے دور پڑا ہوں اس اُمید میں خوش ہوں کہ شاید میرا محبوب میرا دوبارہ ہاتھ پکڑلے)

خاص کر جو لوگ ایک دو مرتبہ فیل بھی ہوگئے ہیں اُن پر تو یہ شعر خوب چسپاں ہے اُن کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نہ روٹی کی پرواہ نہ آرام کا

خیال ہر وقت کتاب ہے اور وہ ہیں تو تعجب کی بات ہے کہ دس روپیہ کی ہوس میں روٹی اور آرام چھوڑنے والا تو عالی ہمت سمجھا جائے اور کوئی اس کو مصیبت زدہ نہ سمجھے اور خدا تعالیٰ کا طالب اگر تنعم چھوڑ دے تو وہ پریشانی میں مبتلا سمجھا جاوے غرض وہ دعویٰ ثابت رہا کہ ان لوگوں کو پریشانی نہیں ہوتی (یہاں تک کرنے کے بعد نماز عصر کے لئے سب مجمع اُٹھا۔ بعد نماز عصر پھر بیان شروع ہوا تو فرمایا کہ) میں نے تقریر کو اس مسئلہ پر چھوڑا تھا کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنیوالا ہر قسم کی پریشانی سے محفوظ رہتا ہے اور اس پر جو شبہ ہوا تھا اُس کو بھی زائل کر دیا تھا۔ اب اگر اس کی وجہ بھی سمجھ لی جاوے تو بہتر ہے سو اس کی ایک وجہ تو عقلی ہے اور ایک وجہ عشقی ہے۔ عقلی وجہ تو یہ ہے کہ اس تعلیم میں ہر مفسدہ کی اصلاح ہے اور اس کو اہلِ انصاف نے گو وہ دوسری قوم کے ہوں تسلیم کیا ہے اور اگر کسی نے تعصب سے کام لے کر نہیں مانا ہے تو دوسروں نے اس پر رد کیا ہے۔ دوسری وجہ ایک عشقی ہے کہ وہ دیوانوں کے سمجھنے کی ہے (اور اگرچہ واقع میں یہ درجہ بھی عقلی ہے مگر چونکہ اُس کو عقلاء نے کم سنا ہے اس لئے اس کو عقلی نہیں کہا) اور وہ یہ ہے کہ عقلی قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی صاحب اقتدار کا مطیع ہوتا ہے وہ اس کو پریشانی سے بچاتا ہے تو خدا تعالیٰ سے زیادہ کون صاحب اقتدار ہوگا۔ پس حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے سے چونکہ خدا تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں وہ اُن کو ہر قسم کی پریشانی سے بچا دیں گے۔ ہاں اگر کوئی ایسی پریشانی ہوتی کہ وہ خدا تعالیٰ کے اختیار سے خارج ہوتی تو دوسری بات تھی مگر ساری دنیا کا مسلم مسئلہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے اختیار سے کوئی چیز خارج نہیں البتہ اگر کوئی امر بظاہر پریشانی کا ہو لیکن وہ واقع میں پریشانی نہ ہو تو اُس سے حفاظت کا دعویٰ نہیں جیسے بچہ کی حفاظت

۲۷ تعلیم نبوی پر عمل کرنے والے کے پریشانی سے محفوظ رہنے کی عقلی و عشقی وجہ

ماں باپ کرتے ہیں لیکن اگر کسی عضو میں مادہ فاسد جمع ہو جاتا ہے تو اس کے اخراج کے لئے ماں باپ نشتر بھی دلواتے ہیں بچہ سمجھتا ہے کہ ماں باپ میری بالکل حفاظت نہیں کرتے اور روتا ہے مگر بچہ کی اور مادر مشفق کی رائے میں فرق یہ ہے کہ ؎

طفل مے لرزد ز نیشِ احتجام ۔۔۔ مادرِ مشفق ازاں غم شادکام

(بچہ نشتر لگانے سے لرزتا ہے مگر شفیق ماں اس سے مطمئن اور خوش ہوتی ہے)

تو یہ تکلیف واقع میں راحت ہے اور ایسی پریشانی سے تو کسی مدعا کی طلب میں کوئی بچ نہیں سکتا اور نہ بچنے کی کوشش کرتا ہے وہ عشقی وجہ یہ ہے جو واقع میں عقلی بھی ہے اور میں محض عقلی وجہ پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ قرآن کریم سے بھی اس کو ثابت کرتا ہوں فرماتے ہیں وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ (جو شخص اللہ سے ڈرے اللہ تعالیٰ اس کے واسطے کوئی راہ کر دیں گے اور اس کو ایسی جگہ سے روزی دیں گے کہ اس کا گمان بھی نہ ہوگا)

۲۸ یہ وعدہ ہے خدا تعالیٰ کا۔ غرض یہ دعویٰ اور عقل ہر دو سے ثابت اور مؤید ہے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر عمل کرنے والا کبھی پریشانی میں مبتلا نہیں ہوتا۔ اور جیسا اتباع میں اثر ہے نافرمانی میں بھی یہ اثر ہے کہ نافرمان ہر دم پریشانی میں مبتلا رہتا ہے اور گو یہ اس کو راحت سمجھتے ہیں مگر واقع میں وہ پریشانی ہے اِس لئے ضرور ہوا کہ میں اوّل پریشانی کی حقیقت بتلا دوں۔ سو سمجھئے کہ پریشانی کس کو کہتے ہیں۔ پریشانی کہتے ہیں تشویش قلب کو نہ کہ مشقت ظاہری کو۔ پس آپ دیکھ لیجئے کہ جو لوگ نافرمانی میں مبتلا ہیں اُن کا قلب ہر وقت مکدر اور مظلم رہتا ہے اور جس کا نام جمعیت ہے وہ اُن کو ہرگز میسر نہیں ہوتی اور جس قدر بھی تعلقات دنیا زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں پریشانی بڑھتی چلی جاتی ہے اور اگر کسی کو اُس کی بھی حس نہ رہے تو

(فرمانبردار کبھی پریشان نہیں ہوتا)

(پریشانی کی حقیقت اور نافرمان کے لئے اس کا اثبات)

وہ اِمتحان کرے۔ اور وہ اِمتحان یہ ہے کہ یہ شخص ایک ہفتہ بھر کے لئے فارغ ہو کر خلوص کے ساتھ ذکر اللہ کرے جب ایک ہفتہ گذر جاوے تو دیکھے کہ قلب میں کوئی نئی کیفیت محسوس ہوتی ہے یا نہیں اِنشاء اللہ تعالیٰ ضرور محسوس ہوگی۔ اب اِس کیفیت کو محفوظ رکھے اور خلوت کو چھوڑ دے اِس کے بعد غفلت کے آثار میں تو خود ہی مبتلا ہو جاویگا پھر اس کے ایک ہفتہ بعد اُس پہلی محفوظ کیفیت اور اس ابتلاء کے بعد کی کیفیت کو موازنہ کر کے دیکھے تو مقابلہ ہوگا کہ واقعی میں اِس وقت پریشانی میں ہوں اور حالت موجودہ حالت محفوظہ کے سامنے ظلمت اور پریشانی نظر آوے گی اور حالت محفوظہ جمعیت اور نورانیت معلوم ہوگی۔ یہ ہے اِس کا اِمتحان اِس سے انشاء اللہ تعالےٰ معلوم ہو جاویگا کہ اہلِ دنیا سب پریشانی میں مبتلا ہیں اور بدون اِمتحان اکثر کو اس کی حِس نہ ہوگی۔ کیونکہ جس نے
۲۹ کبھی جمعیت کو نہیں دیکھا وہ پریشانی کو کیا سمجھے۔ وہ تو پریشانی ہی کو جمعیت سمجھے گا مگر اس کو جمعیت سمجھنا ایسا ہے جیسے ایک سرحدی نیہاتی نے اپنی ذلت کو عزت سمجھا تھا۔ مشہور ہے ایک صاحب ہندوستان آئے حلوائی کی دوکان پر پہونچے تو حلوا دیکھکر جی للچایا دام وام پاس نہ تھے آپ نے بغیر پوچھے اُس میں سے بہت سا اُٹھا لیا اور کھا گئے۔ حلوائی نے نالش کر دی۔ قاضی شہر نے یہ تعزیر تجویز کی کہ اِن کو گدھے پر سوار کر کے لڑکوں کو اس کے پیچھے کر دو کہ ڈھول بجاتے چلیں اور تمام شہر میں اسی حالت سے گشت کراؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب وطن واپس گئے تو اہلِ وطن نے پوچھا۔ آغا ہندوستان رفتہ بودی ہندوستان راچہ طور یافتی (آغا ہندوستان گئے تھے ہندوستان کیسا پایا) آپ جواب دیتے ہیں آغا ہندوستان خوب ملک است۔ انجا حلوا خوردن مُفت است۔ سواری خر مُفت است۔ فوج طفلاں مُفت است۔ ڈم ڈم مفت است

(آغا ہندوستان اچھا ملک ہے حلوہ کھانا مفت ہے اور گدھے کی سواری مفت ہے بچوں کی فوج مفت اور ڈم ڈم مفت ہے) تو جیسا ان صاحب کو اِس کیفیت میں لطف آیا تھا ویسا ہی اِس وقت تنعم پرستوں کو ہے کہ آج یہ حشم و خدم عزت اور سامان جمعیت معلوم ہوتا ہے ایک دن حقیقت کھلے گی کہ گدھا ران کے نیچے ہے لیکن سمجھ رہے ہیں کہ گھوڑے پر سوار ہیں کیونکہ گھوڑے پر سوار ہونا نصیب نہیں ہوا اگر کبھی گھوڑے پر سوار ہوں تو معلوم ہو کہ پہلے گدھے پر سوار تھے یا گرد و غبار میں گدھے گھوڑے میں امتیاز نہیں ہوا اِسی کو کہتے ہیں ؎

فَسَوْفَ تَرَىٰ إِذَا انْكَشَفَ الْغُبَارُ ۔۔۔ أَفَرَسٌ تَحْتَ رِجْلِكَ أَمْ حِمَارُ

(عنقریب دیکھے گا تو جب غبار کھلے گا کہ تیرے قدم کے نیچے گھوڑا ہے یا گدھا)

تو جب یہ غبار غفلت کھلے گا اُس وقت معلوم ہوگا کہ ران کے نیچے کیا چیز تھی ۔ بہرحال مخالفت میں کبھی جمعیت نہیں ہوتی ۔ تو اُس تمام تقریر سے معلوم ہوا ہوگا کہ عمل کتنی ضروری چیز ہے اور بے عمل کتنی پریشانی میں ہیں پس عمل کی ضرورت تو اس سے ظاہر ہوگئی اور علم موقوف علیہ ہے عمل کا سو وہ بھی اِسی سے ضروری ٹھیرا ۔ غرض دو چیزوں کی ضرورت متحقق ہوئی علم کی اور عمل کی اور علم کے لئے تعلیم کی ضرورت ہے اور عمل کے لئے تربیت کی ضرورت ہے اور ان دونوں کے لئے صحبت کی ضرورت ہے پس صحبت اس درجہ کی ضروری ٹھیری ۔ بلکہ میں ترقی کرکے کہتا ہوں کہ اگر کسی کو کتابی علم نہ ہو اور محض صحبت ہو تو بقدر ضرورت کفایت ہوجاتی ہے ہاں اِصطلاحی مولوی نہیں ہوگا کیونکہ یہ کمال علمی تو بدون درس و تدریس کے نہیں ہوسکتا مگر ہاں بقدر ضرورت حاصل ہوسکتا ہے بلکہ اگر حافظہ اور تدین کامل ہو تو کمال علمی بھی صرف صحبت سے بدون درس تدریس کے حاصل ہوسکتا ہے چنانچہ اکثر صحابہ کرام کا علم زیادہ تر

۳۰

علم و عمل کیلئے صحبت کی ضرورت

صحبت یعنی اصطلاحی علم بھی کافی ہے

خالی صحبت سے بدون کتب و درس ہی کے متابعد کو چونکہ حالت بدل گئی اِس لئے اُس کی حفاظت کی غرض سے مدون کرنے کی ضرورت ہوئی کہ اگر مدون نہ ہوگا تو لوگ محفوظ نہ رکھیں گے یا ان کے دعویٰ حفظ یا صحت نقل پر اعتماد نہ ہوگا تو تدوین اور تدریس کی ضرورت لغیرہ ہے لعینہٖ نہیں ہے تو تعلیم والا تو صحبت سے مستغنی نہیں اور صحبت والا تعلیم کتابی سے مستغنی ہو سکتا ہے۔ یہ تو گفتگو تھی تعلیم کے موقوف ہونے میں صحبت پر۔ اب دوسرا جُز تربیت جس کی ضرورت تعلیم سے بھی زیادہ ہے سو وہ بدون صحبت کے کسی درجہ میں بھی حاصل نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ غیر اہلِ ملّت نے بھی اس کی ضرورت سمجھی چنانچہ کالجوں میں جو بورڈنگ بنائے جاتے ہیں اور شہر کے بچوں کو بھی ان میں رکھا جاتا ہے محض اِس لئے کہ اساتذہ کے خواص طبیعت اُن میں پیدا ہو جاویں اور یہ میں نے اِس لئے نقل کیا کہ آجکل کے مذاق

۳۱ والے لوگ بھی مطمئن ہو جاویں ورنہ ہم کو غیر ملّی لوگوں کے طرزِ عمل کے نقل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہم تو اس کو ایسا یقینی سمجھتے ہیں کہ جس میں ذرا بھی شک نہیں کیونکہ ہم کو تو روز مشاہدہ ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ذی علم لوگ میرے پاس اصلاح کے لئے آتے ہیں اور اُن کے اخلاق اچھے نہیں ہوتے اور وہ چاہتے ہیں کہ کچھ ذکر و شغل پوچھ کر چلے جاویں لیکن میں بجائے ذکر و شغل سکھلانے کے اُن کو وہاں رہنے کا مشورہ دیتا ہوں اور وہ رہتے ہیں۔ چند روز تک اس مجمع میں رہنے سے کسی نہ کسی کی برکت سے اُن کی حالت درست ہو جاتی ہے اگرچہ وہ برکت کسی چھوٹے ہی کی ہو۔ اور اسی لئے بڑوں کو بھی ضرورت ہے چھوٹوں کی کیونکہ کبھی اُن کی برکت سے بڑوں کی اِصلاح ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم چھ ماہ یا سال بھر تک ہمارے پاس رہو اور یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی مگر پھر جب رہتے ہیں اور

تربیت میں صحبت کی ضرورت ہے

پہلی حالت میں تغیر شروع ہوتا ہے اور بات بات پر ان کو روکا ٹوکا جاتا ہے تو ان کی سمجھ میں آتا ہے کہ واقعی اس کی ضرورت تھی تو چونکہ ہم کو ایسے واقعے ہمیشہ پیش آتے ہیں اس لئے ہم کو تو اہلِ تمدن کے قول کے نقل کرنیکی ضرورت نہ تھی مگر چونکہ آجکل لوگوں کو بدون اس کے تسلی نہیں ہوتی اس لئے انکی حکایت بھی نقل کردی پس ہم کو دو جماعتوں کی ضرورت ہے ایک تو وہ جماعت جس سے تعلیم حاصل کریں دوسری وہ جماعت جس سے تربیت ہو۔ اب اس کے متعلق دستورالعمل بتلانا رہا سو اس دستورالعمل میں تفاوت ہوگا۔ کیونکہ دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو کہ پڑھے لکھے نہیں ہیں تو ان کے لئے تو اور دستورالعمل ہوگا اور وہ یہ ہے کہ اگر ان کو فراغ ہو تو اول درس کتابی کے ذریعہ سے علوم کی تحصیل کرائی جاوے۔ اگر پورا عالم بھی نہ بنے تو کم از کم دو چار برس تک اسی کام میں لگا رہے اور ان دو چار برس میں کوئی دوسرا کام نہ ہو (یہ میری رائے ہے) شغل علم میں یہ حالت رہے کہ ۳۲

"چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد" (جب مرتا ہے مبتلا مرتا ہے جب اٹھتا ہے مبتلا اٹھتا ہے)

اب یہ آپ کو اختیار ہے چاہے جتنی مدت تجویز کریں مگر کم از کم ایک سال ضرور ہو اور ایک سال کے بعد اگر علوم معاشیہ کی بھی حاجت ہو تو تعلیم دین و دنیا مخلوط رہے اور ان میں جو لوگ تکمیل کرسکیں ان کی تکمیل بھی کرائی جاوے کہ اس کی بھی سخت ضرورت ہے جس کو لوگ بیکاروں کا کام سمجھتے ہیں۔ میرے پاس کلانور کے ایک شخص آئے میرے بھتیجے کے متعلق پوچھنے لگے وہ کیا کرتا ہے؟ میں نے کہا عربی پڑھتا ہے۔ کہنے لگے کہ عربی کے بعد انگریزی کا بھی ارادہ ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ کہنے لگے تو اس کو ترقی نہ کرائی جاوے گی کہ انگریزی پڑھ کر بڑے بڑے عہدے حاصل کرے۔ میں نے کہا کہ اگر سب اسی میں مشغول ہوں تو پھر دین کا خادم کون بنے آخر اس کی بھی تو ضرورت ہے کہنے لگے کہ اس کے لئے مدرسہ دیوبند سے ہر سال

علوم دینی کی تحصیل کا دستورالعمل طلبہ کیلئے

ناخواندوں کا دستورالعمل

بہت لوگ نکلتے ہیں میں نے کہا سبحان اللہ کیا انصاف اور خیر خواہی ہے اگر مولوی ہونا ترقی کی بات ہے تو میرے بھتیجے کے لئے کیوں نہ تجویز ہوا اور اگر تنزل اور ذلت کی بات ہے تو دیوبند کے طالب علموں کے لئے کیوں تجویز ہو کیا وہ قوم کی اولاد نہیں۔ غرض جو لوگ فارغ ہو سکیں اُن کو پورا مولوی بنایا جاوے اور اس کے لئے اُمراء کے بچے زیادہ مستحق ہیں کیونکہ غبار معاش سے مستغنی نہیں ہو سکتے۔ پس یا تو وہ دوسرے کام میں لگ کر علم کو ضائع کریں گے اور یا بعضے علم کو ذریعہ کسب بنا دیں گے جس کے بعد نہ اُن کے وعظ میں اثر ہوگا نہ اُن کے فتوے معتبر سمجھے جاویں گے اور اُمراء مستغنی ہیں اس لئے اُن کے اصلاحات کا اثر زیادہ ہوگا اس لئے اُمراء پر لازم ہے کہ اپنے بچوں میں سے ایک دو کو ضرور تکمیل علوم دینیہ کے لئے منتخب کریں مگر انتخاب کا وہ قاعدہ نہ ہو جو اب تک ہوتا چلا آرہا ہے یعنی جو سب سے زیادہ غبی اور کودن ہو اسی کو عربی کے لئے تجویز کر لیا۔ اور پھر خود ہی مولویوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ بیوقوف ہوتے ہیں۔ صاحبو! مولوی تو بیوقوف نہیں ہوتے لیکن بیوقوف مولوی بنا دیئے جاتے ہیں۔ اب تم انتخاب اس طرح کرو کہ جو ذہین اور ذکی ہو اُس کو مولویت کے لئے تجویز کرو پھر دیکھو کہ مولوی کیسے عقلمند اور ہوشیار ہوتے ہیں مگر لوگوں کی تو حالت عام طور سے یہ ہو گئی ہے کہ جو چیز کسی کام کی نہ ہو وہ اللہ میاں کے نام بھینٹ چڑھائی جاتی ہے اللہ میاں کو جانے لوگوں نے کیا سمجھ رکھا ہے کہ جو چیز کسی کے کام کی نہ ہو وہ اللہ میاں کے نام۔ اسی لئے کودن وغبی اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے۔ تو اس انتخاب سے معاف کیجئے کیونکہ اس انتخاب میں پڑھنے والے کا تو نفع ہے لیکن قوم کا کوئی نفع نہیں قوم کو ایسے لوگوں سے نفع ہو سکتا ہے کہ جو سیر چشم اور ذہین ہوں یہ دستورالعمل تو اُن ناخواندہ لوگوں کے لئے ہوا جو کہ خواندہ ہو سکتے ہیں اور جو ناخواندہ

لوگ بوجہ فراغ نہ ہونے کے باقاعدہ نہ پڑھ سکیں وہ کبھی کبھی علماء کے پاس جایا کریں اور اُن سے علمِ دین کی باتیں پوچھا کریں۔ اور آجکل لوگ گو علماء سے ملتے ہیں لیکن بہت ہی بُری طرح یعنی اُن کو اپنے مذاق کے تابع کرتے ہیں کہ اخبار وکیل میں یوں لکھا ہے اور وطن میں یہ خبر شائع ہوئی ہے۔ صاحبو اُن کو تو وطن اور وکیل کی ضرورت نہیں تم اپنے وطن کی خبر لو اور اپنے وکیل بنو یعنی اُن کے پاس جاکر اپنے افعال اور امراض سے اُن کو مطلع کرو اور اس کی اِصلاح پوچھو۔ یہ تعلیم کی صورت ہے غیر فارغین کے لئے۔ جب اس مختلف طریق سے علوم حاصل ہو جاویں پھر صحبتِ صالحہ کی تدبیر کرو۔ خود بھی صلحاء کے پاس جاؤ اور اپنے بچوں کو بھی علماء کے پاس لیجاؤ اور اُن کو وہ باتیں سُناؤ دیکھو اب بچے چھٹی میں آتے ہیں لیکن محض فٹ بال اور کرکٹ میں سارا وقت صَرف ہوتا ہے۔ کم سے کم ایک گھنٹہ روزانہ اس کے لئے ضرور دو کہ وہ کسی عالِم کے پاس جاکر بیٹھا کریں۔ یہ سب تفصیل ہوئی ناخواندوں کے دستور العمل کے متعلق۔ اب دوسرے وہ لوگ ہیں کہ وہ بقدر کافی لکھے پڑھے ہیں اور علوم ضروریہ میں معتدبہ اِستعداد رکھتے ہیں کہ ان کو اِصطلاحی مولوی کہہ سکتے ہیں اور وہ اِس واسطے اپنے لئے ضرورت تعلیم کی یا تربیت کی بھی نہیں سمجھتے۔ میں اُن کے لئے یہ کہتا ہوں کہ گو وہ خود فاضِل ہونے کے سبب علوم میں بدرجۂ اعتماد علماء کے معتقد نہ ہوں مگر علوم میں علماء سے مراسلت ضرور رکھیں۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ فلاں عالِم سے پوچھو بلکہ یہ کہتا ہوں کہ سب سے پوچھو اور بہتر تو یہ ہے کہ مسائل علمیہ میں ہر ہفتہ چار مولویوں کے پاس خط بھیجا کرو اور اُن کے جوابوں کو مقابلہ کر کے دیکھا کرو ہم کسی خاص مولوی کا مقید نہیں کرتے اور مقابلہ کے وقت بدون رائے قائم کئے ہوئے دونوں کے جواب کو اِنصاف سے دیکھو اور اگر خدشہ رہے تو بدون اِظہار نام ایک کے دلائل کو دوسرے کے سامنے پیش کرو اسی طرح اگر آپ کیا کریں گے تو

اِنشاء اللہ تعالیٰ تمام مسائل میں حق واضح ہوجاویگا اور اگر بفرض محال کسی مسئلہ کی حقیقت واقعیہ مخفی بھی رہ گئی تب بھی آپ پر قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا ورنہ سخت اندیشہ ہے اور جن کو مناسبت علوم سے اِس درجہ کی نہیں اور وہ موازنہ اور مقابلہ نہیں کرسکتے ان کے لئے یہ طریق ہے کہ وہ کسی ایک کو اختیار کرلیں جیسے کسی شخص کو طب سے مناسبت نہ ہو تو وہ اختلاف اطباء کے وقت کیا کریگا اور اس کے لئے کیا مناسب ہے آیا دونوں کے نسخوں کو دیکھ کر ترجیح دینا یا اجمالی دلائل سے کسی ایک کو اِنتخاب کرلینا ؎

دلارامے کہ داری دل دردبند　　دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

(جس دل آرام یعنی محبوب سے تم نے دل لگا رکھا ہے اس کے لئے تمام دنیا سے آنکھیں بند کرلو ۱۲)

اور یہیں سے یہ بھی حل ہوگیا ہوگا کہ اگر مولویوں میں آپس میں اختلاف ہو تو کیا کریں اور کِس کے قول پر عمل کریں تو جواب یہی ہے کہ اطباء میں بھی تو آپس میں اختلاف ہوتا ہے پھر وہاں کیا کرتے ہو یہی کرتے ہو کہ جو سب میں بڑا ہو اُس سے رجوع کرتے ہو اور بڑا ہونے کی علامت یہ ہے کہ اُس نے کسی ماہر سے حاصل کیا ہو مہارت سے کام کر رہا ہو اُس کے ہاتھ سے اکثر لوگ شفایاب ہوتے ہوں تو جب علماء میں اختلاف ہو تو یہی دیکھو کہ یہ کِس کے شاگرد ہیں کتنے دنوں سے دین کی خدمت کرتے ہیں لوگوں کو اُن سے کیسا فائدہ پہنچ رہا ہے۔ اگر ایک کا اُستاد دین میں بڑا ماہر تھا اور یہ مدت سے دین کی خدمت بھی کر رہا ہے جو علامت ہوگی مہارت کی۔ اس کے اصحاب دین کا پہلو بھی زیادہ لئے ہوئے ہیں جو بجائے دست شفائے طبیب کے ہے اور دوسرے میں یہ بات نہیں تو پہلے کو لے لو اور دوسرے کو چھوڑ دو۔ یہ علماء میں اِنتخاب کا طریقہ ہے مگر یہ طریقہ ان کے لئے ہے جو قوت فیصلہ نہیں رکھتے باقی جو لوگ قوت فیصلہ رکھتے ہیں ان کو چاہیئے کہ مفصل دونوں جگہ تحقیق کریں اور پھر موازنہ کریں جیسا اوپر مذکور ہوا۔ یہ تو تعلیم کی بابت تھا۔ اب رہ گئی

تربیت اُس میں خواندہ ناخواندہ سب کا ایک ہی دستور العمل ہے وہ یہ کہ اُس کے لئے ایسے شخص کو انتخاب کریں جس نے اپنے اخلاق درست کر لئے ہوں اور اس کا اندازہ مشاہدہ علامات سے ہو سکتا ہے کہ متعدد مشائخ کو جا کر دیکھیں اور یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ دیکھئے دنیا کے ایک سودے کے لئے شہروں میں مارے مارے پھرتے ہیں تو اگر بزرگوں کی تلاش میں بھی دو چار جگہ ہو آویں تو کیا مشکل ہے اور وہ علامات یہ ہیں کہ دیکھیں کون بزرگ ایسا ہے جو علم دین بقدر ضرورت رکھتا ہو اور علم پر عمل کرتا ہو اپنی متعلقین پر شفقت کے ساتھ احتساب کرتا ہو اور اُس کی صحبت میں لوگوں کو دنیا سے دلبستگی نہ رہتی ہو اُس کے پاس رہنے والے غالب دیندار ہوں جو شخص ایسا ملے اُس کے پاس آمد و رفت رکھے اور جب موقع ملے چند روز تک اس کے پاس رہے اس کے اخلاق درست ہو جائیں گے کیونکہ جب پاس رہیگا تو دیکھے گا کہ اُس نے چار موقع پر غصہ کو ضبط کیا ہے تو ایک جگہ خود بھی ضرور ضبط کریگا اور اسی طرح عادت ہو جاویگی اور اگر پاس رہنا ممکن نہ ہو تو ایسے شخص سے مراسلت ہی رکھو اپنے امراض لکھ کر بھیجو کہ مجھے حرص ہے طمع ہے بے استقلالی ہے پھر وہاں سے جو کچھ لکھ کر آوے اُس پر عمل کرو وہ حضرات تہذیب اخلاق کے لئے وظیفہ نہ بتلا دیں گے بلکہ تدابیر بتلاوینگے اور گو وہ کتابوں میں بھی ہیں لیکن وہ مبتدی کو مفید نہیں ہوتیں اس لئے کہ کتابوں میں کلیات ہیں باقی اپنے حالات جزئیہ کا منطبق کرنا اُن کلیات پر اس کے لئے فہم کافی نہیں۔ تو یہ تو تربیت کا طریق ہے خواہ مجالست سے ہو یا مراسلت سے ہو اور یہ طریقہ جیسا آپ کے لئے ہے آپ کے بچّوں کے لئے بھی ہے اگرچہ وہ انگریزی وغیرہ ہی میں مشغول ہوں اس حالت میں ایسا ہونا چاہیئے کہ چھٹی میں کم سے کم ایک چوتھائی چھٹی کا اُن بزرگ کے پاس گزاریں۔ خربزہ کو دیکھ کر خربزہ رنگ پکڑتا ہے اگر سال بھر میں

عورتوں کا دستور العمل

علماء و مشائخ کی عیب گیری اور اس کا جواب

ایک ماہ بھی آپ کے بچے کسی ایسے شخص کی صحبت میں رہ لیں گے تو ان کو نہ سائنس مضر ہو سکتا ہے نہ انگریزی۔ یہاں تک مَردوں اور بچوں کی تربیت کا دستور العمل مذکور ہوا۔ اب رہ گئیں عورتیں تو عورتوں کے لئے ایک تو یہ صورت ہے کہ اگر خاندان میں کوئی بزرگ عورت ہو تو اُن کے پاس جا کر بیٹھیں اور اگر نہ ہو تو اُن کو بزرگوں کے ملفوظات سُناؤ اور زندہ بزرگوں کے حالات سُناؤ اور ان کو ایسی کتابیں دو تاکہ وہ اُن کو پڑھا کریں۔ علامہ غزالی علیہ الرحمۃ کی کتابیں سُناؤ میں نے اِس کا تجربہ کیا ہے بہت نافع ہوتی ہیں یہ دستور العمل ہوا تعلیم اور تربیت کا جن میں ایک کا تعلق علماء سے ہے دوسرے کا مشائخ سے۔ اب ان دونوں جماعتوں کے متعلق لوگ ایک غلطی کرتے ہیں وہ غلطی یہ ہے کہ ایک عیب تو علماء میں نکالا جاتا ہے کہ باعمل نہیں اور اِس لئے اُن سے علوم بھی اخذ نہیں کرتے اور اسی طرح ایک عیب مشائخ میں نکالا جاتا ہے کہ عالم متحقق نہیں اور اس لئے ان سے اپنی تربیت کا طریق نہیں حاصل کرتے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی جامع شخص ملے تو ایسے جامع نواب کم ملیں گے۔ صاحبو! اگر ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کی برابر جامع نہ ملے تو کیا حرج ہے اور اگر دین کی تحصیل میں ایسا ہی کمال شرط ہے تو پھر تحصیل دنیا میں بھی ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ پس نوکری بھی نہ کیا کرو کیونکہ سلطنت نہ ملی تو نوکری کیا ہوگی اور اِس کے جواب میں کہو کہ وہ نہیں یہی سہی تو یہاں بھی میں یہی کہوں گا کہ ابو حنیفہؒ نہیں تو آجکل کے مولوی ہی سہی۔ اِسی طرح مشائخ میں جنید بغدادیؒ کی تلاش ہوتی ہے وہاں بھی یہی جواب ہے۔ نیز اگر جنید کو تلاش کرتے ہو تو تم بھی اُن ہی کے مستفیدین جیسی طلب بھی تو پیدا کرو۔ صاحبو! یہ غنیمت سمجھو کہ تمہاری طلب کے موافق تو بزرگ مل گئے۔ غرض علماء میں تو یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ علماء میں عمل نہیں ہوتا اور بعض کے اعتبار سے یہ سچ بھی ہے مگر

اوّل تو سب علماء کو بے عمل سمجھنا غلطی ہے بہت علماء باعمل بھی ہیں اور میں اُنکا نام بھی بتلا دیتا مگر جب لوگ پوچھتے ہی نہیں تو میں کیوں بتلا کر بیقدری کروں اور اگر باعمل لوگوں میں بھی عیوب نکالے جائیں کہ فلاں عالم میں یہ عیب ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ "ہیچ نفس بشر خالی از خطا نبود" (کسی بشر کا نفس خطا سے خالی نہیں) دوسرے اگر بے عمل بھی ہوں تو دیکھو اگر حکیم محمود خاں بد پرہیز ہوں تو کیا اُن سے نسخہ نہ لکھواؤ گے۔ ضرور لکھواؤ گے۔ سو تعلیم میں اُن کے عمل کو کیا دخل ہے ہاں تربیت اگر اُن سے نہ کراؤ تو گنجائش ہے مگر تعلیم علم کے لئے تو وہ کافی ہیں مثلاً اگر آپ ان سے رویۃ الہیہ یا جبر و قدر کا مسئلہ پوچھئے تو اس میں ان کے عمل کو کیا دخل۔ اور اِسی قبیل کا شبہ علماء کے متعلق بھی ہے کہ علماء میں اختلاف ہے ہم کس کی مانیں تو میں کہہ چکا ہوں کہ قواعد سے ایک کو ترجیح دیکر اُس کی مانو جیسے اگر مختلف وکلاء کے پاس جاؤ اور وہ مقدمہ میں مختلف رائیں دیں تو آخر ایک کو ترجیح دوگے جب ہر امر میں یہی قاعدہ ہے تو دین میں ہی سارے شبہات کیوں کئے جاتے ہیں اور ان قواعد ترجیح کا اوپر بیان ہو چکا ہے غرض علماء، چاہے بدعمل ہوں مگر اُن سے علم حاصل کرو۔ اِسی طرح مشائخ میں یہ عیب نکالا جاتا ہے کہ پورے مولوی نہیں اور اِس لئے شیوخ ایسے ڈھونڈتے ہیں جو پورے عالم بھی ہوں یعنی اُن کی درسی کتابیں کل ختم ہوں۔ صاحبو! جس طرح تعلیم علوم میں پورے باعمل ہونے کی ضرورت نہیں اِسی طرح تربیت میں پورے ہونے کی ضرورت نہیں البتہ بقدر ضرورت علم ہونا ضرور ہے ایسا نہ ہو جیسے ایک فقیر کی نسبت لکھا ہے کہ اُس نے مجاہدہ کرنے کے لئے ایک نتھنے میں گوُ کی بتّی دے رکھی تھی اور ایک آنکھ پر موم کی ٹکیا رکھ لی تھی کہ جب ایک آنکھ سے کام چلتا ہے تو دوسری کی کیا ضرورت اور ایک نتھنے سے پھولوں کی خوشبو سونگھتے ہیں تو دوسرے سے غلیظ سونگھ کر اُس کی مکافات ہونی چاہئے گویا اللہ میاں

کو بھی آپ نے رائے دی تھی کہ دو آنکھیں فضول بنائی ہیں۔ اتفاق سے کوئی صحبت یافتہ علماء کا اس کے پاس جا پہونچا اور اُس کو اطلاع دی کہ تمہارا تو وضو نماز سب غارت ہے آخر وہ بہت رویا اور اپنی اصلاح کی۔ اس لئے علم بقدر ضرورت تو ہونا ضروری ہے مگر کمالِ علم کی ضرورت نہیں۔ بس علماء کے علم کو دیکھو عمل کو مت دیکھو اور مشائخ میں عمل کو دیکھو کامل علم کی تلاش کرو۔ البتہ اگر اتفاق سے کوئی ایسا مل جاوے کہ وہ عالم بھی ہو اور شیخ بھی سبحان اللہ اُس کی تو وہ حالت ہے ؎

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد　　برنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنی را

(اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

تو پھر اُسی ایک ہی سے تعلق رکھو اور اگر ایسا نہ ملے تو دو سے تعلق رکھو اور دو کچھ زیادہ نہیں دنیا کے لئے تو ہزاروں سے تعلق رکھتے ہو تو اگر دین کے لئے دو کے ناز اُٹھا لو تو کیا تعجب ہے اس تعمر ہزارہا سے جو اصل مقصود ہے یعنی حق تعالیٰ وہ تو ایسا ہے کہ اگر اس کے لئے ہزار سے بھی تعلق رکھا جاوے اور ان کی ناز برداری کی جاوے تو کم ہے ؎

کشند از برائے دلے بارہا　　خورند از برائے گلے خارہا
طلبگار باید صبور و حمول　　کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(ایک دل کیلئے بہت سی تکلیفیں اُٹھاتی ہیں، ایک پھول لینے بہت سی کانٹے کھاتے ہیں طالب چاہیے صبر کرنیوالا اور مشقت برداشت کرنیوالا میں نے کسی کیمیا گر کو

اور اسی میں یہ بات بھی آگئی کہ اگر ایک سے ناکامی ہوئی تو دوسرے سے رجوع کرو جیسے کوئی مریض کہ معالجہ میں اُس کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

دست از طلب ندارم تا کام من برآید　　یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن برآید

(طلب سے باز نہ رہوں گا جب تک میرا مقصد پورا نہ ہو جائے یا تو تن محبوب حقیقی کے پاس پہونچ جائے یا جان تن سے نکل جائے۔)

اسی کو کہتے ہیں ؎

طلبگار باید صبور و حمول　　کہ نشنیدہ ام کیمیا گر ملول

(طالب کار صبور و حمول چاہیئے کہ ہم نے کیمیا گر کو ملول نہیں دیکھا)

عمر بھر اسی دُھن میں رہو پھر ممکن نہیں کہ محروم رہو ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد — اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

(ایسا کوئی نہیں کہ عاشق ہوا ہو محبوب نے اس کے حال پر نظر نہ کی ہو اے صاحب درد ہی نہیں ورنہ طبیب ہے)

اور اسی دُھن باقی رکھنے کے لئے فرماتے ہیں ؎

اندریں راہ می تراش می خراش — تا دم آخر دمی فارغ مباش

تا دم آخر دمی آخر بود — کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس طریق وصول الی اللہ ہمیشہ اُدھیڑبن میں لگے رہو اور آخر وقت تک ایک لحظہ بھی فارغ مت رہو۔ آخر وقت تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہمراز و رفیق بن جاوے گی)

یعنی کوئی وقت ایسا ضرور ہوگا کہ مقصود تک رسائی ہوگی۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور ہر چند کہ میں نے کہا تھا کہ میں ان علماء باعمل کے نام نہ بتلاؤں گا مگر پھر یہی رائے ہوئی کہ بتلا دوں لیکن اس لئے نہیں کہ خواہ مخواہ ان کے معتقد ہی ہو جاؤ۔ میرے کہنے سے تو اس وقت معتقد ہو کہ میرے معتقد ہو سو میں کہتا ہوں کہ آپ ہرگز میرے معتقد نہ ہوں میں خود قابل اعتقاد نہیں صرف مسائل بتلانے والا ہوں اور یہ کہنا میرا تواضعاً نہیں نہ اس میں مجھے تواضع کرنے کی ضرورت ہے جو چیز اپنے پاس ہے اس کو ظاہر کرتا ہوں۔ میں بحمد اللہ علم ضروری جانتا ہوں اس کے بتلانے کے لئے میں تیار ہوں۔ گو وہ کامل نہیں ہے چنانچہ بہت سی باتیں مجھے معلوم بھی نہیں اور اگر مجھ سے کوئی ایسی بات پوچھی جاویگی اُس کے متعلق میں یہ کہہ دوں گا اور کہہ دیتا ہوں کہ میں نہیں جانتا۔ پس علم ضروری کا انکار نہیں اور قابل اعتقاد ہونے کا دعویٰ نہیں اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ میرے کہنے سے ان بزرگوار کے معتقد ہو جاؤ۔ خود جانچو۔ دیکھو سو اس غرض سے نام نہیں بتلانا بلکہ محض اطلاع مقصود ہے سو وہ بزرگ یہ ہیں۔ ایک مولانا عبدالرحیم صاحب

اس زمانہ میں ارباب دین اور شیخ باعمل کے نام گنانا حضرات ہیں

رائے پوری جو اِسی جلسہ میں تشریف فرما ہیں۔ یہ تو تربیت کے لئے کافی ہیں۔ دوسرے بزرگ حضرت مولانا محمود حسن صاحب کہ وہ افادۂ علم اور تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ تیسرے بزرگ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کہ وہ بھی تعلیم اور تربیت دونوں کے لئے کافی ہیں۔ اور نام اِس وقت میں نے نہیں لئے۔ میں نے ایک تنبیہات وصیت لکھی ہے اُس میں چند بزرگوں کے نام لکھ دیئے ہیں آپ خود اُن کا اِمتحان کرلیں۔ لیکن اِمتحان ایک دو دفعہ کے ملنے سے نہیں ہوتا۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کو اکثر لوگ خشک مزاج بتلاتے تھے کیونکہ یا تو کبھی ملے نہیں اور یا اگر ایک دو دفعہ ملے تو اتفاق سے ایسے وقت ملے کہ مولانا کسی دوسرے شغل یا احتساب میں مشغول ہوئے۔ بس اس ایک جلسہ میں دیکھ کر عمر بھر کے لئے ایک غلط حکم کردیا اس کی ایسی مثال ہے کہ کوئی شخص سُنے کہ فلاں جج صاحب بڑے خوش خلق ہیں اور یہ سُنکر اُن سے ملنے کو عدالت میں جاوے اور اتفاق سے ایسے وقت پہونچے کہ صاحب جج دو آدمیوں کو حبس دوام کا حکم سُنا رہے ہوں اور دو کو پھانسی کا حکم سُنا رہے ہوں تو یہ شخص یقیناً اُس جج کو نہایت درجہ خونخوار سمجھے گا لیکن عقلمند آدمی کہے گا کہ بھائی تم نے عدالت میں دیکھا پھر اتفاق سے اُس وقت سنگین مقدمات پیش تھے ذرا اُن کے بنگلہ پر جاکر تو دیکھو اسی طرح بزرگوں کے پاس ایک وقت جاکر دیکھا اور کہہ دیا کہ نہایت خشک ہیں۔ صاحبو! کم از کم ایک ایک ہفتہ تک رہ کر تو دیکھو۔ اور اگر پھر بھی سوائے اپنے کوئی پسند نہ آوے تو ہم اس کا علاج نہیں کرسکتے۔ شاید اِس فہرست سے کسی کو یہ شبہ ہو کہ اپنے ہی سارے بزرگوں کا نام دے دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ

رلی بھگت ہے۔ تو اوّل تو خدا تعالےٰ جانتا ہے کہ ملی بھگت ہے یا کیا۔ دوسرے میں نے تو بیعت کرنا بھی چھوڑ دیا ہے پھر ملی بھگت کا احتمال رہا۔ صرف جو مجھ کو معلوم تھا بتلا دیا۔ ہاں یہ شبہ تو اب بھی رہا کہ بزرگوں کی تعریف کرنا درحقیقت اپنی تعریف ہے کہ ہم بھی بزرگ ہیں کہ بزرگوں کو پہچانتے ہیں ؎

مادح خورشید مداح خود است — کہ دو چشمم و نا مرمد است

(آفتاب کی تعریف کرنیوالا خود اپنی تعریف کرنے والا ہے اِس لئے کہ اس کی دونوں آنکھیں اس سے روشن ہیں)

سو اس کا جواب یہ ہے کہ خیر یہی سہی آپ یوں ہی سمجھیں اِس سے ہم کیونکر بچیں۔ دوسرے آپ کو کیا خبر ہے کہ میں نے خود پہچان کر ہی کہا ہے تاکہ وہ شبہ ہو ممکن ہے کسی بزرگ سے سُنکر ہی کہا ہو اور اُس کی بزرگی اَنْتُمْ شُھَدَاءُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ کے قاعدے سے محقق ہوئی ہو بہرحال آپ ان سب کو دیکھئے اور سب کا اِمتحان کیجئے ؎

مانصیحت بجائے خود کردیم — روزگارے دریں بسر بردیم

گر نیاید بگوشِ رغبت کس — بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(ہم نصیحت بجائے خود کی ہے اور ایک زمانہ اس میں گذارا ہے اگر کسی سننے کی رغبت نہ تو رسول پر بس پہونچا دینا کوئی عمل کرے یا نہ کرے)

پس اسی صحبت کے نافع ہونے کی بنا پر فرماتے ہیں کہ اپنے صحابہ رضؓ کو محروم نہ کیجئے اور اپنے نفس کو اُن کے ساتھ جمائیے۔ اب میں آیت کا خالی ترجمہ کرکے ختم کئے دیتا ہوں۔ ترجمہ یہ ہے کہ اے محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے کو ایسے لوگوں کے ساتھ جما کر بٹھلائیے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام پکارتے ہیں اور آپ کی آنکھیں اُن سے ہٹنے نہ پاویں (یعنی آنکھیں بھی اُدھر ہی متوجہ رہیں) اس سے

بھی میں ایک دوسرا مسئلہ استنباط کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ بزرگوں کی توجہ سے بھی نفع ہوتا ہے تو گویا اوّل جملہ میں تعلیم کا بھی اشارہ ہوا کہ پاس بیٹھنے سے احکام بھی حاصل ہوں گے اور دوسرے میں تربیت کا۔ آگے فرماتے ہیں تُرِیْدُ زِیْنَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (دنیوی زندگی کے رونق کے خیال سے) اس کو بعض نے مستقل جملہ کہا ہے یعنی کیا آپ دنیا کی زینت چاہتے ہیں۔ مگر میں نے اس کو جملہ حالیہ سمجھا ہے اور لَا تَعْدُ میں منفی کو اس کا عامل اور عَیْنَاکَ کو بوجہ اقامت عین مقام ذات ذوالحال اور مقید کی نفی یہاں قید اور ذی قید دونوں کے ارتفاع سے ہے یعنی جو عدوان بارادۂ زینت حیوٰۃ دنیا ہوتا وہ متروک ہے۔ اِس طرح سے کہ عدوان ہے نہ ارادۂ زینت پس اس سے وقوعِ زینت کا لازم نہیں آتا۔ آگے دوسری نہی ہے لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوَاہُ وَکَانَ اَمْرُہٗ فُرُطًا یعنی اِن کا کہنا نہ مانو جن کو ہم نے ذکر سے غافِل کر دیا ہے اور اُس نے اپنی ہوائے نفسانی کا اتباع کیا اور اس کا کام حد سے نِکلا ہوا ہے۔ یہاں سے ایک تیسری بات بھی معلوم ہوئی کہ مشورہ بھی ایسے شخص کا قبول کرے جس کی یہ حالت نہ ہو اَغْفَلْنَا قَلْبَہٗ (ہم نے اس کے دل کو غافل کر دیا ہے) کیونکہ بے دین کے مشورہ میں بھی برکت نہیں ہوتی۔ چنانچہ رؤسارِ کفار کے اس مشورہ تخصیص مجلس کے قبول سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ممانعت فرما دی۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ اس میں تعلیم اور تربیت دونوں کا بذریعہ صحبت نافع ہونا بتلایا ہے اور شیوخ کا بھی علاج کر دیا ہے کہ آپ بھی بے پروائی نہ کریں سُبحان اللہ کیا عجیب جامع جملہ ہے

اب میں ختم کر چکا۔ اور اتمام حجت کے لئے پھر کہتا ہوں کہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے صحبتِ نیک کا اہتمام کرو۔ اب ہر شخص جو چاہے اِس صحبت صالح کے متعلق دستور العمل مقرر کرلے خواہ ہفتہ میں ایک دن یا مہینہ میں دو تین یا سال میں ایک ماہ یا کم وبیش۔ خدا تعالےٰ سے دُعا کیجئے کہ وہ فہم سلیم اور توفیق عمل کی بخشیں

آمین ثم آمین

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

وعظ

مسمّٰی بہ

تذکیر الآخرہ

منجملہ ارشادات

حکیم الامّۃ مجدد الملّۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ ۔ بندر روڈ ۔ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ

تذکیر الآخرہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعۡدُ فَقَدۡ قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی کَلَّا بَلۡ تُحِبُّوۡنَ الۡعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ

(خدا تعالیٰ نے فرمایا ہرگز یوں نہیں بلکہ تم جلدی یعنی دنیا کو دوست رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو) میں اس وقت جس مضمون کو بیان کرنا چاہتا ہوں وہ ایک نہایت ضروری مضمون ہے اور مولوی شبیر احمد صاحب کی تقریر "دارالآخرہ" کا گویا تتمہ ہے۔ مولوی صاحب نے اپنی تقریر میں اعتقاد آخرت کا بیان کیا ہے میں آخرت کے متعلق عمل کا بیان کرنا چاہتا ہوں جو آیت میں نے اوپر تلاوت کی ہے اس میں خداوند تعالیٰ زجر و توبیخ کے ساتھ فرماتا ہے کہ تم لوگ اس چیز کو پسند کرتے ہو جو عاجلہ ہے اور آخرت کو چھوڑے دیتے ہو۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کو لئے ہوئے ہیں اور دنیا میں مبتلا ہیں اور آخرت کو

چھوڑے بیٹھے ہیں ان کے لئے اِس آیت میں تنبیہ ہے پہلا مضمون (مولوی شبیر احمد صاحب کا مضمون) علمی تھا اور یہ گویا عملی ہے اور چونکہ مقصود علم سے عمل ہی ہے اِس لئے یہ میرا مضمون گویا اس مضمون کا متمم (پورا کرنے والا) ہے اور ہر چند کہ بعض علوم ایسے ہیں جو قطع نظر عمل سے خود مِنْ حَیْثُ الْعِلْم (علم کی حیثیت سے) بھی مقصود ہیں اور اِسی لئے حکماء نے بھی اپنے فنون کے مثلاً طب ہی کے دو جز قرار دیئے ہیں علمی اور عملی اور تمام دنیا اِس تقسیم کو مانتی ہے۔ اور یہ دونوں ہی مطلوب ہیں لیکن تاہم وہ علوم مقصود بھی نظر غائر میں کسی نہ کسی عمل سے من وجہ ضرور تعلق رکھتے ہیں مثلاً خدا تعالےٰ کے ایک ہونے کا اِعتقاد ایک مقصود ہی مگر عمل میں بھی اس کا ایسا خاص اثر ہے کہ جس درجہ کا یہ اعتقاد ہوتا ہے اُسی درجہ تک اُس عمل کا ثواب بڑھ جاتا ہے عارف و صحابہؓ کی عبادت کا فرق مراتب کا یہی راز ہے۔ عارف و صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین (ان سب پر اللہ تعالےٰ کی خوشنودی ہو) کی عبادت خواہ مالی ہو یا بدنی اس کے مقابلہ میں کسی کی عبادت نہیں ہو سکتی صحابہ کی عبادت میں کیا بات زیادہ ہے؟ وہی علم و خلوص عارف کی دو رکعتیں ہماری دو لاکھ رکعتوں سے بہتر و افضل ہیں اس لئے کہ علم واذعان اور خلوص اس میں اِس قدر پایا جاتا ہے جو ہماری عبادت میں کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ حضرت مرشدی نے فرمایا تھا کہ عارف کی دو رکعت غیر عارف کی لاکھ رکعت سے بہتر و افضل ہیں حضرت نے یہ غلط نہیں کہا اور نہ اِس میں مبالغہ ہے حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو میرا صحابی آدھا مد غلہ خیرات کرے وہ اُحد پہاڑ کی برابر سونا خرچ کرنے سے زیادہ ثواب رکھتا ہے اگر اس حدیث کی بناء پر آدھ سیر غلہ کے مقابلہ میں آدھ سیر سونا لیا جائے اور اس کی نسبت سے اُحد

پہاڑ کو دیکھیں تو نسبت معلوم ہو گی کہ کیا ہے۔ اور اگر یہ نسبت اس طرح لی جائے کہ بجائے آدھ سیر غلہ کے اُس کی قیمت لے کر پھر سونے کی قیمت سے موازنہ کیا جائے تو اور زیادہ نسبت حاصل ہو اور یہ ثواب کی زیادتی صرف علم معرفت کی زیادتی سے ہے اور اس سے اچھی طرح صحابہ کی عبادت اور ہماری عبادت کی نسبت معلوم ہو سکتی ہے۔ بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ مولوی بھی عجیب آدمی ہیں کہیں اس حدیث کی علت محبت و خلوص کو بتلاتے ہیں اور کبھی علم و معرفت کو اور ایک ہی حدیث سے متعدد مواقع پر متعدد کام لیتے ہیں سو واضح ہو کہ خلوص و محبت کا بھی علم و معرفت ہی سے حاصل ہوتا ہے جو صحابہ میں پایا جاتا تھا۔ پس ایک ہی چیز ہے خواہ اس کو خلوص سے تعبیر کرو خواہ علم و معرفت سے خوب کہا ہے ؎

عِبَادَاتُنَا شَتّٰى وَحُسْنُكَ وَاحِدٌ فَكُلٌّ اِلٰى ذَاكَ الْجَمَالِ يُشِيْرُ

(عنوانات مختلف ہیں معنون ایک ہی حسن ہے اور ہر عنوان جمال کی طرف اشارہ کرتا ہے)

اسی علم و معرفت سے ان حضرات کو وہ ادراک عطا ہوا تھا کہ حضرت عبداللہ بن سلام نے جب حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو اوّل بار دیکھا تو باوجود اُس وقت تک وہ خلوص جو بعد صحبت میسر ہوا نہ تھا مگر طلبِ حق کا جس قدر خلوص تھا اُسی کا یہ اثر تھا کہ دیکھتے ہی بیساختہ بول اُٹھے هٰذَا لَيْسَ بِوَجْهِ كَذَّابٍ (یہ چہرہ جھوٹے شخص کا نہیں ہو سکتا)

نورِ حق ظاہر بود اندر ولی نیک بیں باشی اگر اہلِ دلی

(ولی کے اندر انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر تم اہلِ دل ہو تو اس کا ادراک کر سکتے ہو۔)

مردِ حقانی کی پیشانی کا نور کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں) تو جب وہ کامل خالص ہو گیا ہو گا تو کیا حال ہوا ہو گا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد ندانم چوں کند

(ایک چلو خاک آلودہ جب مجنوں بنا دیتی ہے اگر صاف ہو تو نہ معلوم کیا کر دے)

غرض صحابہؓ کو علم خالص تھا اسی وجہ سے ہماری سعادت کاملہ بھی ہے کہ صحابہ کا اتباع کریں۔ ایک نظیر سے اس واقعہ کی کہ ہم صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے نقش قدم پر کیوں چلیں اور ان کی زندگی ہماری رہنما کیوں ہے تحقیق نہایت دل نشین مثال سے ہو سکتی ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ ریل کس طرح چلتی ہے ریل کے چلنے میں متحرک اوّلاً انجن ہی ہر گاڑی میں انجن نہیں ہوتا بلکہ اگر ہر گاڑی میں انجن ہوتا تو شاید ریل چلتی بھی نہیں بلکہ ساری گاڑیوں کے لئے ایک ہی انجن ہوتا ہے جو سب کے لئے کافی ہوتا ہے۔ ترکیب یہ کہ حرکت اوّلیہ ایک چیز میں ہوتی ہے اور دوسری چیزوں کو مرتبط کر دیا جاتا ہے جیسا کہ ریل گاڑی میں ہوتا ہے کہ انجن صرف متحرک اوّلاً ہوتا ہے اور ساری ریل گاڑی انجن سے مرتبط ہوتی ہے اکیلا انجن جو متحرک اوّلاً ہے ساری گاڑیوں کو کالکا سے کلکتہ تک لیجاتا ہے۔ جب ایک انجن متحرک اوّلاً بہت سی گاڑیوں کو ہزارہا کوس لیجاتا ہے تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ اگر ایک شخص صحابہؓ سے تعلق رکھنے والا خدا تعالیٰ تک پہونچ سکے جو شخص خدا تعالیٰ تک پہونچنا چاہے وہ صحابہؓ کے انجنوں سے مرتبط ہو جائے ؎

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد　　دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

(ایک چیونٹی کو کعبہ میں پہونچنے کا ارادہ ہوا کبوتر کے پاؤں پکڑے اور یکایک پہونچ گئی)

ایک چیونٹی تھی غریب و مفلوک الحال اُس نے حج کے جانے کا ارادہ کیا لیکن کوئی سامان اس کے پاس موجود نہ تھا اسی فکر میں حیران و پریشان تھی حجاج سے ترکیب پوچھی حاجیوں نے بتلایا جہاز میں اتنے دنوں سفر کرنا پڑتا ہے اور اونٹوں پر اتنے دن تک سفر ہوتا ہے تب

کہیں یہ ہزارہا میل کا سفر ختم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بڑی دقتیں ہیں ہزاروں میل کا سفر سیکڑوں روپیہ کا خرچ چور ڈاکو کا خوف جان کا خطرہ غرض بڑی بڑی تکلیفیں ہیں جن کو اٹھا لینے کے بعد کہیں حج نصیب ہوتا ہے بیچاری یہ سُنکر سخت پریشان و ہراساں ہوئی اسی ذوق و شوق اور غمگین حالت میں تھی کہ ناگہاں ایک رہبر نظر آیا جو مصداق تھا اس شعر کا ے

اے لقائے تو جواب ہر سوال مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(یعنی آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے اور آپ سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے)

اور اس نے پوچھا کہ کہو کیسی حالت ہے بیچاری رنج و غم میں بیٹھی ہوئی تھی ایک دردمند کو پاکر کچھ تسکین حاصل ہوئی اور کہا کہ میری حالت کیا ہے حج کو جانا چاہتی ہوں دل میں شوق محبت بھرا ہوا ہے لیکن پہونچنے کے وسائل نہیں اس وجہ سے غمگین و پریشان ہوں۔ اگر کوئی تدبیر آپ بتلا سکیں تو للہ بتلائیے اس شخص نے کہا کہ اچھا میں ایک طریقہ بتلاؤں اگر نخوت و تکبّر نہ کرو کیونکہ نخوت و تکبّر سے مقصد حاصل نہیں ہوتا اور آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے اس نے کہا بہت بہتر میں ہر طرح راضی ہوں اتنے میں ایک کبوتر آگیا اور جنگل میں دانہ چگنے لگا وہ شخص جانتا تھا کہ یہ کبوتر حرم جانے والا ہے اس سے کہا اگر تم جانا چاہتے ہو تو اس کبوتر کے پاؤں پکڑ لو اور نخوت و غرور نہ کرو حرم میں پہونچ جاؤ گے ے

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رسد دست بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

(ایک چیونٹی نے حج جانے کا ارادہ کیا حرم کے کبوتر کے پاؤں پکڑے اور حرم ۔ پہونچ گئی)

غرض اس سے یہ ہے کہ وابستگی و ارتباط میں نخوت و غرور اور تکبّر نہ کرو وابستگی و ارتباط میں اِستنکاف کا ہونا کامیابی کی دلیل ہی آگے وابستگی

کے ساتھ استنکاف کروگے تو ہرگز کامیاب نہ ہوگے اور رہ جاؤگے مسلمانوں میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ وہ مقتداؤں سے ارتباط اور تعلق پیدا کریں کیونکہ مسلمانوں میں اتباع سے عار پایا جاتا ہے اور وجہ استنکاف کی یہ ہے کہ وہ اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں۔ اپنے کو دولتمند اور صاحبِ عزت خیال کرتے ہیں اور عارف باللہ اکثر غریب وخستہ حال ہوتے ہیں اس لئے یہ خیال کرکے یہ لوگ چھوٹی حیثیت کے ہیں۔ غریب ومفلوک الحال ہیں میلے کچیلے اور بارحیثیت ہیں اور ہم بڑے دولتمند صاحبِ عزت ہمارا اوران کا کیا جوڑ۔ ہم ان سے کیا تعلق اور ربط پیدا کریں افسوس اسی چھوٹے بڑے کے خیال نے شیطان کو راندۂ درگاہ بنایا یہاں شیطان نے یہی تو کہا تھا کہ میں ایک چھوٹی حیثیت کے وجود کو جو مجھ سے ارذل اور کمتر ہے کیوں سجدہ کروں یہی نخوت وتکبر اس کی تباہی کا موجب بنا اور اسی نے اُس کو کھویا اور یہی ہم کو خراب کررہا ہے۔ آج یہ مرض مسلمانوں میں کثرت سے ہے اور ہر شخص اس میں مبتلا پایا جاتا ہے میں اعتراضاً نہیں کہتا بلکہ شفقت کے لحاظ سے کہتا ہوں مسلمانو! اس خیال کو چھوڑدو ہماری ناکامیابی کی یہی وجہ ہے اور ہماری تباہی کا یہی موجب ہے۔ اِس صورت پرستی نے ہم کو برباد کیا ہے اہلِ حقیقت صورت کی نسبت فرماتے ہیں ؎

گر بصورت آدمی انساں بدے — احمد و بوجہل ہم یکساں شدے
اینکہ می بینی خلاف آدم اند — نیستند آدم غلاف آدم اند

(اگر آدمی کی صورت کی وجہ سے انسان ہوتا تو احمد (صلے اللہ علیہ وسلم) اور ابوجہل یکساں ہوتے یہ کہ خلاف آدم کے تجھ کو نظر آتا ہے آدم نہیں ہیں آدم کے غلاف میں ہیں)

لباس کو چھوٹے بڑے ہونے کا معیار نہ بناؤ لباس کو دیکھ کر چھوٹے بڑے ہونے کا احتمال نہ کرو مولوی صاحب دس روپیہ کے نوکر ہیں میلے کچیلے

اور ٹوٹے پھوٹے حال میں ہیں اس کی طرف نہ دیکھ لباس کے اچھے برے ہونے سے آدمی کا اچھا بُرا ہونا معلوم نہیں ہوتا اگر شریعت مجبور نہ کرتی تو اہل اللہ اور عارف باللہ پائجامہ بھی نہ پہنتے ان لوگوں کو جسم کی آرائش اور زینت سے کام کیا ہے

نباشد اہلِ باطن در پئے آرائش ظاہر — بنقّاش احتیاجے نیست دیوارِ گلستاں را

(اہل اللہ آرائش ظاہری کے درپے نہیں رہتے ان کو ظاہری آرائش کی حاجت نہیں جیسا کہ نقاش کو دیوارِ گلستاں کی کچھ حاجت نہیں)

ذوق شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

عریاں ہی دفن کرنا تھا زیر زمیں مجھے
ایک دوستوں نے اور لگا دی کفن کی شاخ

اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بادشاہ ذی حشمت وشوکت تھے لیکن اُن کے بھائی لنگی باندھے ہوئے پھرا کرتے تھے۔ بادشاہ کو شرم آتی تھی کہ میں اتنا بڑا بادشاہ اور میرا بھائی صرف لنگی باندھے ہوئے پھرتا ہے۔ ان کو بلا کر بادشاہ نے کہا کہ بھائی مجھے شرم آتی ہے تم پائجامہ پہن لو اُنھوں نے کہا کہ ایک شرط سے کہ جب کرتا بھی ہو کہا کرتے بہت کہا کرتے کے ساتھ ٹوپی بھی ہو بادشاہ نے کہا ٹوپی بھی بہت کہا کہ جوتہ بھی ہونا چاہیئے بادشاہ نے کہا جوتے بھی بہت کہا کہ جب یہ سب چیزیں ہوں تو ایک سواری بھی ہونا چاہیئے بادشاہ نے کہا کہ سواری بھی ہو انھوں نے کہا سواری گھوڑے کی اور اس کے لئے ایک اصطبل اور سائیس بھی ہونا چاہیئے۔ بادشاہ نے کہا یہ چیزیں بھی موجود ہیں پھر کہا ایک مکان رہنے کے واسطے بادشاہ نے کہا بڑے بڑے عالیشان مکان آپ کے واسطے موجود ہیں کہا کہ پھر ایک سلطنت بھی ہونی چاہیئے بادشاہ نے کہا سلطنت بھی حاضر ہے شوق سے تخت پر بیٹھئے اور حکمرانی کیجئے یہ سب پوچھ کر بادشاہ

سے کہنے لگے کہ میں پائجامہ ہی کیوں پہنوں جس میں اتنے جھگڑے ہوں اور ایسا بکھیڑا ہو۔ غرض جو لوگ عارف باللہ ہوتے ہیں انھیں ایسے تکلفات سے غرض نہیں ہوتی سادہ زندگی رکھتے ہیں اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں اور نہ ان کے قلب میں اس سامان کی وقعت ہوتی ہے۔ ایک بزرگ نے ایک بادشاہ سے دریافت کیا کہ اگر آپ کسی موقع پر راستہ بھول جائیں اور وہاں پیاس معلوم ہو اور تشنگی بیچین کر رہی ہو اور ایک شخص پانی لے کر آوے اور کہے کہ میں یہ کٹورا پانی آدھی سلطنت کو فروخت کرتا ہوں تو آپ اسے خرید لیں گے بادشاہ نے کہا بلا شک میں آدھی سلطنت میں اس ایک کٹورہ پانی کو خرید لوں گا۔ بزرگ نے کہا اگر اسی طرح کبھی آپ کا پیشاب بند ہو جائے اور کوئی شخص یہ کہے کہ میں نصف سلطنت کے معاوضہ میں پیشاب کا بند کھولتا ہوں تو آپ اس پر راضی ہو جائیں گے۔ کہا بیشک بزرگ نے فرمایا کہ آپکی سلطنت کی کیا قیمت۔ ایک کٹورہ بھر پانی اور پیشاب ایسی قیمت کی چیز پر نخوت و غرور کرنا اور دوسروں کو حقیر و ذلیل خیال کرنا کہاں تک درست کہا جا سکتا ہے یہاں سے حالت معلوم ہوئی ہوگی آجکل کی ترقی کی۔ میں ترقی کو منع نہیں کرتا بلکہ ترقی کو پسند کرتا ہوں لیکن اسی طرح جس طرح کہ ایک نیک اور مسلمان کو ترقی حاصل کرنی چاہیئے۔ ایسا نہیں کہ ترقی میں دین ہی کو بھول جائیں اور خدا تعالےٰ کا خیال بھی نہ آئے جو لوگ خدا تعالیٰ کو جان لیتے ہیں وہ دنیا سے زیادہ محبت کیا بالکل محبت نہیں رکھتے ؎

آنکس کہ ترا شناخت جاں راچہ کند فرزند و عزیز و خانماں راچہ کند

(جس شخص کو آپ کی معرفت حاصل ہوگئی اس کو جان اور فرزند و عزیز اور اسباب کی پرواہ نہیں)

دنیا کا وجود ان کی نظروں میں کاہ سے زیادہ نہیں چھوٹے بچے مٹی کے گھروندے کھلونے بناتے ہیں عقلاء ان پر ہنستے ہوئے گذرتے ہیں

اور بچوّں کو بلا کر دکھاتے ہیں کہ ان دیوان خانوں میں آؤ اور ان کو دیکھو اِسی طرح عرفاء اور اہل اللہ آپ کے بلند قصروں اور محلوں کو دیکھ کر آپ کو دار آخرت کی ترغیب دیتے ہیں اور جب آپ کو ملتفت نہیں پاتے تو وہ آپ پر ہنستے ہیں اور آپ کی حالت پر یہ کہتے ہوئے افسوس کرتے ہیں ؎

دلا تا کے دریں کاخ مجازی　　کنی مانند طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ　　کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا زاں آشیانہ بیگانہ گشتی　　چو دونا چغد ایں ویرانہ گشتی

(اے دل اِس مجازی محل (دنیا) میں بچوّں کی طرح خاک بازی کرتا رہے گا تو وہی ہاتھ کا پلا ہوا پرندہ ہے کہ تیرا آشیاں اس محل سے باہر تھا کس لئے اپنے آشیانہ سے انجان ہوکر اُلّو کی مانند اس ویرانہ کا ہو رہا۔)

پس اِس سامان کو قبلہ و کعبہ مت بناؤ۔ اور ان علماء کو جو خستہ حالت میں ہوں میلے کچیلے ہوں حقارت کی نظروں سے نہ دیکھو وہی لوگ خاصانِ خدا تعالےٰ اور کچھ لے جانے والے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ دنیا چھوڑدو اور تمام تعلقات کو ترک کردو بلکہ غرض یہ ہے کہ دنیا میں اِس قدر منہمک نہ رہو کہ خدا تعالےٰ کو بھی بھول جاؤ بلکہ دنیا کو نظرِ حقارت سے دیکھو اور خاصانِ خدا تعالےٰ کی عزت کرو۔ اہل اللہ سلطنتوں اور حکومتوں کی پرواہ نہیں کرتے اور ان کو وبال جان خیال کرتے ہیں۔ قصہ مشہور ہے کہ حضرت غوث پاک رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی خدمت مبارک میں سلطان سنجر نے خط لکھا جس میں تحریر کیا کہ ایک حصہ ملک کا آپ کے خدام کے لئے آپ کو دیتا ہوں۔ آپ نے جواب میں لکھ بھیجا کہ ؎

چوں چتر سنجری رُخ بختم سیاہ باد　　در دل اگر بود ہوسِ ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب　　من ملک نیم روز بیک جَو نمی خرم

(چتر سنجری کی طرح میرا منہ کالا ہو اگر میرے دل میں ملک سنجر کا وسوسہ بھی ہو اس لئے کہ جب سے مجھ کو نیم شب کی سلطنت ملی ہے میری نظر میں نیمروز کی سلطنت ایک جَو کے برابر بھی نہیں ہے)

ایک عارف کا قول ہے کہ ؎

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے　　　بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے و ہوئے

(یعنی ایک ساعت ایک لمحہ محبوب کو اطمینان سے دیکھنا دن بھر کی دارو گیر شاہی سے بہتر ہے)

جس شکستگی کو حقارت سمجھتے ہو اُس کی نسبت حدیث قدسی ہے اَنَا عِنْدَ الْمُنْکَسِرَۃِ قُلُوْبُھُمْ (میں شکستہ دل لوگوں کے ساتھ ہوں) یہی شکستگی شرط وصول ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ　　　جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ
ہر کجا پستی است آب آنجا رود　　　ہر کجا مشکل جواب آنجا رود
ہر کجا دردے شفا آنجا رود　　　ہر کجا رنجے دوا آنجا رود

(یعنی فہم و خاطر تیز کرنا حق تک پہونچنے کی راہ نہیں ہے بلکہ شکستگی کی ضرورت ہے بجز شکستہ لوگوں کے فضل خداوندی کسی کو قبول نہیں کرتا جس جگہ نیچان ہوتا ہے وہاں پانی مرتا ہے جہاں مشکل پیش آتی ہے وہاں ہی جواب دیا جاتا ہے جس جگہ بیماری ہوتی ہے وہیں دوا کی ضرورت پڑتی ہے جہاں بیماری ہوتی ہو وہاں ہی شفاء پہونچتی ہے ۱۲)

ہم لوگوں کو طلب نہیں ہے اگر طلب ہوتی تو اتباع میں تذلل بھی گوارا ہوتا اگر کوئی شخص کسی پر عاشق ہو جائے اور معشوقہ عاشق سے کہے کہ تمام کپڑے اُتار کر لنگوٹ بند ہو جاؤ تب وصل ہوگا۔ واللہ ایسا ہی کریگا۔ اس کو لنگوٹ بند ہونے میں کچھ بھی تامل نہ ہوگا۔ اور تمام شرم و حیا بالائے طاق رکھ دی جائے گی لیکن خدا تعالےٰ کے لئے ایسا نہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلےٰ بود　　　گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

(محبوب حقیقی کا عشق لیلےٰ کے عشق سے کیا کم ہو عشق خداوندی میں گیند کی طرح لڑھکنا زیادہ اچھا ہے ۱۲)

ایک زندہ نظیر سے اس کو دیکھئے کیمیاگروں کی حالت سب کو معلوم ہی کہ کپڑا

ان کے بدن پر نہیں ہوتا میلے کچیلے اور غلیظ رہتے ہیں لیکن عام لوگوں کے علاوہ والیان ملک اور بادشاہ تک ان کے پیچھے ایک بڑا ہوا حقہ لئے پھرا کرتے ہیں اگرچہ حقیقت میں وہ کیمیاگر نہ ہو۔ اللہ اکبر ایسی کیمیا کے لئے اپنے عیش وعشرت اپنی ذاتی عزت و وجاہت کو تباہ کردیا لیکن جن کو سچ مچ کی کیمیا آتی ہے جو لوہے کو سونا بناتے ہیں ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ اگر ان کے پیچھے پھرو تو تعجب نہیں کیونکہ کیمیاگر حقیقت میں وہی ہیں حاصل یہ کہ اگر تم بھی صحابہ سے ارتباط حاصل کروگے ان کا واسطہ ڈھونڈوگے تو یقیناً کامیاب ہوگے کیونکہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا صحیح راستہ بتلانے والے یہی ہیں جس طرح کہ چیونٹی کبوتر کے پاؤں میں لگ کر کعبہ مقدس پہنچ گئی تو ہم بھی اسی طرح صحابہ کے پاؤں میں لگ کر کس طرح اللہ تعالیٰ تک نہ پہونچیں گے۔ پہونچیں گے اور ضرور پہونچیں گے اور صحابہ سے واسطہ پیدا کرنا حضرت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے واسطہ حاصل کرنا ہے تو کامیابی یقینی ہے۔ غرض معرفت وعلم ہی نے صحابہ کو یہ درجہ دیا ہے علم ومعرفت بہت بڑا درجہ رکھتا ہے اگر علم ومعرفت کوئی چیز نہیں ہے تو دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے لیکن اوپر معلوم ہوچکا ہے کہ اس کا تعلق بھی عمل سے ہے بدون عمل وہ چنداں نافع نہیں مگر دیکھا جاتا ہے کہ طلباء میں علم کا ناز پیدا ہوگیا ہے اور وہ خیال کرنے لگے ہیں کہ یہ علم ہمارے لئے کافی ذخیرہ ہے اور ہم بحیثیت علم ایک بڑی حیثیت رکھتے ہیں عقائد تو ان کے درست ہوتے ہیں لیکن اعمال ان کے ٹھیک نہیں ہوتے غلطی یہ پڑی ہوئی ہے کہ وہ علوم وعقائد کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور عمل کی طرف توجہ نہیں کرتے میں اُن کو بتلاتا ہوں کہ تم عقائد کے گھمنڈ میں عمل درست نہیں کرتے اور جو کچھ ہے عمل ہی ہے اگرچہ علم ومعرفت کے بعد ہی سہی۔ قنوج میں ایک صاحب عامل بالحدیث سے ملاقات ہوئی

مجھ سے کہنے لگے کہ اجی حضرت ہم صرف نماز ہی کے چند مسئلوں میں حدیث
پر عمل کرتے ہیں باقی معاملات میں حدیث کا نام بھی نہیں لیتے مثلاً میں
عطر بیچتا ہوں اور اس میں تیل بھی ملاتا ہوں۔ غرض عملاً ہم بہت کمزور
ہیں۔ اسی طرح ہم حنفی ہیں ہمارے عقائد درست ہیں لیکن اعمال کی شکایت
ہم میں بھی ہے حالانکہ عمل وہ چیز ہے کہ جس پر سب چیز موقوف ہے۔ ہرچند کہ
بعض علوم و معارف ایسے ہیں جن کا عمل سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ
خود وہ علوم ہی مقصود معلوم ہوتے ہیں لیکن قرآن شریف اور احادیث
کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی غایت بھی عمل سے خالی نہیں۔
مثلاً خداوند تعالےٰ کلام پاک میں فرماتا ہے مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيبَةٍ فِي
الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى
اللّٰهِ يَسِيْرٌ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ (کوئی مصیبت
نہ دنیا میں آتی ہے اور نہ خاص تمہاری جانوں میں مگر وہ ایک کتاب میں (یعنی لوح محفوظ میں) لکھی ہے قبل
اس کے کہ ہم ان جانوں کو پیدا کریں اور یہ اللہ کے نزدیک آسان کام ہے (یہ بات) بتلا اس وجہ سے دی تاکہ
جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں) اس
آیت میں مسئلہ تقدیر کی تعلیم کی ہے یعنی جو کچھ مصیبت آفاقی یا انفسی
پہونچتی ہے وہ ہم نے پہلے سے لکھ رکھی ہے یہ ایک تعلیم ہے لیکن اس علم
میں بھی ایک عملی غایت موجود ہے چنانچہ خداوند تعالےٰ فرماتا ہے کہ
ہم نے تقدیر کی تعلیم کیوں دی اِس لئے کہ جو چیز تمہارے ہاتھ سے فوت
ہو جائے اُس پر مغموم مت ہو اور جو چیز مل جائے اس پر شاداں نہ ہو
(مراد فرح کبر ہے) اِس تعلیم میں ایک یہ بھی بڑی خوبی ہے کہ خداوند تعالیٰ
نے بالکل طبیعت کے موافق بتلایا ہے۔ کیونکہ غم و رنج طبعی ہوتا ہے۔ اس
تعلیم سے غم کے موقع پر طبعاً تسلّی و تسکین حاصل ہو سکتی ہے اور حوادث
میں وہ سکون کا باعث ہو جاتی ہے تمام عقلاء جمع ہو کر بھی ایسی تدبیر

نہیں بتلا سکتے۔ غرض مسئلہ تقدیر کی ایک غایت تسلی و تسکین صبر و سکون بھی ہے چنانچہ لِکَیْلَا تَأْسَوْا (تاکہ تم اترا ؤ نہیں) میں اس کی تصریح ہے اور یہ ایک ایسی غایت ہے جس کا فائدہ اظہر من الشمس (سورج سے زیادہ ظاہر) ہے۔ ایک مفروضہ واقعہ سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی خیال کیجئے کہ دو شخص ایک ہی جگہ کے ہوں دونوں کی ہر طرح سے یکساں حالت ہو لیکن فرق صرف یہ ہو کہ ایک ان میں تقدیر کا قائل ہو اور دوسرا تقدیر کا قائل نہ ہو اور دونوں کے دو لڑکے بھی یکساں ہوں دونوں نے یکساں تعلیم پائی ہو اور دونوں کے والدین نے یکساں تعلیم دی ہو دونوں کے والدین کی امیدیں ان سے وابستہ ہوں اتفاق سے دونوں لڑکے بیمار ہوں یکساں دونوں کا مرض ہو اور معالج بھی دونوں کا ایک ہی ہو ڈاکٹر کی غلطی سے علاج ناکافی ہو اور دونوں مرجائیں دونوں کے والدین کو سخت رنج ہوگا لیکن دونوں کا فرق اس موقع پر تقدیر کے مسئلہ سے ہوگا جو شخص تقدیر کا قائل ہے اس کی زبان سے تو اس موقع پر بیساختہ یہ کلمہ جاری ہوگا لَنْ يُّصِيْبَنَا اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا یعنی جو کچھ مصیبت آتی ہے وہ خدا تعالیٰ ہی کی طرف سے آتی ہے فِعْلُ الْحَكِيْمِ لَا يَخْلُوْ عَنِ الْحِكْمَةِ خدا تعالیٰ کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے جو ایک لڑکے کو مار ڈالا تھا اس میں بہتری ہی تھی خداوند تعالیٰ بلا کسی حکمت کے کوئی کام نہیں کرتا۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میری والد کے انتقال پر ایک بدوی نے مجھ سے کہا۔

اِصْبِرْ نَكُنْ بِكَ صَابِرِيْنَ فَاِنَّمَا   صَبْرُ الرَّعِيَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّأْسِ

آپ صبر کیجئے آپ بڑے ہیں اور ہم چھوٹے ہیں آپ کی وجہ سے ہم بھی صبر کریں گے۔

خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهٗ   وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

آپ کے والد کے مرنے سے کسی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ آپ کو اور انکو دونوں کو فوائد پہنچے آپ کو ثواب ملے گا جو عباس سے بہتر ہے اور عباس کو اللہ میاں مل گئے جو تم سے خیر ہے جب کسی کا نقصان نہیں ہوا تو غم کیسا۔ یہ مقولہ ہے ایک بدوی کا جو تقدیر کا قائل تھا دیکھو اس سے کیسی تسلّی ہوسکتی ہے۔ دوسرا شخص جو تقدیر کا قائل نہیں ہے کہتا ہی کہ لڑکے کو ڈاکٹر کی بے تدبیری نے مار ڈالا اگر ڈاکٹر تدبیر سے علاج کرتا تو لڑکا کبھی نہ مرتا۔ میں ڈاکٹر پر دعویٰ کروں گا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب پر دعویٰ دائر کر دیا گیا اور بیچارے ڈاکٹر صاحب کو جیلخانہ ہو گیا لیکن وہ حسرت اب بھی موجود ہے کہ اگر علاج میں بے تدبیری نہ ہوتی تو لڑکا نہ مرتا اس سے معلوم ہوگا کہ تقدیر کا قائل ہونا کیا کام دیتا ہی کہ غم کی عمر دو تین ہفتہ سے زیادہ نہیں ہوتی چنانچہ قائل تقدیر کا سکون غم کے ازالہ کا سبب بن گیا اور منکر تقدیر کا غم ہمیشہ باقی رہا۔ اسی طرح ہر علم اور ہر اعتقاد میں ایک غایت عمل کی ضرورت ہی۔ حدیث شریف میں ہے کہ خداوند تعالےٰ آخر شب میں آسمان اوّل پر نزول فرماتے ہیں اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ حرکت خداوند تعالےٰ کے لئے خلاف ہے لیکن اعتراض کی نوبت کیوں آتی ہے۔ غایت عمل پر نظر نہونے سے اگر غایت عمل پر نظر ہوتی یہ اعتراض ہی پیدا نہ ہوتا بلکہ یہ سننے ہی عزم ہوتا کہ اس وقت توجہ الی اللہ (اللہ تعالیٰ کیطرف توجہ) میں زیادہ اہتمام چاہئے کہ وقت قرب و قبول کا ہے اس کا پتہ مثال سے ملے گا کوئی حاکم دورہ پر ہو اور کسی جگہ سے قریب آجاوے اور لوگ آکر کہیں کہ فلاں حاکم یہاں سے ۶ میل کے قریب آگئے ہیں اور عنقریب آنا چاہتے ہیں اگر اس جگہ کے ملازم کہنے لگیں کہ کل تو اتنی دور تھے آج اس قدر مسافت طے کر کے کیونکر آئے تو اس سے معلوم ہوگا کہ وہ لوگ کام نہیں کرتے اگر

وہ کام کرتے ہوتے تو قریب ہونے کی توجیہ نہ ڈھونڈتے بلکہ کام کی درستی کے اہتمام میں لگ جاتے اسی طرح حدیث میں خداوند تعالیٰ کے قرب کو اس لئے بتلایا جاتا ہے کہ قرب کے جان لینے سے تنبیہہ ہوگی اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور بزبانِ حال کہیں گے ؎

امروز شاہِ شاہاں مہماں شدہ است مارا ۔۔۔ جبریل با ملائک درباں شدہ است مارا

(آج بادشاہوں کا بادشاہ ہمارا مہمان ہے جبرائیل معہ فرشتوں کے ہمارے دربان ہوئے ہیں)

مجھے حضرت مولانا مولوی محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حکایت یاد آئی حدیث پڑھی گئی تھی کہ جو شخص تازہ وضو سے دو رکعت نماز پڑھے اور ان رکعتوں میں حدیث النفس نہ کرے تو اس کے گذشتہ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت ایسا ہو سکتا ہے کہ نماز میں خیال نہ آوے مولانا نے فرمایا کہ کبھی کر کے بھی دیکھا تھا یا ویسے ہی شبہ کرتے ہو غرض محض الفاظ کی توجیہہ کی تحقیق بیکاری کی علامت ہے عمل کو مقصود سمجھنا چاہیئے۔ اور اسی وجہ سے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا امر کبھی نہیں پوچھا اور نہ کبھی اعتراض کیا۔ ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وسلم سے معراج میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں بزرگ نے کیا خوب جواب دیا ہے ؎

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد زباغباں ۔۔۔ بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

(اب کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا؟)

کسی اور نے کہا ہے ؎

تو نہ دیدی گہے سُلیماں را ۔۔۔ چہ شناسی زبان مُرغاں را

(تو نے جب سلیمان علیہ السلام کو دیکھا نہیں تو پھر پرندوں کی بولیاں کیسے سمجھے گا ۱۲)

عنقا شکار کس نشود دام چیں ۔۔۔ کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا اور کوشش کرنا لاحاصل ہے اسی طرح

ذات بحت کی کنہ کا ادراک نہیں کرسکتا اس لئے فکر و سوچ بیکار ہے)
وجہ یہ کہ تمہاری عقلوں کا جس قدر احاطہ ہے اللہ میاں کا احاطہ اُس سے بہت زیادہ ہے إِنَّ اللهَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ (اللہ تعالےٰ ہر چیز پر محیط ہیں) محاط محیط کو کیا سمجھ سکتا ہے۔ پانی کے کیڑوں میں سے ایک کیڑا سر نکال کر دیکھے کہ بڑے بڑے سامان ہیں خدا تعالےٰ کی حکمتوں سے جہان معمور رہے لیکن وہ سب کے اسرار کو کیا سمجھ سکتا ہے اسی طرح محققین کی وصیت ہے ے

حدیث مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو　　　که کس نکشود و نکشاید بحکمت این معمارا

(مطرب و مے یعنی عشق و محبت کی باتیں کرو زمانہ کے بھید اور اسرار کی ٹوہ میں مت لگو کیونکہ یہ عقدہ نہ کسی نے حل کیا نہ کرسکے گا)

اور اس مرض سے بڑھ کر علوم غیر شرعیہ کی تحقیق ہے نصوص شرعیہ سے جیسا آجکل جب کوئی مسئلہ سائنس کا سُنا اور اس کو قرآن مجید میں داخل کرنے کی کوشش کی بھلا قرآن مجید میں سائنس و فلسفہ کے مسائل ڈھونڈنا کواکب وغیرہ کی تحقیقات کرنا لغویات نہیں تو کیا ہے قرآن مجید میں اس کے متعلق اگر کچھ آیا ہے تو وہ توحید پر استدلال کرنے کے لئے آیا ہے تو اس غرض سے تفصیل کی حاجت نہیں بہت اجمال بھی کافی ہے حتیٰ کہ بدوی نے استدلال کیا ہے اَلْبَعْرَةُ تَدُلُّ عَلَى الْبَعِيْرِ وَالْاَثَرُ يَدُلُّ عَلَى الْمَسِيْرِ فَالسَّمَآءُ ذَاتُ الْاَبْرَاجِ وَالْاَرْضُ ذَاتُ الْفِجَاجِ كَيْفَ لَا يَدُلُّ عَلَى اللَّطِيْفِ الْخَبِيْرِ یعنی مینگنی اونٹ کا پتہ دیتی ہے (اور قدم چلنے والے کا پتہ دیتا ہے تو آسمان برجوں والا اور زمین راستوں والی کس طرح اللہ تعالےٰ کے وجود کا پتہ نہ دیں گے) یہ تمام چیزیں جو کائنات میں نظر آتی ہیں خدا تعالےٰ کے وجود پر کیسے دلیل نہ ہوں گی۔ قرآن مجید میں سائنس و فلسفہ کی تحقیقات دیکھنے کی مثال بعینہٖ ایسی ہی جیسی کوئی جوتی سینے کی ترکیب طب اکبر میں دیکھے قرآن مجید طب اکبر ہے جوتی سینے کی کتاب نہیں ہے قرآن مجید میں روحانی تربیت اور

اصلاح کے نسخے ملیں گے سائنس و فلسفہ کی لغویات سے اُسے کیا تعلق اگر بقدر ضرورت کسی سائنس کے مسئلہ سے توحید وغیرہ پر استدلال کیا گیا ہی تو اس میں کلام نہیں لیکن قرآن مجید کو سائنس کی کتاب سمجھ لینا سخت غلطی ہے۔ صحابہ کا خدا تعالےٰ کی ذات و صفات پر بحث نہ کرنا امور کائنات کے متعلق کچھ دریافت نہ کرنا اِس امر کو بتلاتا ہے کہ یہ سب باتیں زائد از ضرورت ہیں ایک سچے مسلمان کو ایسی باتوں سے واسطہ کیا پس علوم وہی مقصود ہیں جن کی کوئی غایت عملی بھی ہو جیسا مسئلہ تقدیر و حدیث نزول الرب ہیں معلوم ہوا اِسی طرح توحید کی غایت میں خداوند تعالےٰ کے ارشاد سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرمایا ہے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ (کہہ دیجئے کہ اللہ ایک ہے اللہ بے نیاز ہے) اِس سورۃ میں خدا تعالیٰ کی ذات و صفات بیان کی گئی ہے اِس سے فائدہ یہ ہی کہ جس وقت خدا تعالےٰ کو ایسا سمجھو گے غیر خدا پر طمعًا و خوفًا نظر نہ ہو گی جس طرح حاکم کا مقرب رعایا سے نہیں ڈرتا اِسی طرح توحید پرست غیر خدا سے نہیں ڈرے گا۔ اکبر شاہ سے جنگل میں ایک گنوار سے دوستی ہو گئی اکبر نے گنوار کو گھر بلایا کہ اگر تمہیں کچھ ضرورت پیش ہو تو ہمارے پاس آ گنوار کو ایک مرتبہ کچھ ضرورت پیش آئی اور وہ اکبر شاہ کے پاس آیا دیکھا کہ اکبر شاہ نماز پڑھ رہے ہیں نماز پڑھ کر دُعا کی گنوار نے دیکھا کہ جب یہ خود خدا تعالےٰ سے مانگتے ہیں تو کیا میں نہیں مانگ سکتا اکبر شاہ سے کہا کہ تمہارے احسان کی ضرورت نہیں ہم خود اس سے مانگ لیں گے جو تم کو لاکھوں دیتا ہے وہ کیا مجھے نہ دیگا توحید کا یہ اثر ہوتا ہی کہ

موحد چہ بر پائے ریزی زرش ۔۔۔ چہ فولاد ہندی نہی بر سرش
اُمید و ہراسش نباشد زکس ۔۔۔ ہمیں ست بنیاد توحید بس

(یعنی موحد اور عارف کے قدموں کے نیچے خواہ زر بکھیر دو خواہ اس کے سر پر تلوار رکھیں اُمید

اور خوف اس کو بجز خدا تعالےٰ کے کسی سے نہیں ہوتا توحید کی بنیاد بس اسی پر ہے ۱۲)

اگر غور کیا جائے گا تو تمام مسائل اعتقادیہ میں علاوہ غایت نجات کے اور بھی بہت سی غایات عملی نکلیں گی پس جب علم کا عمل سے یہ تعلق ہے تو ضرور ہے کہ مسئلہ اثبات آخرت کے ساتھ جس کا بیان مولوی شبیر احمد صاحب نے کیا ہے اس کے اہتمام عمل کا مضمون بھی بیان کیا جاوے اِس لئے میں نے اِس آیت کو اختیار کیا ہے کہ یہ عمل کو بھی ضروری بتلا رہی ہے پس اس آیت (آیت مذکورۃ العنوان) میں حق تعالےٰ نے شکایت کی ہے محبتِ دنیا کی اور آخرت کو چھوڑ دینے کی اور جب دنیا سے مراد یہ ہے کہ دنیا کو دین پر ترجیح دی جاوے اور آخرت کا خیال مطلقاً نہ رہے تو بعضے محبین دنیا اس کو مطلق کسب دنیا پر محمول کر کے اس تعلیم پر مضحکہ کرتے ہیں اور تعلیم کنندوں کی یہ مثال دیتے ہیں کہ ایک بادشاہ کے ہاں علماء کا دخل تھا بادشاہ ان کی مرضی پر چلتے تھے مولوی صاحبان نے کہا کہ بادشاہ سلامت یہ تمام فوج وغیرہ جو فضول جھگڑا لگا رکھا ہے اِس سے فائدہ کیا بیکار مصارف ہیں مناسب ہے کہ تمام فوج موقوف کر دی جائے بادشاہ نے ایسا ہی کیا اور تمام فوج کو موقوف کر دیا غنیم کو معلوم ہوا کہ فلاں بادشاہ نے فوج کو برخاست کر دیا ہے فوراً لشکر کشی کی اور سرحد کے قریب آپہنچا بادشاہ نے مولوی صاحب سے کہا کہ دشمن حملہ کر کے آپہنچا ہے مولوی صاحب نے کہا کہ ہم جا کر فیصلہ کئے دیتے ہیں چنانچہ گئے اور جا کر اس کو سمجھایا کہ یہ کام بہت بُرا ہے کسی کا ملک چھین لینا بڑے گناہ کا موجب ہے ایسا نہ چاہئے غنیم کہیں ایسی نصیحتوں سے باز رہ سکتا تھا ناکام واپس آئے اور بادشاہ سے کہا کہ صاحب وہ تو مانتا نہیں آپ ہی جانے دیجئے آپ کا ملک گیا اُس کا ایمان گیا۔ اِسی طرح مولویوں کے کہنے پر چلے تو سارا گھر بار چھوڑ بیٹھے میں بقسم کہتا ہوں کہ اس الزام کی

وجہ صرف یہ ہے کہ علماء کی صحبت میں نہیں رہتے ان کے پاس رہنے کے لئے کچھ مدت تو نکالو زیادہ نہیں تو چالیس دن ہی سہی افسوس ہے اپنے جسمانی معالجہ کے لئے ملازمت سے بوضع تنخواہ رخصت لیتے ہیں گھر کا انتظام کرتے ہیں روپیہ خرچ کرتے ہیں جسمانی مرض کے لئے بیکار رہنا اور نقصان گوارا کرنا منظور ہے معالج ڈاکٹر کو سولہ روپیہ فیس کے دینے منظور لیکن روحانی مرض کے واسطے کچھ بھی نہیں کرتے عربی سول سرجن (مولوی) کے پاس روحانی امراض کے معالج کے لئے بہت قلیل مدت چالیس دن اگر رہیں تو تمام اعتراضات وسوالات کے جواب ہو جائیں سب کام طلب اور ضرورت سے ہوتے ہیں چونکہ جسمانی امراض سے صحت مطلوب ہوتی ہے اس کے لئے ہر قسم کے نقصان اور تکلیف گوارا کرتے ہیں اور روحانی مرض سے خود ہی شفا پانا مقصود نہیں ہوتا کاش وہ اس کے ازالہ کی بھی ایسی ہی تدبیریں کرتے کیا کسی محقق کے پاس چالیس دن رہ لینا بھی کوئی بڑا مشکل کام ہے انشاء اللہ تعالیٰ اس کی صحبت ہی تمام ترشبہات کے رفع کے لئے کافی ہو جاوے گی زیادہ قیل وقال کی حاجت نہ ہوگی بقول ؎

اے لقائے تو جواب ہر سوال　　مشکل از تو حل شود بے قیل وقال

(آپ ایسے بابرکت ہیں کہ آپ کی ملاقات ہی ہر سوال کا جواب ہے بلاشبہ آپ سے ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے)

اس کی دلیل یہی ہے کہ آزما کر دیکھ لو بقول مولانا ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب　　گر دلیلت باید از روے رومتاب

(سورج کا نکلنا ہی آفتاب کی دلیل ہے اگر تجھ کو دلیل کی ضرورت ہے تو اس سے منہ مت موڑ)

اور چالیس دن کی تخصیص جو میں نے عرض کی ماخذ اس کا ایک حدیث ہے جس کا یہ مضمون ہے کہ جو شخص چالیس روز اللہ تعالیٰ کے لئے اخلاص اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے قلب سے حکمت کے چشمے جاری کرتے ہیں

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالیٰ)

ہر نشنگ محل

لیکن یہ شرط ہے کہ مولویوں کے پاس رہنا کسی دنیوی غرض سے نہ ہو ورنہ ہرگز فائدہ نہ ہوگا۔ جیسا ایک گنوار کا واقعہ ہے کہ ایک گنوار سے کسی مولوی نے کہا کہ اگر تو چالیس دن نماز پڑھ لے تو تجھ کو میں ایک بھینس دوں گنوار نے کہا بہت اچھا جب چالیس دن گذر گئے تو گنوار آیا اور کہا مولوی صاحب میں نے چالیس دن نماز پڑھ لی بھینس دلوایئے مولوی صاحب نے کہا کہ میں نے تو بھینس دینے کو صرف اس واسطے کہا تھا کہ تجھ کو نماز کی عادت ہو جائے گنوار نے کہا کہ تو جاؤ ہم نے بھی بے وضو ہی ٹرکائی تھی۔ اگر مولوی صاحب کی خدمت میں رہنا تو روٹی کھانے کی غرض سے نہیں بلکہ روٹی اپنے اپنے گھر سے کھا دیں تاکہ کچھ قدر بھی ہو۔ ایک مفید عام رسالہ میں نے حضرت کے حکم سے چھپوایا تھا میں چاہتا تھا کہ مفت دوں لیکن حضرت نے حکم دیا کہ مفت نہیں بقیمت دینا کیونکہ مفت کی قدر نہیں ہوتی۔ غرض اخلاص وعقیدت اور فراغت کے ساتھ کام کرنا چاہیے تاکہ کچھ مفید نتیجہ نکل سکے۔ کیرانہ (ضلع مظفرنگر) میں ایک شخص کو ایک تحصیلدار صاحب نے پیش کیا اور کہا کہ ان کو بڑے شبہ ہیں اگر آپ کچھ فرمائیں تو ان کی تسکین ہو جائے میں نے کہا کہ یہ میری ساتھ چلیں اور چند روز وہاں رہیں شبہات خود بخود دور ہو جائیں گے عارف شیرازیؒ اس چالیس دن کے لئے فرماتے ہیں ؎

شنیدم رہروے در سرزمینے　　ہمیں گفت ایں معما با قرینے

کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف　　کہ در شیشہ بماند اربعینے

(یعنی کوئی سالک اپنے ہم نشین سے یہ معمہ کہہ رہا تھا شراب اس وقت صاف ہوگی جب چالیس دن شیشہ میں رہے)

پس چالیس دن تو شیشۂ قلب میں محبت الٰہی کی شراب کو بساؤ تمہارے قلب کا اطمینان ہو جائے گا۔ اگر بڑوں کے پاس رہنے کی ہمت نہ ہو تو

خدا کے لئے تم چالیس روز میرے ہی پاس رہ کر اِس سستے نسخہ سے فائدہ اُٹھا کر دیکھ لو غرض صحبت ہی سے یہ شبہ بھی جاتا رہے گا کہ مولوی لوگ کسب دنیا سے منع کرتے ہیں اصل یہ ہے کہ وہ جب دنیا سے روکتے ہیں جس کی مذمّت اِس آیت میں ہے اور آیت سے حدیث حُبُّ الدُّنْیَا رَأْسُ کُلِّ خَطِیْئَۃٍ (حُبِّ دنیا تمام گناہوں کی جڑ ہے) کی تصریح بھی ہوگئی۔ غرض ایک تو ہے کسبِ دنیا اور ایک ہے حُبِّ دنیا تو کسب دنیا تو جائز ہے اور حُبِّ دنیا ناجائز اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک تو پاخانہ میں بضرورت طبیعت بیٹھنا اور ایک پاخانہ کو پیارا سمجھ کر اس میں جی لگا کر بیٹھنا۔ اوّل صورت جائز دوسری ناجائز۔ اِسی طرح دنیا کو کمانا تو جائز لیکن دنیا کو مرغوب و محبوب سمجھنا حرام۔ قرآن شریف میں ان ہی الفاظ سے تصریح کی گئی ہے یعنی کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ یعنی عاجلہ کو محبوب سمجھتے ہو اور آخرہ کو چھوڑے بیٹھتے ہو۔ اور اس خصوص میں ایک شبہ کا اِحتمال ہے یہ کہ بعضے آدمی یہ سُن کر کہ یہ آیت کفار کے متعلق ہے کہنے لگتے ہیں کہ کفار کے متعلق آیات ہے ہم کو کیا تعلق ہے اِسی طرح اگر وہ کسی ترجمۂ قرآن میں دیکھ لیتے ہیں کہ یہ آیت مکّی نہیں تو وہ خیال کرلیتے ہیں کہ غیر مکّی آیت سے ہم کو کیا تعلق اِس لئے اِس موقع پر اس کے متعلق بھی کچھ بیان کر دینا ضروری ہے۔ خداوند تعالےٰ کو کسی کی ذات سے محبت و عداوت نہیں ہے بلکہ اس کی بنا اعمال خاصہ ہیں اور گو بعض احکام کا مورد اگرچہ خاص ہوتا ہے لیکن الفاظ کے عموم سے حکم ہوتا ہے اِس لئے کفار کی شان میں جو بعض آیات اُتری ہیں وہ اگرچہ باعتبار مورد کے خاص ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے۔ پس جس عمل پر کفار کی شکایت ہے اگر وہ عمل ہم میں بھی ہے تو ہم کو بھی سبق حاصل کرنا چاہیے دوسرے اگر پھر بھی خاص ہی مانا جاوے تب اور

بھی زیادہ افسوس ہے ہم پر کہ ہم مسلمان ہیں اور یہ کافروں کی خصلتیں ہم میں پائی جائیں پس ایسی حالت میں یہ شبہ کہ کفار کے متعلق آیات سے ہمیں کیا واسطہ کسی طرح گنجائش نہیں رکھتا بلکہ کفار کی شان میں جو آیات ہوں ان کا اثر ہم پر زیادہ ہونا چاہیئے غرض کفار پر جو طعن وملامت اور شکایت ہے وہ ان کی ذات کی وجہ سے ہے یا فعل کی وجہ سے یہ امر سب جانتے ہیں کہ ان کی شکایت ذات کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ فعل کی وجہ سے ہے۔ اگر تم مسلمان ہو تو ان آیات کو دیکھ کر جو کفار کی شان میں ان کے فعل کی وجہ سے ہیں عبرت حاصل کرو اور دیکھو کہ جو خصائل کفار کے تھے وہ آج ہم میں پائے جاتے ہیں افسوس کس قدر بڑی بات ہے اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی شریف کو چمار کہہ دیا جائے اُس کو بہت بڑا معلوم ہوگا لیکن اگر چمار کو چمار کہا جائے تو اُس کو خیال بھی نہ ہوگا۔ اسی طرح کفار کو کافر کہہ کر خطاب کرنے سے جتنا اُنھیں خیال ہو سکتا ہے اس سے زیادہ ہمیں ہونا چاہیئے چنانچہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ (جس شخص نے قصداً نماز ترک کردی تو وہ کافر ہوگیا) میں یہی بات سمجھنا چاہیئے کہ تاویل بہ نسبت عدم تاویل کے اس خاص اعتبار سے زیادہ موجب ہے تغلیظ کو اور اس سے زجر و توبیخ اور بڑھ گئی ہے اور اشتداد کم نہیں ہوا ایک اور شبہ ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ترک آخرۃ پر جو ملامت ہے مراد اس سے ترک اعتقادی ہے یعنی انکار اور ہم خدا تعالیٰ کے فضل سے آخرت کے قائل ہیں پس خود لفظ ہی عام نہیں اور اس لئے اس کا مصداق ہم نہیں ہو سکتے جواب اس کا یہ ہے کہ اوّل تو یہ قید بلا دلیل ہے دوسرے اگر تسلیم بھی کیا جاوے تو دوسری بعض آیات عموم میں محکم ہیں تیسرے ظاہر لفظ سے تو شبہ اطلاق کا ہے اور جس دل میں درد ہوتا ہے وہ تو تھوڑے سے لفظی التباس سے بھی بےچین ہو جاتا ہے خفیف سا خفیف التباس بھی ان کی جان پر بنا دیتا ہے۔

ع عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں)

لیکن اس کے لئے طلب کی ضرورت ہوتی ہے معترض خالی الذہن طلب سے دور ہیں حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ مشہور ہے کہ ایک کنجڑا ان کے سامنے سے گذرا اور آواز لگائی اَلْخِیَارُ الْعَشَرَۃُ بِدَانِقٍ یعنی دس ککڑیاں ایک دانگ میں یہ آواز سنتے ہی آپ کا ذہن "خیار" کے دوسرے معنی کی طرف منتقل ہوا یعنی خیر کی جمع آپ ایک چیخ مار کر بیہوش ہو گئے اور فرمانے لگے جب دس نیکیوں کی قیمت ایک دانگ ہے تو ہم بروں کی کیا قیمت ہے واقع میں کسی چیز کی فکر میں یہی حال ہوتا ہے خوب کہا ہے ؎

بسکہ در جان فگار و چشم بیدارم توئی ہر کہ پیدا می شود از دور پندارم توئی

(میری چشم و جان میں تو ہی سمایا ہے جو کچھ دور سے ظاہر ہوتا ہے تجھ ہی کو گمان کرتا ہوں)

ایک اور واقعہ حدیث میں آیا ہے کہ حضرت رسول مقبول صلے اللہ علیہ وسلم ایک دفعہ جمعہ کے دن خطبہ پڑھ رہے تھے اور بعض لوگ پریشان پھر رہے تھے آپ نے ان کے بٹھلانے کے لئے ارشاد فرمایا اِجْلِسُوْا (بیٹھ جاؤ) اس وقت ایک صحابی دروازہ پر تھے جس وقت آپ کی مبارک زبان سے اِجْلِسُوْا (بیٹھ جاؤ) کا لفظ ان کے کان میں پہونچا اُسی وقت دروازہ ہی پر بیٹھ گئے ہر چند کہ یہ حکم ان کے لئے نہ تھا لیکن شدت اطاعت غالب آگئی اور گوارا نہ ہوا کہ آپ ایک حکم فرمائیں خواہ کسی کو سہی اور اس کی تعمیل نہ کی جائے بسلمانو! تم میں ذوق اور محبت نہیں طلب صادق تم میں نہیں پائی جاتی اگر محبت و طلب ہوتی تو ہرگز ایسے شبہات و اعتراضات پیش نہ آتے۔ حق یہی ہے کہ اس آیت (مذکورۃ العنوان) میں خداوند تعالےٰ کا مقصود مطلقاً حب عاجلہ اور ترک آخرت پر شکایت کرنا ہے اور اس کے مختلف مراتب ہیں جس مرتبہ کی حُبِّ دنیا ہوگی اسی درجہ ترک آخرۃ ہوگی اور ویسی

ہی ملامت ہوگی اگر حُبّ دنیا و ترک آخرۃ مرتبہ اعتقاد میں ہو یعنی آخرۃ کا انکار ہے تو ابدالآباد تک جہنّم میں رہے گا کیونکہ کفر ہے اور اگر آخرۃ کا اعتقاد تو ہے لیکن عمل نہیں تو فسق ہے اور عذاب محدود کا استحقاق غرض جس طرح عقیدہ ضروری ہے اُسی طرح عمل بھی اور یہ عقیدہ مرجیہ کا ہے کہ عقیدہ درست ہونا چاہیے عمل کی ضرورت نہیں ہے عمل اور ایمان دونوں اپنے اپنے درجہ پر ہیں ہم چونکہ اہلسنت وجماعت ہیں اس لیۓ دونوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہر چند کہ دوسرا مرتبہ اور اس کی شکایت اوّل درجہ پر نہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا لیکن یہ مرتبہ بھی چھوٹا نہیں خاطر جمع نہ ہوجیۓ بلکہ اگر یہ صغیرہ بھی ہوتا تب بھی بیفکری کی چیز نہ ہوتا خیال کیجیۓ کہ چھوٹی سی چنگاری کیا گل کھلاتی ہے صغیرہ گناہ پر بھی جرآت کرنا بڑا زیان ہے اگر صغیرہ کوئی بڑی بات نہیں ہے تو جو صاحب یہاں سے جائیں وہ اپنے گھر جا کر چھت میں ذرا سی چنگاری آگ کی رکھ دیکھیں کہ وہ تھوڑی دیر میں کیا اثر دکھاتی ہے۔ اسی طرح چھوٹا سا گناہ بھی تمام نیکیوں کو برباد کرسکتا ہے جس طرح کہ چھوٹی سی چنگاری سارے گھر کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے اور دوسرا درجہ ترک آخرت کا اگرچہ معصیت ہے کفر نہیں اور معصیت کا درجہ کفر سے کم ہے لیکن اس پر عمل کرنا بھی تو سخت ظلم ہے اور کفر کے مقابلہ میں کم ہونے سے اس کا فی نفسہ صغیرہ ہونا لازم نہیں آتا مولانا کی ایک مثال مجھے یاد آئی فرماتے ہیں ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود لیک بس عالیست پیش خاک تود

یعنی آسمان گو عرش سے چھوٹا ہے مگر زمین سے تو بڑا ہے اگر کوئی شے درجہ میں چھوٹی ہو تو یہ لازم نہیں کہ وہ فی نفسہ بھی چھوٹی ہو۔ اور بعضے مدعی تو ہیں اعتقاداً ماننے کے مگر واقع میں وہ مِنْ حَیْثِیَّتِ الْمَذْہَب (دین کی حیثیت سے) نہیں مانتے بلکہ قومیت کی حفاظت کے لیۓ مانتے ہیں۔ مذہب چونکہ

ایک ایسی چیز ہے جو تمام افراد کو متحد بنا سکتا ہے اِس وجہ سے اُس کو اختیار کرلیا ہے اگر ان کی یہ غرض کسی اور مذہب سے حاصل ہوتی تو وہ ہرگز مسلمان نہ ہوتے۔ ایک اخبار میں یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ اب چونکہ ترقی کا زمانہ ہے اِس لئے وحشیانہ خیالات کو چھوڑ دینا چاہیئے اور سب ایک ایسے نقطۂ خیال پر قائم ہو کر ایک مذہب اختیار کرلینا چاہیئے اور اس کی صورت یہ ہے کہ توحید کو اختیار کرکے اس کو اصل مذہب قرار دیں اور اعتقاد رسالت کو بھی چھوڑ دیں افسوس! مسلمان اور یہ رائے ؎ از مذہب من گبر و مسلماں گلہ دارد (میرے مذہب سے گبر و مسلمان گلہ کرتے ہیں)

ایک ایسے ہی شخص کے جواب میں میں نے کہا کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو تو تسلیم کرتے ہو اور توحید یہی ہے کہ اُس کو ذات و صفات میں کامل اور متوحد خیال کیا جائے اور منجملہ کمالات کے صدق بھی ہو جھوٹ بولنا بڑا نقص ہے پس اعتقاد کذب منافی توحید ہوگا اور خدا تعالیٰ فرماتا ہے محمد رسول اللہ ﷺ۔ پس جو شخص رسالت کا منکر ہوگا وہ توحید ہی کا منکر ہوگا پس ثابت ہوا کہ توحید کا قائل ہوگا لازم ہے کہ رسالت کا بھی قائل ہو مگر ایسے قوم پرست رسالت ہی کا خاتمہ کئے دیتے ہیں اور ایسے لوگ اگرچہ بعض اوقات اسلام کی کچھ خدمت بھی کرتے ہیں لیکن خدمت ہمارے نزدیک اِس لئے قابل قدر نہیں کہ ان کا مقصود خود خدمت مذہب نہیں ہے بلکہ محض ترقی قوم مقصود ہے اور اگر اسلام کو سچا سمجھ کر اس کی خدمت کی جاتی تو ان کے آثار سے اس کی جھلک معلوم ہوتی لیکن واقعات اس کے خلاف ہیں۔ چنانچہ عقائد اسلام پر جرح کی جاتی ہے اہل دین کو حقیر سمجھا جاتا ہے مسائل اسلام میں شبہات پیدا کئے جاتے ہیں۔ اگر حق سمجھ کر دین مذہب کی خدمت کی جاتی تو ان باتوں کی کہاں نوبت آتی ان کی غرض تو صرف قومیت کا بڑھانا

اور قومیت کو نشوو نما بخشنا ہے جس طرح دوسری قومیں ترقی اور نشوونما حاصل کر رہی ہیں۔ ترقی کی دوڑ میں سب سے آخیر میں مسلمان جاگے لیکن ایسے جاگے کہ سوتے ہی رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا۔ غرض ترک آخرت کے مراتب مختلف ہیں اور اس کے اعتبار سے آجکل چند قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ (۱) پرانی وضع کے اُمرار جو عام قِسم کی بُرائیوں میں مبتلا پائے جاتے ہیں اگرچہ آسائشی زندگی نے انھیں ایسا بنا دیا ہے کہ اُن کی عملی زندگی بہت خراب ہے لیکن وہ بایں ہمہ جب علمار وصلحار کو دیکھتے ہیں تو دل سے تعظیم بجا لاتے ہیں اور جھک جاتے ہیں اور یہ سمجھ کر کہ یہ لوگ اللہ والے ہیں ان کا ادب کرنا چاہیئے ادب کرتے ہیں حتیٰ کہ محض درویش صورتوں تک سے ڈرتے ہیں خدمت کرتے ہیں اگرچہ وہ رہزن ہی کیوں نہ ہوں اور واقع میں یہ دنیا دار لوگ ان درویشوں سے ہزار درجے بہتر ہیں۔ میرے ایک عزیز بیان کرتے تھے کہ فلاں جگہ کے اُمرار تمام جنّتی ہیں اور فقرار دوزخی کیونکہ اُمرار تو فقرار سے دین کے لئے تعلق رکھتے ہیں اور فقرار اُمرار سے دنیا کا تعلق رکھتے ہیں۔ ایک حکایت کسی پیر مرد کی مشہور ہے کہ مرید نے پیر سے خواب بیان کیا دیکھتا ہوں کہ میری اُنگلیاں پائخانہ میں بھری ہوئی ہیں اور آپ کی اُنگلیاں شہد میں پیر جی نے کہا ہاں ٹھیک تو ہے اِس میں شک ہی کیا ہے ہم ایسے ہی ہیں اور تو ایسا ہی ہے۔ مرید نے کہا ابھی خواب پورا نہیں ہوا یہ بھی دیکھا کہ میں تمہاری اُنگلیاں چاٹ رہا ہوں اور تم میری اُنگلیاں چاٹ رہے ہو پیر بہت خفا ہوئے۔ اِس حکایت کا وہی حاصل ہے کہ مرید تو پیر سے دین حاصل کرنا چاہتا ہے کہ وہ مشابہ شہد کے ہے اور پیر مرید سے دنیا حاصل کرنا چاہتا ہے کہ مشابہ پائخانہ کے ہے (۲) وہ لوگ ہیں جن کے دل میں اِسلام کی وقعت وعظمت ہی نہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کا علاج

موت کو یاد کرنا ہے علم و اعتقاد تو تھا ہی عمل کی کمی تھی اِس وجہ سے موت کی یاد ان کے لئے عبرت بخش ہو گی چنانچہ فرمایا گیا ہے اَکْثِرُوْا ذِکْرَھَا ذِمِ اللَّذَّاتِ موت کو اکثر یاد کیا کرو موت کے خیال اور مراقبہ سے بہت جلد اِصلاح ہو جائے گی علاوہ ازیں فرمایا گیا ہے کہ اگر بیس مرتبہ روزانہ موت کو یاد کیا کرے تو شہادت کا مرتبہ حاصل ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صرف موت کا نام لے لیا کرو بلکہ غرض یہ ہے کہ موت کو اِس طرح یاد کرو کہ گناہوں سے بچانے کا سبب بن جائے۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وہ کسی محقق کی خدمت میں رہیں خدا کے لئے مسلمانو! رحم کرو تم نہایت خطرناک حالت میں ہو تمہاری اِصلاح کی سخت ضرورت ہے۔ اب معلوم کرنا چاہیئے کہ جس طرح اہل دنیا کی یہ قسمیں ہیں اسی طرح اہلِ دین باعتبار ترک آخرت کے دو قسم پر ہیں اہلِ ظاہر و اہلِ باطن۔ ظاہر دینداروں میں یہ کمی ہے کہ بعض اعمال آخرت کے جن کے ترک کو وضع کے خلاف نہیں سمجھتے انھوں نے چھوڑ رکھے ہیں۔ اور مضرات آخرت میں مبتلا ہیں مثلاً غیبت کرنا جو بلائے عام ہونے کے سبب مخل تقویٰ ہی نہیں سمجھا جاتا جیسا بی بی تمیزہ کا وضو تھا کہ فسق و فجور سے بھی نہ ٹوٹتا تھا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ؎

قال را بگذار و مرد حال شو پیش مرد کامل پامال شو

(قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جا کر پڑ جاؤ گے)

اور بدون اس کے تو اکثر حالت یہ رہتی ہے ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند چوں بخلوت می رسند ایں کار دیگر می کنند

مشکلے دارم ز دانشمند مجلس باز پرس توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

(یہ واعظین جو محراب و منبر پر جلوہ افروز ہوتے ہیں جب خلوت میں پہونچتے ہیں اور دوسرا کام کرتے ہیں مجھ کو ایک اشکال ہے دانشمند مجلس سے پوچھ توبہ کی نصیحت کرنے والے خود توبہ کیوں نہیں کرتے)

یہ تو خرابی واعظوں میں ہے ایک خرابی تارکین وعظ میں اس سے بڑھ کر ہے وہ یہ کہ بعضے لوگ اس لئے خود وعظ نہیں کہتے کہ خود عامل نہیں اس میں دو گناہ ہیں ایک تو خود عامل نہ ہونا اور عمل کرنے کی کوشش نہ کرنا دوسرے اور لوگوں کو بھی تبلیغ نہ کرنا بعض اہل علم دولتمندوں کے پاس پڑے رہتے ہیں اور لالچی وطماع ہو جاتے ہیں یہ بڑی بات ہے جو لوگ اچھے ہوتے ہیں وہ دولتمندوں سے ہمیشہ متنفر رہتے ہیں بِئْسَ الْفَقِيْرُ عَلٰى بَابِ الْاَمِيْرِ وَنِعْمَ الْاَمِيْرُ عَلٰى بَابِ الْفَقِيْرِ (فقیر امیر کے دروازہ پر جائے وہ برا ہے اور امیر جو فقیر کے دروازہ پر ہو وہ اچھا ہے) اسی لئے وہ حق نہیں کہہ سکتا کیونکہ طمع ان کو مانع ہوتی ہے ؏ طمع بگسل و ہرچہ خواہی بگو (لالچ کو چھوڑ دو جو چاہو کہو) شاہ سلیم کا واقعہ ہے کہ شاہجہاں ان کے پاس آئے تو انھوں نے پاؤں بھی نہ سمیٹے جو کسی نے پوچھا تو فرمایا کہ جب سے ہاتھ سمیٹا پاؤں پھیلا دیا۔ مولانا شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک مرتبہ لکھنؤ تشریف لے گئے لکھنؤ کے ایک شاہزادہ حاضر ہوئے اور زمینی سلام کیا آپ نے انگوٹھا دکھا دیا اُس نے اشرفی نذر دی آپ نے منہ چڑا دیا مولانا نے ایسا قصداً کیا تھا کیوں؟ اِس لئے کہ اہلِ دنیا تنگ نہ کریں اور غیر مہذب سمجھ کر وہ پاس نہ آئیں تاکہ دنیا داروں کے جھگڑوں سے نجات ہو یہ سب بے طمعی کے سبب تھا۔

پس جب مال کا علاج ایسے اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنا ہی اولیاء اللہ کی صحبت میں رہنے سے مال و دولت سے محبّت دور ہو جاتی ہے اور غناء باطنی حاصل ہوتا ہے یہ کمی تھی اہلِ ظاہر میں اس سے اہلِ باطن خوش ہو رہے ہوں گے کہ ہم میں کوئی کمی نہیں اور نہ کوئی خرابی ہو لیکن ان کو واضح رہنا چاہیئے کہ لطیف غذا جب بگڑتی ہے تو سب سے ہی زیادہ گندی ہو جاتی ہے۔ اِسی طرح صوفیوں کا بگڑنا ہے ان میں جو بگڑتے ہیں ان میں بدخلقی بدمزاجی وغیرہ ایسی بڑی باتیں پائی جاتی ہیں حالانکہ

درویشوں میں ان امور کا پایا جانا نہایت ہی مستنکر ہے۔ حضرت قبلہ و کعبہ
کی تعلیم بتلاتا ہوں حضرت حاجی صاحب رح فرماتے تھے کہ بعض درویش اُمرار
کی تحقیر کرتے ہیں یہ ہمیں پسند نہیں جب امیر تمہارے دروازہ پر آگیا تو حسب
قول نِعْمَ الْاَمِیْرُ عَلٰی بَابِ الْفَقِیْرِ (امیر اچھا ہے فقیر کے دروازہ پر) وہ نعم الامیر
میں داخل ہو گیا اس لئے اس سے اخلاق برتنا چاہیئے حضرت حاجی صاحب
رحمۃ اللہ علیہ سب سے ملتے اور سب کی تعظیم کرتے تھے نَزِّلُوا النَّاسَ مَنَازِلَهُمْ
ہمارے لئے حکم ہے یعنی لوگوں کو ان کے مرتبوں کے موافق بٹھاؤ میرا خیال
ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو بڑا بنائے جیسے امرار اس کو تم بھی بڑا سمجھو البتہ
خوشامد و طمع سے دور رہو اور خوش اخلاقی برتو مگر افسوس ہے کہ جو خوش
اخلاق بنے ہیں وہ امرار سے خود ملتے نہیں امرار کے گھروں پر جاتے نہیں
تو ایسوں سے بھلا ان کی اصلاح کیونکر ہو لیں نہ تو خود ان کے گھر جائیں
اور نہ ان کو اپنے آنے سے روکیں بلکہ اگر وہ آئیں تو ان سے ملنے میں عذر نہ
کریں کیونکہ ان کی اصلاح بھی تمہارا فرض ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ
بعض امرار اور دنیا دار علمار کی جو شکایت کیا کرتے ہیں وہ خود ہماری
اصلاح کے لئے ہمارے پاس کیوں نہیں آتے یہ شکایت بیجا ہے انھیں غور
کرنا چاہیئے کہ پیاسا کنوئیں کے پاس آتا ہے کنوئیں پیاسوں کے پاس نہیں
آیا کرتے علمار کو تمہاری ضرورت نہیں تم کو علمار کی ضرورت ہے تم ان کے
پاس جاؤ کیا کبھی سول سرجن بھی بغیر بلائے اور فیس لئے تمہارے گھر آیا ہے
اس خیال سے اگر میری رائے ہیں مولوی بھی اپنی فیس مقرر کر دیں تو اچھا
ہے لیکن ابھی مولوی جلدی نہ کریں کہیں میری رائے ظاہر ہوتے ہی فیس
لگا دیں بلکہ ابھی کچھ انتظار کریں ابھی اس کا موسم نہیں آیا ہے یہ عیب مذکور
بدمزاجی کا تو دنیا دار درویشوں میں ہے دوسرا عیب جو سچے صوفیوں میں
تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (یعنی دنیا عاجلہ کو اختیار کرتے ہیں) ہے وہ دقیق ہے وہ یہ کہ ذرا سا

کام کر لینے کے بعد اس امر کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی کیفیت پیدا ہو اور جب کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی تو پیر صاحب سے شکایت کرتے ہیں کہ ہم نے ورد پڑھا سب کچھ کیا لیکن ابھی تک کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوئی یہ بھی حُبِّ عاجلہ (دنیا کی محبت) میں داخل ہے کیونکہ کیفیت ثمرہ عاجلہ ہے جو موعود بھی نہیں اصل موعود و مقصود ثمرہ آخرت کا ہے کہ وہ نجات اور رضا ہے پس یہ بھی بڑی کمی ہے جس پر نظر ہی نہیں ہے اس کا علاج نقل کرتا ہوں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اگر کوئی آکر کہتا کہ حضرت اللہ کے نام سے کچھ فائدہ نہیں ہوا آپ جواب میں فرماتے کہ یہ فائدہ کیا کم ہے کہ اللہ کا نام لیتے ہو۔ ؎

گفت آں اللہ تو لبیک ماست ۔۔۔ ویں نیاز و سوز درد دل پیک ماست

(تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک (میں حاضر ہوں) ہے اور تیرے دل میں یہ نیاز و سوز ہمارا قاصد ہے)

نیز حضرت نے فرمایا کہ تم کسی امیر کے گھر جاؤ جو تمہارا آنا پسند نہ کرے تو وہ کان پکڑ کر نکال دیگا پس جب مسجد میں جاتے ہو اور وہاں سے نہیں نکالے جاتے تو سمجھو کہ حاضری مقبول ہے چنانچہ غیر مقبولین کو حاضری کی توفیق بھی نہیں ہوتی۔ ایک واقعہ ہے کہ کسی امیر کے غلام نے نماز کے وقت مالک سے اجازت چاہی مالک نے کہا اچھا غلام مسجد میں چلے گئے اور مالک دروازہ پر بیٹھے رہے غلام کو بہت دیر ہوگئی اور مالک نے مجبور ہو کر پکار کر دریافت کیا کہ اتنی دیر سے کیا کر رہے ہو غلام نے کہا کہ باہر آنے نہیں دیتا مالک نے کہا کون باہر آنے نہیں دیتا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا۔ ایک شخص نے ایک محقق سے کہا کہ اتنے دن ہوئے ذکر و شغل کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا جواب میں فرمایا کہ اگر نفع بھی نہ ہو تو کچھ پروا نہیں۔ اس کی مثال اس طرح ہے کہ مالک کسی غلام سے کوئی کام لے اور وہ مالک سے کہے کہ کیا ملے گا؟ کیا غلام کا یہ جواب گستاخی نہ ہوگا۔ اسی طرح ہم خدا تعالیٰ کے غلام ہیں ہمیں کیا حق ہے کہ ہم اُس سے کچھ معاوضہ مانگیں۔ بوستاں میں ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک شخص عبادت کرتا تھا آواز آئی کہ

قبول نہیں ہوتی مگر وہ عبادت میں مشغول رہا ایک مرید نے پیر سے کہا کہ ایسی عبادت سے کیا فائدہ جو مقبول نہیں ہوتی پیر نے کہا اے برخوردار ے

توانی ازاں دل بہ پرداختن کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

(اس سے دل اٹھا سکتا ہے کہ جان لے کہ بغیر اس کے دوسرے سے موافقت کرسکتا ہے)

اگر دوسرا اور دروازہ ہوتا تو میں وہاں چلا جاتا دروازہ یہی ایک ہے اس سے علیحدہ ہوکر کہاں ٹھکانا ہے اس پر فوراً آواز آئی ے

قبول است گرچہ ہنر نیست است کہ جز ما پناہِ دگر نیست است

(قبول ہو اگرچہ تیرا ہنر نہیں کیونکہ سوائے ہمارے تیرے لئے دوسری پناہ نہیں ہے ۔ ۱۲)

کانپور میں ایک بزرگ تھے شاہ غلام رسول رسول نما وہ اپنی توجہ سے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرا دیتے تھے ان کے علاوہ اور بھی ایسے لوگ گذرے ہیں وہ لکھنؤ اپنے مرشد کے پاس گئے بیعت ہونے کے لئے مرشد نے استخارہ کے لئے فرمایا شاہ صاحب وہاں سے تھوڑی دور ہٹ کر جا بیٹھے پھر حاضر ہوگئے مرشد نے کہا یہ کیسا استخارہ تھا۔ کہا کہ میں نے بیعت ہونے کے لئے نفس سے کہا بیعت بک جانے کو کہتے ہیں تو آزادی کو چھوڑ کر غلام بنتا ہے کیوں بیوقوف ہوا ہے نفس نے جواب دیا کہ بک جانے کے بعد خدا تعالیٰ تو ملے گا میں نے کہا کہ کیا تیرا اجارہ ہے اگر نہ ملا نفس نے کہا اگر نہ ملے گا تو بلا سے مگر اسے خبر تو ہوگی کہ ہم کو کسی نے طلب کیا تھا مگر ہم نہ ملے ے

ہمینم بس کہ داند ماہرویم کہ من نیز از خریداران اویم

(یہی مجھ کو کافی ہے کہ محبوب کو علم ہوجائے کہ میں بھی اس کے خریداروں میں ہوں۔)

مولوی صاحب نے فرمایا جزاک اللہ ایسا استخارہ کسی نے نہیں کیا۔ ہر کام میں مقصود کام ہی ہونا چاہیئے خواہ ثمر ملے یا نہ ملے ہر حالت میں راضی رہنا چاہیئے اگر ایسا نہ کیا گیا تو تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ (دنیا کو دوست رکھتے ہو) میں من وجہ داخل ہوگی مسلمانو! آخرت کے لئے عمل کرو ورنہ اس شکایت میں داخل ہوجاؤ گے ۔ تمام شد

ملنے کا پتہ :۔ مکتبہ تھانوی متصل مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی ۱

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

وعظ

مسمّٰی بہ

الاتفاق

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدّد الملّۃ حضرت مولانا محمّد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبۂ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ۔ کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلاتِّفَاق

اَین	مَتٰی	کَم	کَیف	مَاذا	مَن المنتفعون	لِم	مَن ضَبط	المستمعون	اشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر	کیا مضمون تھا	کس طبقہ کو زیادہ مفید ہے	کیوں ہوا	کس نے لکھا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
جامع مسجد تھانہ بھون	۱۰ ربیع الاول ۱۳۴۲ھ	۲ گھنٹہ ۴۰ منٹ	بیٹھ کر	اتفاق کے اسباب کی تحقیق	تعلیم یافتہ حضرات کو	[illegible]	[illegible]	۲۰۰	[illegible]

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَاٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ اَمَّا بَعۡدُ فَاَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیۡطٰنِ الرَّجِیۡمِ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۞ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَھُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ط (بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے تو عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کردیں گے) یہ آیت سورۂ مریم کی ہے۔ مجھ کو اس سے ایک ضروری مضمون کا بیان کرنا مقصود ہے اور خود اس کی ضرورت تو پہلے سے سب ہی کے نزدیک مسلّم ہے۔ مگر بیان کی ضرورت ذہن میں ابھی آئی ہے میں گڑھی پختہ گیا تھا اس کے متصل حسن پور ہے وہاں بھی جانا ہوا اور

وہاں وعظ بھی ہوا تھا۔ عین بیان کے وقت اِس مضمون کی ضرورت بھی ذہن میں آئی چنانچہ کچھ ناتمام سا بیان بھی کیا۔ ارادہ یہ تھا کہ اس مضمون کو کسی موقع پر مستقلاً بیان کروں گا۔ آج بیان کا ارادہ نہ تھا لیکن بعض احباب اور بعض اعزّا تشریف لے آئے اور زبانِ حال سے اُن کی فرمائش اور اشتیاق ظاہر ہوا۔ اِس لئے دل چاہا کہ اُس مضمون کو آج بیان کردوں لیکن یہ سوچتا تھا کہ اُس مضمون کو کسی آیت یا حدیث سے بیان کروں کوئی آیت یا حدیث ایسی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ مضمون اُس کا مدلول صریح ہو۔ جمعہ سے پہلے غسل وغیرہ کی تیاری میں پھر رہا تھا کہ اتفاقاً یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے قلب پر جاری ہوگئی لیکن اِس خیال سے نہیں کہ اِس مضمون سے اُس کا تعلق ذہن میں آیا ہو اِس طور سے کہ ہر مسلمان کو خالی وقت میں شوق میں کسی آیت یا حدیث کے بیان سے تکرار کرنے کی توفیق ہو ہی جاتی ہے عین تلاوت کے وقت تو کچھ خیال نہیں آیا بعد میں دفعۃً ذہن منتقل ہوا کہ یہ تو میرے مقصود پر صریح دال و ناطق ہے۔ میں نے اس کو منجانب اللہ سمجھا اور اس کو اپنے مضمون مقصود کا متمسک بنایا۔ رہا یہ کہ وہ مضمون کیا ہے سو وہ نفس ترجمہ سے ذہن میں نہ آویگا۔ مگر برکت کے لئے اول ترجمہ کسی قدر تفسیر کے ساتھ کئے دیتا ہوں حق تعالےٰ فرماتے ہیں کہ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا کردیں گے یعنی ایمان اور اعمال صالحہ والوں کے لئے اللہ تعالےٰ ایک وعدہ فرماتے ہیں اور وعدہ بھی قریب کا۔ گو یہ آخرت کا وعدہ بھی ہوسکتا ہے کہ آخرت بھی قریب ہی ہے مگر سَيَجْعَلُ کے س سے متبادر یہی ہے کہ دنیا کا وعدہ ہے۔ کیونکہ قرب متعارف دنیا ہی کو ہے چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کام جلدی ہو جائے گا تو یہی مفہوم ہوتا ہے کہ بہت جلد ہو جائیگا۔ پس ہم کو بِنَاءً عَلَى الْقَوَاعِدِ اللِّسَانِيَّةِ (زبان کے قواعد کی بنا پر)

یہ حق حاصل ہے جس شے کی نسبت حق تعالیٰ جلدی ہو جانے کا وعدہ فرماویں اُس کو دنیا کے وعدہ پر اور دنیا میں بھی بہت جلد حاصل ہو جانے پر محمول کرلیں بہرحال ایمان اور عمل صالح پر وعدہ وُدًّا کا جس کا نام محبت ہی فرماتے ہیں یعنی ایمان اور عمل صالح والوں کی محبّت اللہ تعالیٰ پیدا کردیں گے۔ اِس مقام پر اہلِ علم اس کو یاد رکھیں کہ میں نے اِس حاصل ترجمہ میں وُدّ کو مصدر مبنی للمفعول یعنی مصدر مجہول لیا ہے۔ آگے چل کر یہ بات کام آوے گی۔ یہ تو ترجمہ ہوا آیت کا۔ اِس ترجمہ سے وہ مضمون ذہن میں نہ آیا ہوگا۔ قبل اس کے کہ میں آیت سے اپنا مضمون مقصود اِستنباط کروں اوّل اُس مضمون کی تعیین کردوں اور اس سے بھی اوّل سمجھنا چاہیے کہ وہ مسئلہ جس طرح قرآن وحدیث سے ثابت ہوتا ہے اسی طرح وہ تمدّن کا بھی مسئلہ ہے بلکہ تمدّن پرستوں کے نزدیک تو تمامی مسائل تمدّن کا وہی اصل الاصول اور راس اور اساس ہے اور ان کا کوئی لکچر و تقریر اس سے خالی نہیں ہوتا وہ مسئلہ کیا ہے اِتفاق ساری دنیا اس کی دعوت دیتی ہے خواہ اس کی حقیقت سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں لیکن اِس پر اتفاق ہے کہ اتفاق ضروری ہے اور تمدّن کے تمام اُصول اس پر موقوف ہیں۔ کوئی اصل تمدّن کی بغیر اس کے بار آور نہیں ہو سکتی۔ ہرچند کہ اب شہرت کی وجہ سے یہ مسئلہ باوقعت نہیں رہا لیکن حقیقت کے اعتبار سے اب بھی اُمہات مسائل سے ہے خصوص تمدن کو اس کے ساتھ بہت ہی بڑا علاقہ

مسائل کے اُصول

بلکہ اس کا موقوف علیہ اور مبنیٰ ہے۔ پس میں اس مسئلہ کو اِس آیت سے بیان کرنا چاہتا ہوں اور اس کے سننے کے بعد یہ بھی معلوم ہو جاوے گا کہ قرآن مجید ہی وہ شے ہے کہ ہم کو ہر موقع اور ہر شے میں اس کی ضرورت ہی کوئی حالت ہماری ایسی نہیں کہ ہم کو اس کی ضرورت نہ ہو لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کپڑا بننے کی ضرورت ہو یا مکان بنانے کی ضرورت ہو یا

کوئی مشین چلانے کی ضرورت ہو تو اُس کا بھی طریقہ قرآن مجید میں مذکور ہے ہم اِس کا دعویٰ نہیں کرتے اور نہ ہم سب اس کو نباہ سکتے ہیں اگرچہ بعض لوگوں نے اِس کا بھی التزام کیا ہے چنانچہ شیخ محی الدین بن عربی رحمۃ اللہ کی ایک کتاب ہے شجرہ نعمانیہ اُس کا نام ہے۔ اُنھوں نے اپنے زمانہ سے لیکر نفخ صور تک کے حالات صرف سورۃ روم کی اوّل آیات سے لکھے ہیں اور اس میں علم جفر و تکسیر وغیرہ سے کام لیا ہے حروف کے اعداد لیکر اُن کے اندر کچھ قواعد جاری کئے ہیں۔ اصل میں تو واقعات انکو منکشف ہوئے ہیں انھوں نے خاص ذوق و سلیقہ سے ان آیات سے ان کو چسپاں کر دیا ہے اور یہ سب رموز ہیں پھر اُس کی شرح بھی خود ہی لکھی ہے وہ بھی رموز میں ہے پھر کسی بزرگ نے اس کی شرح کی بھی شرح لکھی ہے لیکن وہ بھی رموز اور اشارات میں ہے باوجود اس قدر اخفاء کے پھر ڈر ہوا ہے کہ کوئی سمجھ کر ظاہر نہ کر ڈالے اِس لئے ماتن اور شارح دونوں نے بے انتہا قسمیں دی ہیں کہ اگر کوئی ان کو سمجھ جاوے تو منہ پر نہ لاوے۔ بعضوں نے اور علوم بھی قرآن مجید سے نکالے ہیں اور اسی بناء پر بعض لوگوں نے کہا ہے ؎

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ ۔۔۔ تَقَاصُرُ عَنْہُ اَفْہَامُ الرِّجَالِ

(قرآن پاک میں جملہ علوم ہیں لیکن لوگوں کی عقل و فہم وہاں تک پہونچنے سے عاجز ہیں)

مگر میں کہتا ہوں ؎

ومن دید نی حب الدیار لاہلہا ۔۔۔ وللناس فیما یعشقون مذاہب

(کون شخص جو دیار محبوب کو ان کے اہل کے لئے قریب کردے لوگوں کے عشق کے بارہ مختلف طرق ہیں)

ہر شخص کا مذاق جُدا ہے۔ ہمارا مذاق تو اس کے خلاف ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہر کتاب کا کمال اس کے موضوع کے اعتبار سے ہونا ہے یعنی جس فن کی وہ کتاب ہے اُس فن میں یکتا ہونا اور زوائد سے خالی ہونا ہی

اس کی خوبی ہے۔ طبِ اکبر کی یہ خوبی نہیں ہے کہ اُس میں غیر طب کے بھی مسائل ہوں مثلاً صرف و نحو کے مسائل اُس میں مذکور ہوں اُس کا کمال تو یہ ہے کہ اُس میں طب کے مسائل خوبی سے درج ہوں۔ ہاں اُن کے ضمن میں یا اُن مسائل کی تتمیم کے لئے اگر دوسرے فن کے مسائل آجاویں تو مضائقہ نہیں جیسے نفیسی کی کلیات میں فلسفہ سے کام لیا گیا ہے۔ پس قرآن مجید ایک طب کی کتاب ہے۔ آپ کو یہ جملہ سُنکر شاید شبہ ہوا ہوگا کہ قرآن مجید میں گل بنفشہ کا تو کہیں ذکر نہیں پھر اس کو طب کیسے کہہ دیا۔ صاحبو! میری مراد طب سے طب جسمانی نہیں ہے۔ طب روحانی ہے یہ طب وہ ہے جس کی نسبت فرماتے ہیں ؎

چند خوانی حکمت یونانیاں	حکمت ایمانیاں راہم بخواں

(تم کب تک حکمت یونانی کی کتابیں پڑھو گے حکمت ایمانی و معرفت کی بھی کتابیں پڑھو)

آگے دونوں طبوں کی غایت بیان فرماتے ہیں ؎

صحت ایں حس بجوئید از طبیب	صحت آں حس بجوئید از حبیب
صحت ایں حس زمعموری تن	صحت آں حس زتخریب بدن

(اِس حس جسمانی کی درستی چاہتے ہو تو طبیب سے رجوع کرو اور اگر اُس حس روحانی کی درستی منظور ہے تو مرشد کامل سے رجوع کرو حس جسمانی کی صحت بدن کی درستی سے ہوتی ہے اور حس روحانی کی صحت بدن کی تخریب سے ہوتی ہے ۱۲)

تو قرآن مجید اس طب کی کتاب ہے۔ تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ طب بدنی کی کتابوں میں تو امراض بدنیہ اور اُن کے علاج اور تدبیریں لکھی ہیں جس کا ثمرہ صحت و بقاء محدود دنیوی ہے اور قرآن مجید جس طب کی کتاب ہے اس میں امراض نفسانیہ اور ان کا علاج مذکور ہے اور اس کا ثمرہ ہلاکت ابدی سے نجات ہے۔ پس قرآن مجید میں صرف اس طب کے مسائل ہونا قرآن مجید کا یہی کمال ہے۔ اور دوسرے مسائل

اپنے ذہن سے اُس میں نکالنا یہ قرآن مجید کے لئے نقص کا باعث ہوگا باقی بزرگوں کے کلام میں جو غیر فن کے بعض اسرار کا تعلق قرآن مجید سے متوہم ہوتا ہے سو وہ مدلولات کی حیثیت سے نہیں بلکہ لطائف کے درجہ میں ہی آجکل بہت سے قرآن مجید کے دشمن دوست نما پیدا ہوئے ہیں جو قرآن مجید میں سے سائنس کے مسائل درجہ دلالت میں ثابت کرتے ہیں۔ یہ سخت دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں وہ تو فخر کے طور پر کہتے ہین کہ جو مسئلہ اہلِ یورپ اور سائنس دانوں نے آج سمجھا ہے وہ قرآن مجید میں تیرہ سو برس پہلے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل چکا ہے۔ لیکن فی الواقع ؎

دوستی بے خرد چوں دشمنی ست　　　حق تعالیٰ زیں چنیں خدمت غنی ست

(بے عقل کی دوستی دشمنی ہے۔ حق تعالیٰ ایسی خدمت سے بے پرواہ ہیں۔)

خدا تعالےٰ کو اور خدا تعالےٰ کے کلام کو اس خیر خواہی کی ضرورت نہیں یاد رکھو اس مسلک میں کئی طرح کی دشمنی ہے۔ اور مولوی لوگ اُن مسائل کی تحقیق اور قرآن مجید کے ساتھ زبردستی چسپاں ہوسکنے کی تقریر سے بیخبر نہیں ہیں۔ چنانچہ میں حالانکہ ایک ادنیٰ طالب علم ہوں مگر خود میرے پاس اس کا بڑا دفتر ذہن میں موجود ہے لیکن اُن ہی خرابیوں کے سبب قرآن مجید سے اُن کو کبھی متعلق نہیں کیا جاتا بقول بزرگے ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(راز کا فاش کرنا مصلحت کے خلاف ہے ورنہ تو مجلسِ عارفین میں کوئی چیز ایسی نہیں کہ نہیں)

ہمارے زمانہ کے یہ محققین تو یوں سمجھتے ہیں کہ اِن مُلّانوں کو خبر نہیں ہے۔ صاحبو اِن مدّعیوں کو تو ایک ہی خبر ہے کہ یہ مسائل قرآن مجید سے اِسطرح نکلتے ہیں اور مُلّانوں کو اس کی بھی خبر ہے اور اِس میں جو مضرّت ہے اس کی بھی خبر ہے۔ چنانچہ اہلِ نظر و تحقیق کے نزدیک ایک خرابی جو اِس کیلئے

لازم غیر منفک ہے یہ ہے کہ جس فن کی وہ کتاب ہے وہ مسئلے اُس فن کے نہیں طب کی کتاب اگر کوئی لکھے اور اس میں ایک فصل تو لکھے امراض راس کی اور آگے اُس کے فَعَلَ فَعَلَا فَعَلُوْا کی بحث لکھے پھر دوسری فصل لکھے امراض لبطن کی اور تیسری فصل میں یَفْعَلُ یَفْعَلَانِ کی بحث لکھ دے تو یہ کتاب کیا ہوگی۔ آدھی میزان الطب اور آدھی میزان الصرف اُس کو کہا جاوے گا۔ پھر اُس کو اگر اہلِ علم کے روبرو پیش کیا جاوے تو اُس کتاب کو کون پسند کرے گا تو کیا قرآن مجید کو آپ ایسا بنانا چاہتے ہیں کیا یہ قرآن مجید کے لئے نقص نہ ہوگا دوسرے جو مسائل قرآن مجید سے یہ لوگ اِستنباط کرتے ہیں اور جن کے اوپر بڑا فخر و ناز ہے وہ کوئی دقیع مسائل بھی نہیں۔ سب ممد و معاون شکم و دہن کے ہیں تو جن کے نزدیک (مددگار) شکم و دہن اور اُن کی خدمت بڑی چیز ہے ان کے نزدیک یہ مسائل بیشک مہتم بالشان اور مایۂ فخر و ناز ہوں گے۔ ہم تو ان کو کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ اور اگر وہ ایسے مسائل ہوں جن میں شکم و دہان کی بھی امداد نہیں تو پھر تو بالکل ہی لغو ہوں گے کیونکہ نہ آخرت کے لئے مفید نہ دنیا کیلئے نافع حاصل یہ کہ وہ مسائل اگر کچھ کام کے ہیں تو دنیا ہی کے کام کے ہیں تو جن کے نزدیک دنیا بڑی چیز ہے وہ ان مسائل پر فخر کرے اور جن کو دنیا اُس کی اصلی حالت پر نظر آرہی ہو اور وہ اصلی حالت کیا ہے یہ ہے کہ لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا عِنْدَ اللهِ جَنَاحُ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى مِنْهَا كَافِرًا شَرْبَةَ مَاءٍ یعنی اگر دنیا اللہ کے نزدیک ایک مچھر کے پَر کی برابر ہوتی تو کافر کو اس میں سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نہ پلاتے۔ پس ان کے نزدیک تو یہ مسائل باد در دست اور نقش بر آب (ہوا ہاتھ میں اور نقش آب پر) سے بھی کم ہیں ان تحقیقات کی اہلِ نظر کی نظروں میں ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص تھانہ بھون کا جغرافیہ لکھے اور اس میں اس نے یہ تو لکھا ہے کہ فلاں جگہ جامع مسجد ہے اور

وہ ایسی ہے اور بازار اس قسم کا ہے اور فلاں موقع پر قاضی نجابت علی خاں کا مکان ہے لیکن کسی جگہ لونڈیوں نے کھیلنے کے لئے گارے سے پیر مکوڑا بنایا تھا بھلے مانس نے اُس جغرافیہ میں وہ بھی لکھ دیا تو ظاہر ہے کہ جغرافیہ داں اور اہلِ علم اُس شخص پر کیسا کچھ ہنسیں گے اور کس قدر بیوقوف بنائیں گے سو اسی طرح اہلِ بصیرت بھی اس زمانہ کے محققین کی تحقیقات پر ہنستے ہیں واللہ دنیا کے مسائل قرآن مجید میں ہونا ایسے ہی ہیں بلکہ اس سے بھی کمتر جیسے اس جغرافیہ میں لڑکیوں کا ریت کا گھر۔ اور منشا اصلی اِن تحقیقات کی قرآن میں داخل کرنے کا یہ ہے کہ یہ لوگ اہلِ یورپ کو اللہ تعالٰے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی برابر بلکہ خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر جانتے ہیں۔ چنانچہ اگر اللہ تعالٰے اور رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی بات اُن کے موافق ہو تو مانتے ہیں ورنہ اُس میں پھیر پھار کرتے ہیں۔ پس جو مسائل اُن لوگوں نے سمجھے ہیں قرآن مجید کو ان کی موافق بنانے کے لئے اُن کو قرآن سے استنباط کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے اقوال اور اُن کی تحقیقات کو تو ان لوگوں نے اصل ٹھیرایا اور قرآن کو تابع۔ سو اس منشار کا فساد ظاہر ہے۔ سو بنا بھی فاسد۔ پھر اُس پر ان مسائل کا بوجہ دنیوی ہونے کے بے وقعت ہونا گویا مبنی کا فاسد ہونا ہی پھر قرآن مجید سے استنباط کرنا بنار الفاسد علی الفاسد (فاسد کی فاسد پر بنا ہی) چنانچہ ان کے بے وقعت ہونے کی مسلمان کے نزدیک یہ کافی دلیل ہے کہ خدا تعالیٰ و رسول صلے اللہ علیہ وسلم تو دنیا کی تحقیر کرے توہین کرتے اور پھر ان حضرات کو اس پر فخر ہے ناز ہے۔ یاد رکھئے آپ کے نزدیک اِس وقت دنیا قابل قدر وقعت ہے اور جب كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (جتنے روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جاویں گے ۱۲) کا ظہور ہو گا اور آپ جو اِس وقت مَن چنینم من چنانم (میں ایسا ہوں میں ویسا ہوں) کر رہے ہیں آپ بھی اِس مَن

(عربی متن) میں داخل ہو جائیں گے اُس وقت معلوم ہو گا کہ ہم کس مہلات میں مبتلا ہیں آج جس سکہ کی قدر ہے کل وہاں اس کی کچھ قدر نہ ہوگی اور اس سکہ کی وہی مثال ہوگی کہ باپ نے اپنے لڑکے نادان کو ایک[عے] روپیہ جس پر[عے] سیاہی لگی ہوئی تھی دیا۔ لڑکا اُس کو لیکر باہر نکلا تو کسی ٹھگ[علے] نے دیکھ لیا ٹھگ کے پاس ایک شیشہ[للعے] کا ٹکڑا تھا جو چمک دمک ظاہری میں اس روپیہ سے بڑھ کر تھا اُس لڑکے کو اُس نے دھوکہ دے کر وہ روپیہ لے لیا اور شیشہ کا ٹکڑا دیدیا۔ اب لڑکا خوش ہے کہ میرے پاس روپیہ ہے جب بازار پہونچے تو وہ میوہ فروش کو وہ روپیہ دیا اُس نے اُٹھا کر پھینک دیا کہ یہ روپیہ یہاں نہیں چلتا۔ یہ مصنوعی اور ظاہری بازار میں چلتا ہے یہ تو واقعی اور سچا بازار ہے یہاں سچا سکہ چلے گا۔ اب یہ لڑکا تہی دست رہ گیا اُس وقت سمجھ میں آیا ہے

کہ بازار چندانکہ آگندہ تر تہیدست را دل پراگندہ تر

(بازار جس قدر بھرتا اور رونق پر آتا ہے تہی دست کا دل زیادہ پراگندہ ہوتا ہے ۱۲)

اُس وقت سوائے حسرت کے کچھ ہاتھ نہ آویگا۔ یہ سب قصہ موت کے ساتھ ہی نظر آجائے گا۔ یہ سائنس کے مسائل اور ان تحقیقات جدیدہ کا وہاں پتہ بھی نہ لگے گا وَضَلَّ عَنكُم مَّا كُنتُمْ تَزْعُمُونَ (اور وہ تمہارا دعویٰ سب تم سے غائب ہوگیا) الحاصل ایک خرابی تو قرآن شریف سے مسائل سائنس وغیرہ کی یہ ہوئی۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ سائنس کے مسائل ہمیشہ متبدل ہوتے رہتے ہیں۔ پرانی سائنس آجکل گرد ہو رہی ہے۔ حال کی سائنس کی

عے استعداد قبول حق کی جو فطرۃ سب کو ملی ہے ۱۲ جامع عمے ناگواری طبع ونفس ۱۲ جامع لعے رہزن دین من الجنۃ والناس ۱۲ جامع للعے دنیا و متاع دنیا جن کو لوگ خریدتے ہیں اور دولت ایمان برباد یا بے رونق کردیتے ہیں یا کم از کم اُس میں لگ کر اس دولت کو بھولجاتے ہیں ۱۲ جامع

خود اختلاف ہے اور ممکن ہے کہ آیندہ جو محققین پیدا ہوں ان کی تحقیقات اِس کے بالکل خلاف ہوں تو آج اگر کسی سائنس کے مسئلہ کو قرآن مجید کی تفسیر بنا دیا اور یہ ثابت کر دیا اور تسلیم کر لیا کہ یہ مدلول قرآنی ہو تو کل کو جبکہ ان مسائل کی غلطی ثابت ہو جاویگی ایک ادنیٰ سا ملحد اس کو غلط ثابت کر کے پھر اس سے قرآن مجید کا نعوذ باللہ خلاف واقع کے ہونا دکھلا دیگا اور مخالفین کو یہ کہنے کی گنجایش ہو جاویگی کہ تمہارے مذہب کی یہی کتاب جس میں ایسے خلاف واقع مسائل ہیں۔ پس یہ مسلک درحقیقت قرآن کی خیر خواہی نہیں بلکہ بدخواہی ہے۔ تیسری خرابی اور ہو اور اُس کو میں بے غیرتی سے تعبیر کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ان مسائل کو مدلول قرآنی بناتے ہیں گویا اہل یورپ کو احسان جتلانے کی گنجایش دیتے ہو کہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری بدولت آج قرآن مجید کے معنی معلوم ہوتے۔ اگر ہم اِن مسائل کی تحقیق نہ کرتے تو پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے لیکر اس وقت تک کسی کو قرآن مجید کا پتہ نہ لگتا اور تم کو غیرت دے دے کر وہ کہینگے کہ کہاں گئے ابو بکرؓ کہاں گئے عمرؓ کہاں ہیں غزالیؒ اور کہاں ہیں ابن عباسؓ دیکھو اِن حضرات میں سے کسی نے قرآن مجید کو نہیں سمجھا۔ پھر سمجھایا کس نے یورپ کے دہریوں نے جرمن کے ملحدوں نے۔ افسوس جب ایسا ہوگا تو ڈوب مرنے کا وقت ہوگا۔ خدا کی قسم ہے ہمارے یہاں سب کچھ ہو اور دوسروں کے یہاں کچھ نہیں۔ کیوں اُن کی کاسہ لیسی کی جاتی ہو اور کیوں قرآن مجید میں اُن کی خاطر سے تحریف کی جاتی ہے ؎

برہوا تاویل قرآں می کنی — پست و کژ شد از تو معنی سنی
چوں ندارد جاں تو قندیلہا — بہر بینش میکنی تاویلہا
کردۂ تاویل لفظ بکر را — خویش را تاویل کن نے ذکر را

(ہوا پر قرآن میں تاویل کرتے ہو جس سے اس کے روشن معنی پست و کج ہو جاتے ہیں)

تمہارے اندر قرآن کے سمجھنے کا فہم ہی نہیں اس لئے تاویلات کرتے ہو قرآن کے سمجھنے کا فہم پیدا کرو اور تاویلات کو چھوڑ دو)

خود تمہارے اندر سب کچھ ہے۔ تمہارے اندر وہ نور موجود ہے کہ اُس کے ہوتے ہوئے تم کو کسی کی حاجت نہیں۔ اُس نور کی طرف توجہ کرو دیکھو تو کیا کیا علوم کھلتے ہیں جن کے سامنے یہ علوم مادیہ سب خرافات نظر آویں گے

بینی اندر خود علوم انبیار بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب اور بغیر معین و اُستاد کے انبیار جیسے علوم پاؤ گے ۱۲)

اُس وقت تم کو معلوم ہو گا کہ وہ سب تحقیقات بچوں کا کھیل تھا۔ پس اے مہذبین کی جماعت اِس کا ہرگز ہرگز وسوسہ بھی نہ لاؤ کہ قرآن مجید میں ساری چیزوں کو ٹھونسو ہاں ضمناً تبعاً کوئی مسئلہ اس حیثیت سے آجا دے کہ اُس کو بھی طب روحانی میں دخل ہو تو اور بات ہے چنانچہ اتنی سائنس قرآن مجید میں بھی موجود ہے جہاں ارشاد ہے اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ○ یعنی بیشک آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں اور رات اور دن کے ادل بدل میں اور جہازوں میں جو چلتے ہیں سمندر میں وہ چیزیں لیکر جو نفع دیتی ہیں لوگوں کو اور پانی میں جو اُتارا ہے اللہ نے آسمان سے پھر جلا دیا اس سے زمین کو اس کے مرنے (خشک ہونے) کے بعد اور پھیلا دیے اُس میں ہر قسم کے جانور اور ہواؤں کے پھیرنے میں اور بادل میں جو گھرا ہوا ہے آسمان زمین کے درمیان میں (سب میں) دلیلیں ہیں اُن لوگوں کے واسطے جو عقل رکھتے ہیں۔ سو ان آیات سے اِن چیزوں کی تحقیقات منظور نہیں کہ اِس حیثیت سے اس کا طب روحانی

سے کوئی تعلق نہیں بلکہ اس سے مصنوع سے صانع پر استدلال کیا ہے کہ یہ سب مصنوع ممکن ہیں ان کے لئے کوئی محارث ضروری ہے اور اس حیثیت سے اس کا تعلق طب روحانی سے ظاہر ہے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ یعنی اور ہم نے بنایا آدمی کو سنی ہوئی مٹی سے پھر ہم نے اس کو رکھا نطفہ بنا کر مضبوط جگہ (عورت کے رحم) میں۔ پھر ہم نے بنایا اس نطفہ کو لوتھڑا۔ پھر ہم نے اُس لوتھڑے کی بنائی بوٹی۔ پھر بنائی بوٹی کی ہڈیاں۔ پھر پہنا دیا ہڈیوں کو گوشت۔ پھر اسکو بنا کر کھڑا کیا ایک نئی صورت میں۔ تو بابرکت ہے اللہ جو سب سے بہتر بنانے والا ہے۔ دیکھئے اس آیت میں سائنس انسانی کے تمام تقلبات و اطوار موجود ہیں مگر اس میں کاوش نہیں کی گئی اور نہ اس حیثیت سے بیان کیا کہ ماہیات بیان کی جائیں بلکہ مقصود قدرت پر استدلال ہے اور بیان بھی سیدھی طور سے ہے جس کو ساری دنیا سمجھ سکتی ہے اِس لئے کہ قرآن مجید کے مخاطب تمام عالم کے افراد ہیں اور ان میں سب طرح کے ہیں۔ اکثر تو عوام ہیں اِس لئے اُس کے خطابات بھی ایسے ہیں کہ جس کو ہر عامی سمجھ سکتا ہے۔

عہ سوال اس مقام پر شبہ ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ لَا تَنْقَضِيْ عَجَائِبُهٗ (اس قرآن کے عجائبات ختم ہو جائیں گے) کیا ان عجائب میں یہ مسائل فلسفیہ شامل نہیں ہو سکتے اور کیا ہر عامی کا سمجھنا اس حدیث کے معارض نہیں۔ جواب۔ عجائب سے مراد اگر علوم فلسفیہ جدیدہ ہوں تو لازم آئے ہے کہ صحابہ میں سے کسی نے ان عجائب کی ایک فرد بھی نہیں سمجھی کیونکہ کسی صحابی نے قرآن مجید سے ان چیزوں کو کبھی نہیں بتایا کیا عجائب سے مراد علوم نافعہ فی الآخرت ہیں ہیں کہ وہ دوسرے دلائل صحیحہ کے بھی مدلول ہیں لیکن اہل فہم عالی کو قرآن مجید سے بھی مفہوم ہو جاتے ہیں جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہے اِلَّا فَهْمًا اُوْتِيَهُ الرَّجُلُ فِي الْقُرْاٰنِ (لیکن فہم جیدہ جو کہ قرآن کے بارے میں عطا کیا گیا ہے) اور عامی کا سمجھ سکنا ہر مضمون کیلئے عام نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ جتنا حصہ ضروریات دین میں داخل ہے اس پر وجہ دلالت اور جو اس کیلئے مقدمات بنائے گئے ہیں ان کا مفہوم و مدلول عام فہم ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ (اور البتہ ہم نے قرآن آسان کر دیا ذکر کیلئے) اسکی دلیل ہے اور ضروریات دین کی تعریف اہل علم کے نزدیک معروف ہے ۱۲ اشرف

غرض سائنس وغیرہ کے مسائل قرآن مجید میں اتنے ہی لئے گئے ہیں کہ جن کو نجات ابدی میں دخل ہے۔ پس میں نے جو دعویٰ کیا ہے کہ قرآن مجید کی ہم کو ہر موقع میں ضرورت ہے اور ہر جگہ کام آتا ہے۔ اس ہر موقع سے مراد طبعیات اور ریاضیات وطرق معاش کے مواقع نہیں بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ جن امور کو فلاح اُخروی میں دخل ہے خواہ اُس کا وقوع دنیا میں ہو یا آخرت میں ہو اُس میں ہم کو قرآن مجید کی ضرورت ہے اور جو محض دنیا ہی ہو یا کہ نہ دنیا ہو نہ آخرت کے متعلق ہو بلکہ لغو ہو قرآن مجید کو اس سے بحث[ع] نہیں۔ سو اُن اُمور دنیویہ نافعہ فی الدین (دین میں نفع دینے والے) میں سے ایک اِتفاق بھی ہے کہ وہ قرآن مجید میں مامور بہ ہے چنانچہ ارشاد ہے یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْھَبَ رِیْحُکُمْ یعنی اے ایمان والو اللہ تعالیٰ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو تم بزدل وسُست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی۔ دیکھئے اس آیت میں مسئلہ اتفاق کو بیان فرمایا ہے۔ اس پر بیشک ہم فخر کریں گے کہ قرآن مجید نے ہم کو کیسے عجیب و غریب مسئلہ کی تعلیم کی ہے اور جی کھول کر ہم اس کو مدلول و منصوص قرآنی کہیں گے۔

باقی اور علوم جو بزرگوں نے قرآن سے نکالے ہیں اُن کو یہ کہیں گے کہ منطبق علی القرآن ہیں مدلول قرآن نہیں ہیں۔ یوں نہ کہیں گے کہ ثابت بالقرآن ہیں ہاں منطبق موافق کہدیں گے۔ چنانچہ اوپر بھی اجمالاً عرض کیا گیا ہے اور مدلول اور منطبق میں بڑا فرق ہے۔ ایک مثال سے آپ کو اس کا فرق ظاہر ہو گا۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس حجام آیا اور اُس نے کہا کہ خط بنوا لیجئے۔ اُس نے جواب دیا کہ بڑھنے دو۔ اتفاق سے جس وقت

ع یعنی اس کے تحصیل کے طرق قرآن مجید میں نہیں ہیں۔ باقی جواز و عدم جواز کی حیثیت سے اُس سے بھی بحث ہے ۱۲ جامع

اُس نے یہ جواب دیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے ڈوم بھی اُن کی لڑکی کی شادی کا خط لیکر آیا۔ وہ بھی اتفاق سے اِس جواب سے اپنا مطلب نکال لے تو یہ جواب "بڑھنے دو" دونوں سوالوں کا ہو سکتا ہے اوّل سوال کا تو اِس طرح کہ خط بڑھنے دو جب بڑھ جائے گا بنوائیں گے۔ دوسرے سوال کا اِس طور پر کہ لڑکی ابھی چھوٹی ہے اُس کو بڑھنے دو پس پہلے معنی کو تو مدلول کہیں گے اور دوسرے کے مدّعا پر اس کو صرف منطبق کہیں گے۔ قصد تو یہ تھا کہ نائی کو جواب دیں لیکن یہ کلام کی لطافت ہے کہ وہ ڈوم کا بھی جواب ہو گیا پس اس کو نکتہ اور لطیفہ کہہ سکتے ہیں اور تفسیر نہیں کہہ سکتے۔ یہاں سے ایک بات اور کام کی سمجھ میں آئی وہ یہ ہے کہ صوفیہ کرام نے آیات کے متعلق کچھ بصورت تفسیر کے کہا ہے مثلاً اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى (فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے) کے متعلق لکھا ہے اِذْهَبْ اَيُّهَا الرُّوْحُ اِلَى النَّفْسِ اَنَّهٗ طَغٰى اور اَذْبَحُوْا بَقَرَةَ النَّفْسِ (اے روح نفس کے پاس جا اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے اور ذبح کرو نفس کے بیل کو) تو ان تاویلوں کو دیکھ کر دو جماعتیں ہو گئی ہیں۔ ایک تو جو صوفیہ کی محبت سے خالی ہیں اور يَحْمَلُ النُّصُوْصَ عَلٰى ظَوَاهِرِهَا (نصوص کو ظواہر پر محمول کرتے ہیں) کے پورے پابند ہیں اُنھوں نے تو اِن تاویلات کا بالکل اِنکار کر دیا کہ کہاں فرعون کہاں نفس کہاں موسیٰ کہاں روح۔ یہ تو ایسا ہے کہ زمین بول کر آسمان مراد لے لیں۔ اور صوفیہ کو اس بنا پر ضال و محرّف کہہ کر ان کے منکر ہو گئے۔ سو ان کو تو یہ ضرور ہوا کہ حضرات اہل اللہ کے برکات سے محروم ہوئے۔ دوسرے وہ تھے جو اِن حضرات کی محبت میں غرق ہیں وہ یہ کہنے لگے کہ قرآن کا مدلول اور تفسیر یہی ہے علماء ظاہر نہیں سمجھے اِس میں تو سارا قصہ باطن کا ہے۔ پھر اس بات میں ان غالین کا یہاں تک غلو بڑھا کہ بعض جگہ تو انھوں نے قرآن مجید کی گت ہی بنا

دی۔ جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک جلد ساز تھے جو شخص کتاب یا قرآن جلد بندھوانے لاتا تھا۔ وہ اُس میں کچھ اِصلاح ضرور کر دیا کرتے تھے ایک شخص قرآن شریف جلد بندھوانے کے لئے اُن کے پاس لائے اور کہا کہ اس کی جلد باندھ دو مگر شرط یہ ہے کہ کچھ اِصلاح نہ دیجیو۔ کہنے لگے کہ اب تو میں نے توبہ کر لی ہے۔ جب جلد تیار ہو گئی اُس شخص نے پوچھا کہ کچھ اِصلاح تو نہیں دی کہنے لگے کہ توبہ توبہ میں کیا اصلاح دیتا مگر دو تین جگہ تو صریح غلطی تھی اُس کو صحیح کر دیا۔ ایک جگہ تو یہ تھا عَصٰی اٰدَمُ تو یہ صریح غلطی ہے عصا تو موسیٰؑ کا تھا میں نے اُس جگہ بجائے آدمؑ کے موسیٰؑ بنا دیا ہے۔ اور ایک مقام پر خَرَّ مُوْسٰی تو خر عیسیٰؑ کا تھا وہاں عیسیٰؑ بنا دیا ہے۔ اور ایک جگہ وَلَقَدْ نَادٰنَا نُوْحٌ (تحقیق پکارا ہم کو نوح نے) تھا تو نوحؑ تو دانا تھے میں نے وہاں نا کاٹ کر اس طرح کر دیا ہے وَلَقَدْ دَانَا نُوْحٌ اور ایک مشترک اور عام غلطی تھی وہ یہ کہ جگہ جگہ فرعون۔ قارون۔ ہامان ابلیس کا نام تھا تو ایسے کفار ملعونوں کا قرآن میں کیا کام وہاں میں نے اپنا اور تمہارا نام لکھ دیا۔ کہا خدا تیرا ناس کرے تو نے میرا قرآن شریف ہی کھو دیا۔ تو وہ مصلح صاحب اسی مذاق کے ہوں گے واللہ یہ لوگ بالکل ہی برباد ہوتے خدا کی قسم ہے کہ قرآن کا یہ مدلول ہرگز نہیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزہ نماز سب اُڑ گیا اس لئے کہ تمام نصوص کے مدلولات کو بلکہ تمام شریعت کو ان لوگوں نے بدل دیا۔ میرے ایک دوست رئیس پیران کلیر گئے تھے ایک طرف سے آواز آئی ابے او مرغے انھوں نے کچھ التفات نہ کیا پھر آواز آئی انھوں نے اس طرف دیکھا تو کہا ابے تجھ کو ہی بلاتے ہیں یہاں آ یہ گئے کہ دیکھیں کیا کہتے ہیں کہنے لگے کہ دیکھ اللہ تعالیٰ نے جب روحوں کو پیدا کیا تو سب کو جمع کر کے حکم دیا کہ بنگ بوزہ مت چھوڑنا تو ہم تو قریب تھے ہم نے صحیح سُنا اور مولوی لوگ دور تھے

سے موسیٰ علیہ السلام مراد ہے

انھوں نے بجائے بانگ بوزہ کے نماز روزہ سن لیا جاوئے یہ نکتہ ہی مرشدوں کا یاد رکھو تو ان تفسیروں کی بدولت یہاں تک نوبت پہونچ گئی ہے ایسے صوفیوں نے ناس کیا ہے دین کا خود بھی تباہ ہوئے اوروں کو بھی تباہ کیا سو یہ تو محض لغو وخرافات ہیں لیکن اس وقت کلام ہے صوفیہ محققین کی تاویلات واشارات میں سو اس میں بعضے تو ان کے ہی منکر ہوگئے اور بعضے مفسرین کے منکر ہوگئے اب رہ گئے ہم بیچ میں کہ ہم قرآن کو کلام اللہ اور صوفیہ کو اہل اللہ جانتے ہیں تو دونوں کی اہانت وحفاظت کے لئے ضرور ہوا کہ ان تاویلات کو ایسے معانی پر محمول کیا جاوے کہ کلام اللہ کی بھی تحریف نہو اور اہل اللہ کا کلام بھی خلاف قواعد شرعیہ نہ ہو اس لئے ہم کہتے ہیں کہ صوفیہ کرام نے جو آیات کے معنی بیان کئے ہیں یہ فی الواقع تفسیر نہیں ہے اور نہ وہ حضرات مدلول ظاہری کے منکر ہیں اُن کی یہ مراد ہرگز نہیں کہ قرآن میں فرعون سے نفس اور موسیٰ سے روح اور بقرۃ سے نفس مراد ہے جو کچھ وہ فرمارہے ہیں یہ علم اعتبار کہلاتا ہے اور علم اعتبار یہ ہے کہ دوسرے کے حال پر اپنے حال کو قیاس کیا جاوے تو مطلب یہ ہے کہ فرعون و موسیٰ کے قصہ پر اپنے حال کو بھی قیاس کرو اس کی ایسی مثال ہے جیسے زید نے ایک کام عمرو کی دیکھا دیکھی کیا اور اُس میں اس کو ناکامی ہوئی تو اُس موقع پر کہتے ہیں کہ کوّا چلا تھا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا تو اس کلام میں کوّے سے مراد زید اور ہنس سے مراد عمرو یقیناً نہیں ہے کوّے سے کوّا مراد ہے اور ہنس سے ہنس ہی مراد ہے اور حاصل اس کا یہ ہے کہ دو موقع ایک حالت کے اندر متطابق ہیں ایک موقع پر جو نظر پڑی تو دوسرا موقع اس کو دیکھ کر یاد آگیا اور ایک کو دوسرے کے ساتھ تشبیہ دیدی مثلاً یہاں زید وعمر اور اُن کے قصّے کو کوّے اور ہنس اور اُن کے قصّہ سے تشبیہ دیدی پس

اِذْهَبْ اَيُّهَا الشَّيْخُ الخ (اے روح جاتو) سے یہ مراد ہے کہ اے قاری جب تو قرآن پڑھے اور یہاں پہونچے تو اِس قصّہ سے یہ سبق لو کہ تمہارے اندر بھی ایک چیز فرعون کی مشابہ اور ایک چیز موسیٰ کے مشابہ ہے قصہ کو قصہ ہی کے طور پر مت پڑھو بلکہ قرآن شریف کے ہر ہر موقع سے اپنی حالت پر مطابق کرتے جاؤ اور اس سے نصیحت اور عبرت حاصل کرتے جاؤ یہ مطلب ہے صوفیہ کرام کا پس دونوں فرقے غلطی پر ہیں جو ان تاویلات کا بالکل انکار کرتے ہیں وہ بھی غلطی پر ہیں اور جو ان کو تفسیر مدلول قرآنی قرار دیتے ہیں وہ تو بالکل گئے گذرے ہیں یہ تاویلات لطائف اور نکات کے درجہ میں ہیں تفسیر نہیں ہیں اور ان کو علوم قرآنیہ نہیں کہہ سکتے علوم قرآنیہ وہ ہی ہیں جس پر عبارۃ النص یا اشارۃ النص یا اقتضاء النص یا دلالۃ النص سے استدلال ہوسکے ورنہ وہ نکات و لطائف کا درجہ ہے جیسے کسی شخص نے آیۃ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا (اور قیامت کے دن سب کے سب اس کے پاس تنہا تنہا حاضر ہوں گے) کے متعلق کہا تھا کہ قیامت آئندہ آنے والی ہے اِس لئے قرآن مجید میں فردًا کہا گیا فردًا کہتے ہیں کل کے دن کو یہ ایک نکتہ ہے ورنہ فردًا بمعنیٰ کل فارسی ہے اور آیت میں فردًا سے مراد متفردًا متوحدًا ہے (تنہا) اہل لطائف نے کہیں کہیں ایسے نکتوں سے کام لیا ہے گو شرعًا بعض جگہ پسندیدہ نہیں ہے جیسے ایک جولاہا تھا اُس نے دو چار سورتیں پڑھ لی تھیں مگر ماں کا حق ادا نہ کرتا تھا اُس کی ماں اُس کو لیکر ایک بزرگ کی خدمت میں آئی کہ دیکھئے حضرت یہ میرا حق ادا نہیں کرتا اُن بزرگ نے فرمایا کہ بھائی تم ماں کا حق کیوں نہیں ادا کرتے کہا کہ حضرت قرآن میں تو ماں کا حق ہی نہیں آیا اُن بزرگ نے پوچھا کہ تو نے کچھ قرآن پڑھا ہے کہنے لگا جی ہاں اَلَمْ تَرَ كَيْفَ تک یاد ہے اُن بزرگ نے فرمایا کہ تَبَّتْ تو پڑھو اُس نے پڑھی جب مَا اَغْنٰى عَنْهُ

مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ (اُس کا مال اور اس کی کمائی اس کے کام نہ آئی) پر پہونچا تو فرمایا کہ دیکھ تو کہتا ہے کہ ماں کا کچھ حق نہیں قرآن میں تو یہ ہے کہ ما کاسب یعنی ماں کا سب ہے وہ مان گیا اور اسی دن سے عہد کیا کہ ماں کی خدمت کیا کروں گا۔ اِس لطیفہ سے یہ تو فائدہ ہوا کہ وہ ماں کا حق ادا کرنے لگا لیکن ضرر بھی ہوا کہ ساری عمر اِسی جہل میں مبتلا رہے گا ایسے ہی ایک شخص ایک مولوی صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ مولوی صاحب تم کہتے ہو کہ قرآن میں سب چیزوں کا ذکر ہے یہ تو بتلاؤ کہ قرآن میں باؤ مرہٹہ کا بھی ذکر ہے مولوی صاحب نے کہا ہاں ہے اور مذمّت کے ساتھ ذکر ہے وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے ساتھ لوٹے) کہ باؤ اللہ کے غضب میں ہے یہ نکات ہیں بلکہ نکات بھی اُن کو نہیں کہہ سکتے اِس لئے کہ نکتہ وہ ہے کہ جس سے تفسیر نہ بدلے یہاں تو تفسیر ہی بدل جاتی ہے لطائف اور نکات بھی وہ ہی مقبول ہیں کہ انطباق بھی ہو جائے اور تفسیر نہ بدلے اِس واسطے میں اِن دونوں قصّوں کے جواب کو ناپسند کرتا ہوں۔ پس اِس تمام تر تقریر سے معلوم ہو گیا کہ نہ تو شیخ اکبر اور دیگر صوفیہ قدس اسرارہم پر کچھ اعتراض ہو سکتا ہے اور مفسرین نے جو تفسیر اور مدلول قرآنی بیان کیا ہے نہ اس میں کچھ شبہ ہے ہاں اعتراض اہلِ غلو پر ہے جو اُن کا یا اِن کا انکار کرتے ہیں خواہ وہ اہلِ غلو برنگ جہلاء ہوں یا بہیئت علماء ہوں۔ یہ مفصل گفتگو تھی بعض اشارات و لطائف قرآنیہ کے متعلق جو جملہ معترضہ کے طور پر آ گئی۔ اب مضمون مقصود کی طرف عود کرتا ہوں کہ قرآن نے ہم کو اس مقام پر مسائل تمدن میں سے ایک مفید مسئلہ اتفاق کی بھی تعلیم بھی فرمائی پس وہ اس وجہ سے شریعت میں مامور بہ ہے اور دنیا دین دونوں حیثیتوں سے ضروری ہے اور اصلاح دین بھی اِس سے

ہوتی ہے اور اصلاحِ دنیا بھی جو لوگ دیندار ہیں اُن کی نظر تو اس کے منافع دین پر ہے اور جو دنیا دار ہیں اُن کی نظر اس کے منافع دنیا پر ہے خصوص ہمارے زمانہ کے ترقی خواہ بھائیوں کے نزدیک تو بڑا قبلہ وکعبہ دنیا ہی ہے حتیٰ کہ اُن کے نزدیک تو خالص دینی کام میں بھی دنیا ہی کی مصلحت پیشِ نظر رہتی ہے اور اس کی وقعت اسی مصلحت دنیوی کے سبب ہوتی ہے اور یہ مذاق اہلِ یورپ سے ماخوذ ہے چنانچہ ایک جرمنی ڈاکٹر نے نماز کے منافع لکھے ہیں کہ نماز ایسی اچھی ورزش ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے کسی ورزش کی ضرورت نہیں اور صحت خوب قائم رہتی ہے اُس بھلے مانس نے نماز کو اتنا ہی سمجھا آگے ذہن ہی نہیں گیا جیسے کسی مولوی صاحب نے ایک گنوار کو نصیحت کی کہ نماز پڑھا کر کہا بہت اچھا چند روز کے بعد مولوی صاحب سے کہا کہ مولوی جی نواج (نماز) بہت بھائدے (فائدے) کی تیج (چیز) ہے مجھے بائی (ریاح) کی بیماری تھی جب مونڈھا (اوندھا) پڑوں جب ہی باوی لکڑی (نکلتی ہے) جیسے اُس گدھے نے نماز کا یہی فائدہ سمجھا تھا ایسے ہی اس جرمنی محقق نے نماز کا فائدہ اتنا ہی سمجھا مگر ہمارے ترقی یافتہ بھائی ایسی باتوں سے خوش ہوتے ہیں اور ریجھے جاتے ہیں اور اگر کوئی ہم سے پوچھے تو ہم تو یہ کہیں گے کہ اس جرمنی کی اس تحقیق کی ایسی مثال ہے جیسے کسی کے پاس پانچسو روپیہ کا دوشالہ ہو اور وہ اس کے منافع یہ بیان کرے کہ یہ دوشالہ بہت اچھی شے ہے سفر میں اگر کہیں سوختہ نہ ملے تو اس کو جلا کر چاء پکا سکتے ہیں تو فی نفسہ یہ صحیح ہے کہ چاء اس سے پک سکتی ہے لیکن کیا اس شخص کو یہ نہ کہا جاوے گا کہ اِس نے اِس دوشالہ کی قدر نہیں جانی۔ نماز کے فائدے ہم سے پوچھو اور ہم سے کیا ہم کیا چیز ہیں حق تعالےٰ سے پوچھو اور ہم سی

(باقی آئندہ اِنشاءاللہ تعالی)

پوچھو میں نے اس لئے کہہ دیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ درحقیقت حق تعالےٰ کا کہا ہوا ہے ہماری تو وہ مثال ہے ؎

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — انچہ استاد ازل گفت بگومی گویم

(آئینہ کے پیچھے مجھے طوطی کی طرح رکھا ہے جو کچھ استاد ازل نے کہا تھا وہی میں کہہ رہا ہوں)

سو نماز کا فائدہ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ یعنی سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ پس نماز کا اصلی مقصود قرب ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

قرب تر لیستی بہ بالا رفتن است — بلکہ قرب از قید ہستی رستن است

یعنی قرب اس کا نام نہیں ہے کہ نیچے سے اوپر کو چلے جاؤ بلکہ قرب یہ ہے کہ قید ہستی سے چھوٹ جاؤ اس لئے کہ اوپر جانا قرب جب ہوتا ہے کہ خدا تعالےٰ کا مکان اوپر ہوتا خدا تعالیٰ مکان سے پاک ہے پس اس کا قرب یہی ہے کہ اپنی ہستی کو خاک میں ملا دو اسی کو وصل کہتے ہیں بعض لوگ وصل کے خدا جانے کیا کیا معنی سمجھتے ہیں وصل کے معنی اہل فن سے پوچھئے شیخ شیرازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

تعلق حجاب ست و بے حاصلی — چو پیوندھا بگسلی واصلی

(تعلقات غیر اللہ حجاب اور لاحاصل ہیں جب ان تعلقات کو قطع کر لو گے تو تم واصل ہو گئے)

یعنی غیر کے ساتھ کے علاقے جب قطع کر دو گے واصل ہو جاؤ گے یہی تعلق حجاب ہے پس سجدہ کی غرض اپنی ہستی و تعلق کو مٹانا اور ہستی کا مٹانا یہ نہیں ہے کہ سنکھیا کھا کر مر رہو مطلب یہ ہے کہ دعویٰ اور انانیت دماغ سے نکالو یہ سجدہ اس کا سامان ہے اس لئے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور پھر تمام اعضاء انسان کے اندر اشرف چہرہ ہے اسی واسطے چہرہ پر مارنا حرام ہے حکم ہے کہ مجرم کے بھی چہرہ پر مت مارو قتل کرنا جائز اور چہرہ پر مارنا ناجائز اس لئے کہ چہرہ معظم ہے تو ایسے شریف عضو کو حکم ہے کہ اَرذلُ الاشیاء (تمام چیزوں سے زیادہ رذیل) کے ساتھ ملصق کر دو یعنی

زمین کے ساتھ جو بہت سے وجوہ سے اور نیز باعتبار جیز کے پست ترین مخلوق ہے تو یہ کاہے کی تعلیم ہے اسی کی تعلیم ہے کہ اپنے کو مٹا دو اور ہستی کو کھو دو کہ یہ تمہاری ہستی تمہارا حجاب بن رہی ہے۔ حافظ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

میاں عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست　　تو خود حجاب خودی حافظ از میاں برخیز

(عاشق و معشوق کے درمیان کوئی حائل نہیں تیری خودی خود حجاب ہو رہی ہے حافظ خودی کو درمیان سے اٹھا۔)

پس نماز کی یہ حکمت ہے مگر جرمنی صاحب نے چونکہ ورزش اس کی حکمت بیان کی ہے تو ہمارے بھائی اس تحقیق پر (برغبت) غش ہیں یاد رکھو شارع نے یہ حکمت نماز کی کہیں نہیں بیان کی اور جو چیز شریعت میں نہیں ہے وہ سب ہیچ ہے گو اس جرمنی کی زبان سے اتنا نکلنا بھی غنیمت ہے۔ لیکن اے بھائیو تم کو کیا ہو گیا کہ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (سجدہ کرو اور اللہ کے قریب ہو جاؤ) کے
۲ ہوتے ہوئے ایک جرمنی کا فر کی تحقیقات کو پسند ہی نہیں بلکہ اس پر ناز کرتے ہو کیوں خواہ مخواہ گداگری کرتے ہو تمہارے یہاں سب کچھ ہے آپ لوگوں کی وہ مثال ہے جیسے مولانا فرماتے ہیں ؎

یک سبد پُر نان ترا بر فرق سر　　تو ہمی جوئی لب نان در بدر
تا بزانوئے میان قعر آب　　وز عطش وز جوع گشتی خراب

(تیرے سر پر روٹیوں کا ایک ٹوکرا موجود ہے تو ایک ٹکڑے روٹی کے لئے دربدر مارا پھرتا ہے تو زانو تک نہر میں کھڑا ہوا ہے اور پیاس اور بھوک سے خراب ہو رہا ہے۔)

اے صاحبو آپ کے یہاں ساری دولتیں موجود ہیں کیوں فقیروں سے مانگتے ہو کیوں جرمنیوں کی کاسہ لیسی کرتے ہو۔ الحاصل اتفاق بھی ایسی ہی شے ہے کہ اہلِ یورپ کو للدنیا (دنیا کیلئے) مطلوب ہے اور ہم کو للدین (دین کیلئے) مطلوب ہے مگر اس کا ایک ضروری مسئلہ متفق علیہا ہونا تو ثابت ہوا اب اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں سے اس مسئلہ کے متعلق کیا تحقیق

ہے اس کے لئے ایک چھوٹی سی تمہید کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ساری دُنیا اِتفاق اِتفاق پکار رہی ہے مگر اس کے جو اسباب ہیں ان سے بالکل ناواقفیت ہے بالکل اِس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص چھت پر جانا چاہتا ہے مگر زینہ سے نہیں جاتا اُوچک کر جانا چاہتا ہے اور ایک جست لگاتا ہے اور گر پڑتا ہے اِسی طرح پھر جست لگاتا ہے اور پھر گرتا ہے تو یہ شخص چھت پر کیوں نہیں پہنچا اِس لئے کہ جو طریق ہے جانے کا اُس سے نہیں گیا اُس نے اس پر عمل نہیں کیا ؎

اُطْلُبُوا الْاَرْزَاقَ مِنْ اَسْبَابِهَا　　وَادْخُلُوا الْاَبْيَاتَ مِنْ اَبْوَابِهَا

(روزی کو اس کے اسباب سے طلب کرو اور گھروں میں دروازوں سے داخل ہو)

اِس واسطے شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی کہ مطلقاً اسباب چھوڑ دو بلکہ اس کا حکم کیا ہے کہ جس شے کے جو اسباب پیدا کئے گئے ہیں اُس کو
اُن ہی سے طلب کرو اس پر بعضے لوگ خوش ہوئے ہوں گے کہ اس سے ۲
تو وہی بات ثابت ہوئی جو اہلِ دنیا کا مطلب ہے یعنی تدبیر پرستی چنانچہ اسی بنا پر لوگ اہل اللہ پر ہنستے ہیں اور اُن کو اجاریوں کی پلٹن اور گرانی کا سبب اور قوم پر بار قرار دیتے ہیں ایک شخص بزعم خود مفسر قرآن ہیں اور لوگ اُن کے ترجمہ پر فریفتہ ہیں اِس لئے کہ محاورہ کے موافق ہے صاحبو! محاورہ کے موافق تو ہے لیکن قرآن کے موافق نہیں ہے ایسے ہی محاورہ کا شوق ہے تو چہار درویش اور حاتم طائی کی عبارت بہت ہی بامحاورہ ہے اور اگر یہ کہا جاوے کہ وہ تو قرآن نہیں ہے میں کہتا ہوں کہ وہ ترجمہ بھی بہت مقامات میں قرآن نہیں اس لئے کہ ایسے ایسے مسائل نکالے ہیں کہ وہ قرآن کا مدلول نہیں ہے چنانچہ آیت وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بغیر حق جائز کے مت کھاؤ) کی تفسیر میں حاشیہ پر لکھا ہے کہ یہ جو بعض لوگ دنیا کے

تمام دھندے چھوڑ چھاڑ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہتے ہیں اُن کو کیا حق
حاصل ہے کہ قوم کی آمدنی کھائیں جب کچھ حق نہیں تو باطل ہی اور باطل
ہے تو اس آیت سے حرام ہے لوگ استدلال پر فریفتہ ہیں مرے جاتے
ہیں میں اس استدلال کی حقیقت کھولتا ہوں کہ یہ جو باطل جس کا ترجمہ
ناحق ہے اس ناحق میں جو حق ہے اس سے کیا مراد ہے حق واجب یا
جائز اگر حق واجب مراد ہے تو ہم مفسّر صاحب سے پوچھتے ہیں کہ تم کو
کیا حق حاصل ہے کہ ایک کتاب تصنیف کر دی اور سرکار سے ہزار روپیہ
انعام کے لے لئے کیا سرکار پر یہ حق واجب ہے اور ان مفسّر صاحب
کو کوئی ہدیۃً روپیہ دے تو اُس کے قبول کرنے کا ان کو کیا حق حاصل ہے
خوب یاد رکھو کہ اس ناحق میں حق سے مراد حق جائز ہے پس ترجمہ آیت
کا یہ ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا مال بدون حق جائز کے مت
کھاؤ پس جس شے کا لینا جائز نہو وہ مت کھاؤ اور اگر محبت سے کوئی کچھ دے تو یہ ناجائز نہیں مفسّر صاحب ۴
نے حق سے مراد حق واجب لیکر اپنے اوپر بھی سینکڑوں اعتراض لے لئے
غرض یہ حضرات اہل توکل کی تحقیر اسی اسباب پر کرتے ہیں تو شاید
میرے اس کہنے سے کہ اسباب سے مسببات کو حاصل کرو ان معترضین
کو اپنی تائید کا شبہ ہوا ہو گا خوب سمجھ لو کہ ترک اسباب میں تفصیل ہے
جو عنقریب آتی ہے اُس کے نہ جاننے ہی سے یہ شبہ پیدا ہوا کہ متوکلین
نے پھر اسباب کو کیوں چھوڑا جبکہ تم کہتے ہو کہ شریعت نے ترک اسباب
کی اجازت نہیں دی سو خوب سمجھ لو کہ یہ اعتراض ناتمام علم سے پیدا
ہوا ہے جیسے ایک حکیم جی تھے اُن کے ایک صاحبزادہ بھی تھے مگر تھے
عقل کے کورے اُن کو حکیم صاحب نے طب پڑھائی اور مطب میں بھی
وہ ساتھ رہتے تھے حکیم جی ایک مریض کو دیکھنے گئے نبض دیکھ کر کہا کہ
معلوم ہوتا ہے کہ تم نے نارنگی کھائی ہے جس سے تمہاری حالت کل کے

اعتبار سے بگڑی ہوئی ہے مریض نے اقرار کیا صاحبزادہ صاحب کو حیرت
ہوئی کہ ابّا جان نے یہ کیسے پہچانا کہ نارنگی کھائی ہے جب وہاں سے آئے
تو پوچھا حکیم صاحب نے کہا کہ بھائی قرائن اور علامات اور نبض سے
اتنا تو معلوم ہو گیا تھا کہ کسی بارد شے کا استعمال کیا ہے چارپائی کے
نیچے نارنگی کے چھلکے پڑے تھے اس سے اس کی تعیین بھی ہو گئی - اب
صاحبزادہ صاحب کو ایک قاعدہ ہاتھ آگیا کہ جو چیز چارپائی کے نیچے
پڑی ہوئی ہوتی ہے مریض اسی کو کھا کر بیمار ہو جاتا ہے بڑے حکیم نے تو
رحلت فرمائی اب چھوٹے حکیم جی کا دور دورہ ہوا ایک مریض کی شامت
آئی اُن کو بلایا اُس کو دیکھنے گئے نبض دیکھی چارپائی کے نیچے جھانکے
وہاں نمدہ پڑا ہوا تھا کہنے لگے کہ ہم کو معلوم ہو گیا کہ تمہاری جو یہ حالت
ہے اُس کا ایک خاص سبب ہے وہ یہ کہ تم نے نمدہ کھایا ہے سب
لوگ ہنس پڑے کہ نمدہ بھی کوئی کھایا کرتا ہے اور حکیم جی کو نکلوا دیا ۵
سچ ہے نیم مُلّا خطرۂ ایمان نیم حکیم خطرۂ جان - بس ایسے ہی ہمارے معترضین
ہیں کہ جب سنا کہ شریعت نے ترکِ اسباب سے منع کیا ہے علم تو تھا
نہیں تمام اسباب کو اس میں داخل کر کے متوکلین اور تارکین اسباب
پر ایک اعتراض جڑ دیا خوب سمجھ لو کہ اسباب کی تین قسمیں ہیں اسباب
قطعیہ ظنیہ وہمیہ سبب قطعی کسی شے کا تو وہ ہے کہ عادۃً وہ اُس شے کا
موقوف علیہ ہے اگر وہ سبب نہ ہو تو اُس شے کا تحقیق بھی نہ ہو جیسے کھانا
کھانا پیٹ بھرنے کے لئے پانی پینا سیرابی کے واسطے سو رہنا آرام کے
واسطے اِن اسباب کو چھوڑنا تو حرام ہے اگر کوئی چھوڑ دے اور اسی
میں مر رہے تو حرام موت مرے گا حتیٰ کہ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ اہلِ توکل
بھی خلوت میں ایسی جگہ نہ بیٹھے جہاں کسی کا نہ گذر ہو اور نہ کسی کو اس
کے حال کی اطلاع ہو دوسرے اسباب وہمیہ ہیں وہ یہ ہیں کہ مسبب کے

اُن پر مرتب ہونے کا بہت بعید احتمال ہو جیسے کوئی خیالات پکا دے کہ میں
تحصیلدار ہو جاؤں گا پھر ڈپٹی کلکٹر ہوں گا بہت سی میری اولاد ہو جائیگی
جب زیادہ مال ہوگا تمام ضلع مظفر نگر کو خریدوں گا غرض جہاں جہاں
تک ذہن پہنچایا اسی طرح تجارت میں بعید بعید صورتیں سوچے اور اُن
کے اسباب میں مشغول ہو ایسے اسباب وہمیہ واجب الترک ہیں اس کو
دنیا کے اندر کھپ جانا کہتے ہیں. تیسرے اسباب ظنیہ ہیں کہ مسبب ان پر
غالباً مرتب ہو جاتا ہے اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی وہ مسبب حاصل
ہو جاتا ہے جیسے تجارت ہے۔ ضرورت کے موافق روپیہ ملنا زراعت سے
غلہ حاصل ہونا کہ مسبب ان پر اکثر تو مرتب ہوتا ہے اور کبھی نہیں بھی ہوتا
اور کبھی بلا ان اسباب کے بھی مسبب حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ ہم مشاہدہ
کرتے ہیں کہ جو لوگ ان اسباب میں مشغول نہیں ہیں ان کو بھی یہ چیزیں
ملتی ہیں پس ان اسباب ظنیہ کے ترک کو اصطلاح میں توکل کہتے ہیں اور ۶
اِس میں تفصیل یہ ہے کہ ضعیف النفس کے لئے جائز نہیں اور قوی النفس
کے لئے جائز بلکہ مستحسن و مستحب ہے لیکن اِس نیت سے توکل جائز نہیں کہ
یہ بھی ایک طریق ہے روپیہ ملنے کا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ
مولوی صاحب سے وعظ میں سُن لیا کہ جو خدا تعالےٰ پر توکل کرے
اللہ تعالےٰ اس کو ضرور رزق پہونچاتے ہیں اور یہ بھی اُس نے سُنا تھا کہ
ایسی جگہ بیٹھنا جائز نہیں جہاں کسی کا گذر نہ ہو جنگل میں جا کر ایک کنوے
کے قریب آپ جا بیٹھے اور منتظر رہے کہ اب میرے واسطے خوان لگ کر
آوے گا چنانچہ دو تین روز گذر گئے اتفاق سے اُدھر سے کسی کا گذر بھی
نہ ہوا کئی روز کے بعد ایک مسافر آیا سمجھا کہ مجھے بھی کچھ دیگا اُس مسافر
نے اُس کی طرف تو پشت کی اور (حسب عادت) راستہ کی طرف منہ
کیا کہ آتے جاتے کو دیکھیں گے اور روٹی کھا کر چلا گیا اِس کی اُس کو

بھی نہ ہوئی اِسی طرح ایک اور آیا وہ بھی اِسی طرح بیٹھ کر اور کھا کر چلا گیا
اُس نے اپنے جی میں کہا کہ یہ تو بڑی رسم نکلی ہے تیسرا آیا تو آپ فرماتے
ہیں اھون اھون (صورت ہے جو حکایت ہے کھنکارنے کی) اُس نے
جو مڑ کر دیکھا کہ ایک آدمی فاقہ سے ضعیف نحیف ہو کر پڑا ہے اُس کو
رحم آیا اُس نے بلا کر اُس کو روٹی کھلائی خوش خوش مولوی صاحب
کے پاس گئے اور کہنے لگے کہ مولوی صاحب توکل برحق مگر آپ نے تعلیم
میں کسر رکھی اتنی بات رکھ لی یہ نہ کہا کہ کھنکارنا بھی پڑتا ہے۔ تو بعضے
آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر اس لئے بھی بیٹھ جاتے ہیں کہ میاں بے فکری سے
کھانے کو ملے گا چین سے رہیں گے کچھ کرنا نہ پڑیگا تو کوئی قابل قدر نہیں
خدا تعالیٰ کے نزدیک بھی اس کی کوئی قدر نہیں کمال نہیں حضرت سلطان
ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی حکایت لکھی ہے کہ جب بلخ کی
سلطنت چھوڑ کر نکلے ہیں تو اوّل ہی دن ایک جنگل میں پہونچے وہاں شام ۷
ہوگئی ایک مقام پر لیٹ رہے بھوکے پیاسے تھے اور قریب ہی ایک
اور درویش بھی رہتا تھا شب کے وقت اُن کے واسطے غیب سے ایک
خوان آیا کہ کھانوں کی خوشبو سے تمام جنگل مہک اُٹھا اور اُس درویش
کے واسطے دو روٹی جَو کی آیا کرتی تھیں حسبِ معمول وہی آئی وہ درویش یہ
دیکھ کر جل گیا اور حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ مجھے تو یہاں پڑے
ہوئے اتنے سال ہوگئے میرے واسطے تو یہی جَو کی روٹی ہے آج تک ترقی
نہوئی اور یہ آج ہی آیا اس کے واسطے ایسے کھانے بھیجے ہاتف کے ذریعہ
سے ندا آئی کہ یاد کر تو کون تھا اور اس کو دیکھ یہ کون ہے تو ایک گھس کھدا
تھا اِس قابل بھی نہ تھا پہلے صبح سے شام تک مصیبت بھرتا تھا اب بلا مشقت
اُس سے زیادہ ملتا ہے غنیمت نہیں سمجھتا اگر پسند نہیں فلاں درخت کے
نیچے تیرا کھرپہ جالی رکھا ہے نکل اور گھاس کھودنا شروع کر غرض توکل

میں تو نے کون کمال کیا کمال تو اُس شخص کا ہے کہ سلطنت اور حشم خدم کو ہمارے واسطے اس نے چھوڑ دیا بہر حال اگر تجھ کو سیدھی ہی طرح کھانا ہی کھا ورنہ کھر یہ جالی تیرا رکھا ہے جیا او ر سنبھال سنکر لرز گیا اور بہت تو بہ استغفار کی پس روٹیوں کے واسطے گوشہ اختیار کرنا توکل نہیں شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

نان از برائے کنج عبادت گرفتہ اند ۔۔۔ صاحبدلان نہ کنج عبادت برائے نان

(روٹی اہل اللہ نے گوشہ عبادت کے لئے لی ہے نہ گوشہ عبادت روٹی کے لئے پکڑا ہے ۱۲)

یعنی روٹی اس واسطے لیتے ہیں کہ اللہ اللہ کریں نہ کہ اللہ اللہ اس لئے کریں کہ روٹی ملے یہ خداع اور مکاری ہے کہ جس کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

گہہ گہے آہے دروغے میزنی ۔۔۔ از برائے مسکہ دوغے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ۔۔۔ در غلط اندازی تا ہر خاص وعام
کارہا با خلق آری جملہ راست ۔۔۔ با خدا تزویر وحیلہ کے رواست
کارہا او راست باید داشتن ۔۔۔ رایت اخلاص وصدق افراشتن

(تو کبھی کبھی جھوٹی آہ کھینچتا ہے گویا مکھن حاصل کرنے کے لئے چھاچھ بلوتا ہے۔ میں نے فرض کیا اگر تو نے ساری مخلوق کو دھوکہ دے ہی دیا مگر خدا تعالےٰ کو کہاں دھوکہ دے سکتا ہے مخلوق کے ساتھ تیرے سب کام درست ہیں خداوند تعالےٰ کے ساتھ مکر وحیلہ کب جائز ہے خدا تعالےٰ کے ساتھ سب کام درست رکھنا چاہئیں اور اخلاص اور سچائی کا علم بلند کرنا چاہیے ۱۲)

خلاصہ یہ ہے کہ جس ترک اسباب کی شریعت میں ممانعت ہے وہ اسباب قطعیہ ہیں اُن کا چھوڑنا حرام ہے اور اسباب وہمیہ کا ترک خود مامور بہ ہے۔ اور اسباب ظنیہ میں یہ تفصیل ہے جو ابھی عرض کی گئی۔ اور یہ سب تفصیل مسببات دنیویہ کے متعلق ہے اور جو مسببات دینیہ ہیں چونکہ وہ مطلقاً

محمود ومطلوب ہیں اُن کے اسباب ہر درجے میں محمود ہوں گے بشرطیکہ کسی ضروری امر میں خلل نہ ہو پس اتفاق جو ایک شے ہے اس کے لئے بھی کوئی سبب ضرور ہے اور چونکہ وہ محمود ہے اس کے اسباب بھی قابلِ اہتمام ہوں گے سو اُس سبب کی ہمارے عقلاء نے تحقیق نہیں کی بلکہ جو اس کے اسباب نہیں ہیں ان کو سبب قرار دیا اسی لئے اتفاق متحقق نہیں ہوتا پس یہ امر مبحوث فیہ اور قابل تفحص ہوا کہ سبب اتفاق کا کیا ہے تاکہ اس کو اختیار کرنے سے اتفاق پیدا ہو سو اس کی تفحص میں ہم کو بفضلہ تعالیٰ دریوزہ گری کی ضرورت نہیں ہمارے پاس تو قرآن ہے اس میں اس کے متعلق ارشاد ہے هُوَ الَّذِیْٓ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ اِنَّهٗ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ

9 یعنی خدا تعالیٰ کی وہ شان ہے اے محمد صلے اللہ علیہ وسلم کہ اس نے اپنی مدد اور مومنین کے ساتھ آپ کو قوت دی اور ان کے دلوں میں باہم اُلفت ڈال دی اگر آپ روئے زمین کا تمام مال خرچ کر لیتے تو آپ ان کے قلوب میں اُلفت نہ ڈال سکتے لیکن اللہ ہی نے اُن کے درمیان اُلفت ڈال دی بیشک اللہ غالب حکمت والا ہے۔ دیکھئے جہاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم جیسے مدبّر عاقل حکیم دور اندیش ہوں کہ جن کی عقل کے کامل ہونے پر تمام جہان کا اتفاق اور نادبیریہ کہ تمام روئے زمین کے خزانے اتفاق کے لئے خرچ کریں اور نتیجہ کیا ہی مَاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ (آپ ان کے دلوں میں باہم اُلفت نہ ڈال سکتے) اس سے کیا پتہ لگتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسباب ظاہرہ جیسے کوئی فنڈ اسلامی بنانا لکچر دینا۔ رسالوں میں مضامین اتفاق کے شائع کرنا اس سے اتفاق پیدا نہیں ہوتا وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (لیکن اللہ ہی نے ان کے درمیان اُلفت ڈال دی) سے معلوم ہوتا ہے کہ مدار اتفاق کا یہ ہے کہ خدا تعالیٰ دلوں میں اُلفت

پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ مجھ کو چاہیں میں آپ کو چاہوں ہر ایک دوسرے کے نزدیک محبوب ہو۔ اب یہ بات رہی کہ وہ اُلفت اور محبت خدا تعالیٰ کس طرح سے پیدا کر دیتے ہیں اس کا سبب کیا ہے۔ یہ بھی حق تعالیٰ ہی سے پوچھو۔ چنانچہ اس محبت پیدا کرنے کے واسطے اس آیت میں ارشاد فرمایا ہے جو میں نے اوّل تلاوت کی ہے اور تبرکاً و تذکیراً پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا یعنی ایمان اور عمل صالح سے حق تعالیٰ ان لوگوں کی محبّت بمعنی محبوبیت پیدا کر دیتے ہیں اب اہلِ علم کی سمجھ میں آیا ہوگا کہ میں نے وُدّ کو مصدر مبنی للمفعول مجہول کیوں لیا۔ حاصل آیت کا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان اور عمل صالح کی یہ خاصیت بیان فرمائی ہے کہ اس کے اختیار کرنے والے قلوب میں محبوب ہو جاتے ہیں۔ پس جبکہ ایک جماعت کی جماعت ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے تو ان میں ایسا اتفاق پیدا ہوگا کہ ۱۰
کبھی نہ جائے گا لَا یَزَالُ وَلَمْ یَزَلْ (نہ زائل کیا جائے گا نہ زائل ہوگا) ہو جائے گا پس اصلی سبب اتفاق کا ایمان اور عمل صالح ٹھیرا۔ اب فرمایئے کہ دنیا میں کتنے عاقل ہیں جنھوں نے یہ راز سمجھا ہو۔ ہاں اِتفاق اِتفاق سب گاتے ہیں۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اتفاق کا نام بھی نہ لو مگر ایمان اور عمل صالح اختیار کر لیجئے اِتفاق آپ کی لونڈی ہے دست بستہ وہ آپ کے سامنے آ کر کھڑی ہو جائے گی آپ کو اس کی ضرورت نہیں کہ آپ لکچر دیں یا مضمون لکھیں اور پھر اتفاق بھی ایسا ہوگا کہ مرنے تک اور مرنے کے بعد جنّت میں بھی نہ جائے گا اور دعوے سے کہا جاتا ہے کہ یہ بھی ہے وہ محبت جو قائم رہنے والی ہے باقی محبتیں سب زائل ہونے والے ہیں۔ میں اِس کا نمونہ دکھلاتا ہوں۔ دیکھئے پیر سے جو محبت ہوتی ہے وہ کیسی ہوتی ہے کہ کبھی نہیں جاتی اگر کسی اَمرد سے محبت ہوگئی ہے تو وہ جب

ہی تک ہے جب تک اُس کے چہرے پر ڈاڑھی نہ آجاوے یا جُھریاں نہ پڑیں ؎

ایں از عشق است آنکہ در مردم بود ایں فساد از خوردن گندم بود
عشق با مردہ نباشد پائدار عشق را باحی و قیوم دار
عشق ہائے کز پئے رنگے بود عشق نبود عاقبت ننگے بود

(گندم کے فساد یعنی لوگوں میں جو عشق ہے وہ عشق نہیں مُردہ کے ساتھ عشق کو پائداری نہیں عشق حق تعالےٰ کا جو حی و قیوم ہیں اختیار کرو جو عشق رنگ و روپ پر ہوتا ہے وہ آخر کار ننگ و افسوس ہوتا ہے اس لئے خدائے حی و قیوم کا عشق اختیار کرو جو ہمیشہ باقی رہے گا۔)

عاشقی با مردگاں پائندہ نیست زانکہ مردہ سوئے ما آئندہ نیست

(یہ شخص جو مُردوں میں ہے گندم کھانے کے فساد سے ہے مردہ کے ساتھ عشق کو پائداری نہیں ہے)

اور پیر کے ساتھ جو عشق ہے اس کی کیفیت سُنئے کہ پیر صاحب پر تو روز بروز بڑھاپا آتا جاتا ہے اور ان کا ان پر عشق بڑھتا جاتا ہے ؎ ۱۱

خود قوی تر مے شود خمر کہن خاصہ آں خمرے کہ باشد من لدن

(پرانی شراب میں خود تیزی بڑھتی ہے خاص کر وہ شراب جو اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا ہوئی ہو)

آخر پیر میں کیا شے ہے کہ اس سے ایسی محبت ہو جاتی ہے کہ اگر وہ جان بھی مانگے اس سے بھی انکار نہیں۔ اس کا کیا سبب ہے ؟ اس کا سبب وہی ایمان اور عمل صالح ہے چونکہ اس ایمان اور عمل صالح سے یہ اعتقاد ہے کہ یہ حق تعالےٰ کا مقرب ہے اس لئے طبعًا اس کی محبت ہوتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات پیر اس سے ناخوش بھی ہوتا ہے مارتا بھی ہے کبھی کبھی نکال بھی دیتا ہے اور طرح طرح کی خدمتیں لیتا ہے مگر ان کی کیفیت یہ ہے کہ بچھے جاتے ہیں مرے جاتے ہیں۔ یہ نمونہ آنکھوں سے دیکھ لیجئے اب موجود ہے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے ایک مرید بیان کرتے تھے کہ حضرت ایک مرتبہ حرم میں تشریف رکھتے تھے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ

دوسرے کو مار رہا ہے۔ ہم لوگ سمجھتے تھے یہ کوئی نوکر ہے۔ حضرت نے فرمایا
کہ یہ پیر مرید ہیں اور فرمایا دیکھو پیر ایسے ہوتے ہیں۔ کبھی ہم نے بھی تم لوگوں
کو مارا ہے واقعی حضرت کو اس قدر رحمت اور شفقت تھی کہ کہیں نہ دیکھی
نہ سُنی ؎

ہم نے اُلفت کی نگاہیں دیکھیں جانیں کیا چشمِ غضبناک کو ہم

میں نے حضرت کو دیکھا ہے کہ اپنے مریدوں کے ساتھ وہ برتاؤ فرماتے تھے
جیسا کہ لوگ اپنے پیروں کے ساتھ کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ حضرت سے
فیض زیادہ ہوا خیر یہ تو حضرت کی خاص حالت تھی مگر مقصود اس وقت
مجکو ان حضرت پیر کے قصہ سے استدلال کرنا ہے کہ وہ مرید بڑی خوشی
سے پٹ رہا تھا جو بدون محبت کامل کے اپنے اختیار سے کوئی انسان اسکو گوارا
نہیں کر سکتا اور اس محبت کا منشاء صرف یہی امر ہے کہ اس کو اللہ والا و بلفظ دیگر کامل الایمان
کامل العمل سمجھتے ہیں حضرتؒ فرماتے تھے کہ ایک مولوی صاحب فرماتے تھے کہ خدا جانے یہ فقیر کیا ۱۲
گھول کر پلا دیتے ہیں ہم طالبعلموں کو کھلاتے ہیں پہناتے ہیں سبق پڑھاتے ہیں کتاب اپنی پاس
سے دیتے ہیں ان کے تمام ناز نخرے اٹھاتے ہیں اور جب پڑھ لکھ کر چلے جاتے
ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں اور ان فقیروں کے پاس جو آتا ہے منہ سے
بولتے تک نہیں وہ خانقاہ میں پڑے ہیں اور ان کو خبر بھی نہیں ہے
کبھی شاہ صاحب ہنس پڑے تو عید آگئی جیسے کسی عورت کو اس کا
خاوند منہ نہ لگاتا تھا۔ ایک روز اس نے گاجر کھا کر بیندی عورت کے
ماردی تو اس نے اپنی ماں کو کسی کے ہاتھ کہلا کر بھیجا کہ کھائی ہتی گاجر ماری
تھی بیندی آماں سے کہنا کہ کچھ سہاگ بہوڑا ہے (آیا ہے) ایسے ہی یہ
مرید صاحب بھی پیر صاحب کے ہلنے سے پھولے نہیں سماتے برسوں کے
بعد اگر کچھ بتلا دیا تو بہت ہی خوش ہیں حالانکہ پیر صاحب پر کون سی
محنت پڑی ذرا زبان ہلا دی۔ ساری محنت مرید ہی کرتا ہے پھر حالت

یہ ہے کہ نہ اس کے کھانے کی خبر نہ پینے کی خبر اور خدمتیں کرو وہ علیحدہ اور اگر پیر صاحب کے یہاں بھینس بھی ہے تو سانی کرو چارہ لاؤ بھینس کو چراؤ دودھ نکالو اور جب چاہیں بھینس کی وجہ سے مرید کو نکال دیں جب چاہیں مارلیں مگر وہ ہے کہ ٹلتا ہی نہیں زندگی تک تو یہ حال رہتا ہی اور جب پیر صاحب مر گئے بیوی بچوں کو چھوڑ ان کی قبر کا مجاور ہو گیا غرض خدا جانے کیا پلا دیتے ہیں کہ سریش ہو کر لپٹ جاتا ہے۔ حضرت ان کے پاس ایک مقناطیس ہے وہ اس سے جذب کرتے ہیں وہ کیا ہے وہی خدا تعالےٰ کی اطاعت شیخ شیرازیؒ فرماتے ہیں ؎

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ   کہ گردن نہ پیچد ز حکم تو ہیچ

(تو بھی حق تعالیٰ کے حکم سے گردن نہ پھیر کہ تیرے حکم سے کوئی گردن نہ پھیرے گا ۱۲)

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

۱۳ ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید   ترسد از وے جن و انس و ہر چہ دید

(جو شخص اللہ تعالےٰ سے ڈرا اور اس نے تقویٰ اختیار کیا تو اس سے جن و انسان اور جو چیز اس کو دیکھتی ہے ڈرتی ہے)

یہ خوف اور محبت کا جمع ہونا بھی نہایت عجیب و غریب ہے۔ دیکھئے اس قسم کے نمونے موجود ہیں کہ مدار محبوبیت کا ایمان اور عمل صالح ہی ہے۔ اب مجھے اپنے اس دعوے پر دلائل کی ضرورت نہیں اس لئے کہ جبکہ میں مشاہدہ کرا رہا ہوں تو دلیل کی اب کیا ضرورت رہی۔ مگر تبرعاً اس کی وجہ بھی بتاتا ہوں کہ ایمان و عمل صالح کی وجہ سے محبت کیوں ہوتی ہی اصل وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس میں خاصیت ہی یہ رکھ دی ہی جیسے بعض دوائیں بالخاصہ موثر ہوتی ہیں ایسے ہی یہ بھی ہے لیکن یہ زمانہ ہے تحقیقات کا اس لئے اس پر اکتفا نہ کیا جاویگا اس لئے میں اس کی دو وجہ بیان کرتا ہوں ایک تو راز ظاہری اور ایک باطنی۔ باطنی کو

اوّل بیان کرتا ہوں حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ
کی اطاعت کرتا ہے تو حق تعالیٰ اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور جبرئیل
علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ تمام ملائکہ میں پکار دو کہ فلاں بندہ سے ہم کو
محبت ہے تم بھی اس کو دوست رکھو پھر حکم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھی پکار
دو اگر کوئی کہے کہ ہم کو کسی کی نسبت بھی اعلان نہیں۔ سنئے بات یہ ہے کہ
فرشتوں کا اعلان قلوب میں ہوتا ہے اور وہ یہی کہ اس کی محبت قلوب
میں پڑجاتی ہے۔ چنانچہ زمین میں یہ اعلان کیا جاتا ہے فَیُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ
فِی الْاَرْضِ (پس رکھ دیا جاتا ہے اس کے لئے مقبولیت زمین میں) پس وہ سب کی نظروں
میں مقبول ہوتا ہے اس کے بعد حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اِستشہاد
میں یہ آیت پڑھی اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ
وُدًّا (بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے تو عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں
محبت پیدا کر دیں گے) حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ آیت پڑھنا صریح دال ہے ۱۴
اس پر کہ وُدًّا (محبت) یہاں پر مصدر مبنی للمفعول ہے اور میرا اس مضمون کو
اس آیت سے استنباط کرنا صحیح ہے دوسرا راز باطنی یہ ہے کہ محل محبت
کا قلب ہے اور قلوب حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے جب وہ قلوب میں
کسی کی محبت پیدا کرنا چاہیں گے بالاضطرار اس کے سامنے جھک جانا
ہی پڑے گا۔ اس کے سامنے پھر کسی کا حوصلہ نہیں ہے کہ ٹیڑھا چلے۔ ایک
مقام پر ایک بزرگ سے کوئی شخص اُلجھا دونوں طرف خشک خشک
جواب ہوئے ان بزرگ کے پاس سے وہ شخص پچاس قدم بھی نہ گیا ہوگا کہ
دل میں ایک چوٹ سی لگی اور قدم آگے نہ بڑھا اور واپس آکر ہاتھ
جوڑے کہ خدا کے واسطے میرا قصور معاف کر دو۔ اور یہ کہا کہ خدا جانے
مجھکو کیا ہو گیا کہ میں قدم آگے بڑھاتا تھا اور پیچھے کو ہٹتا تھا وہ بات کیا
تھی یہ نہیں کہ اُن بزرگ نے کچھ تصرف کیا ہو بلکہ اس پر ایک سرکاری

پیادہ مسلط ہو گیا اور کشاں کشاں اس کو پکڑ لایا غرض ان بزرگ نے جب
قصور معاف کیا اُس وقت وہ گیا اس سے معلوم ہوا کہ قلب میں کوئی بات
خدا تعالےٰ پیدا کر دیتے ہیں غرض راز باطنی تو اس کا یہ ہے اور راز ظاہری
یہ ہے کہ محبت کے تین سبب ہوا کرتے ہیں۔ نوال۔ کمال۔ جمال کبھی نوال
یعنی عطا و احسان سبب محبت کا ہوتا ہے۔ چنانچہ محسن سے اِسی بناء پر
محبت ہوتی ہے اور عطا ہی میں یہ بھی داخل ہے کہ کسی کی خطا معاف کر دی
جاوے یا کسی کا کام کر دیا جاوے۔ کسی کی بیہودگی پر درگذر کی جاوے۔
کبھی کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے خواہ علمی ہو یا عملی یا اخلاقی مثلاً اہلِ علم
سے محبت اسی واسطے ہوتی ہے کہ اِن میں کمالِ علم ہے اگرچہ اس کے علم
سے اپنے کو بھی نفع نہ ہو اور جیسے حاتم کی سخاوت سُن کر اس کی طرف ایک
میلان ہوتا ہے اور جیسے رستم سے اسی واسطے محبت ہے کہ اس میں شجاعت
۱۵ کا کمال ہے۔ مجھ کو یاد ہے کہ بچپن میں اردو شاہنامہ دیکھا کرتا تھا جب
کسی لڑائی کا قصہ آتا تو جی سے تمنا ہوتی تھی کہ خدا کرے یہ لکھا ہو کہ رستم
جیت گیا۔ حالانکہ اگر وہ جیت گیا یا ہار جاوے تو ہم کو کیا نفع ہے مگر اُس کے
کمال کی وجہ سے کان اِس بات کو نہیں سُن سکتے تھے کہ ہار گیا۔ تو اس کی
وجہ یہی ہے کہ اس کے اندر شجاعت کا کمال تھا۔ اس زمانہ میں جو بہت
سے واقعات لڑائی کے ہوئے تو مسلمانوں کے غلبہ کو سنکر مسلمانوں کا دل
تو خوش ہوتا ہی تھا مگر بہت سے ہنود کو بھی دیکھا کہ وہ ان کے غلبہ کو
سُنکر خوش ہوتے تھے۔ اس کا سبب بھی وہ ہی محبت ہے ترکوں سے
بسبب ان کے کمالِ شجاعت کے اور اس کے علاوہ ایک سبب ترکوں سے
محبت کا ان کی مظلومیت بھی تھی کہ یہ بھی کمال میں داخل ہے اس لئے کمال
یہ ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرے اور جب اس پر ظلم ہو تو مستقل رہے۔ تیسرا سبب
محبت کا جمال ہوتا ہے جیسے کوئی حسین جمیل ہے اُس سے بالطبع محبت

ہوتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ گورے چٹے کو
جمیل نہیں کہتے یہ تو پوست پرستوں کا مذہب ہے کہ ان کے یہاں محبت
جمال صورت ہی سے ہے۔ عقلاء کے نزدیک اصلی جمال یہ ہے کہ اخلاق
تناسب و اعتدال ہو اور اسی سے کشش ہوتی ہے قلوب کو اگر اس کے
ساتھ صورت بھی کچھ اچھی ہو تو بہت ہی کچھ کشش ہوتی ہے یہ ہیں طبعی
اسباب محبت کے اب دیکھئے مطیعان شریعت میں یہ امور کس درجہ کے
ہوتے ہیں کیونکہ خود تعلیم شریعت ہی ان کی جامع ہے چنانچہ نوال کی تو
یہ کیفیت ہے کہ ایثار ۔ جود ۔ کرم ۔ عطا انسان ہی کے ساتھ نہیں بلکہ
جانوروں تک کے ساتھ کرنے کا حکم فرمایا ہے جو ہمدردی شریعت نے
تعلیم کی ہے کیا کوئی اس کا مقابلہ کرسکتا ہے اور اس پر ممکن ہی کہ کوئی
ایسا شخص جو سانپ وغیرہ کو بھی نہیں مارتا یہ کہے کہ شریعت نے توموذی
جانوروں کے مارنے کا حکم دیا ہے یہ کیا ہمدردی ہے اور ہم تو موذی ۱۶
جانوروں کو بھی نہیں ستاتے۔ صاحبو! ہر شے کا ایک مصرف ہی رحم اور
ہمدردی کا بھی موقع ہے اگر اس موقع پر کی جاتے گی تو مدح کے قابل
ہوگی ورنہ ہمدردی نہوگی دیکھو پیار محبت بہت اچھی شے ہی مگر کس کے
ساتھ اپنے بچّوں کے ساتھ بیوی کے ساتھ اگر کوئی بیہودہ معمول کرلے کہ
جب گھر آیا کرے اماں جان کو پیار کیا کرے تو اس کو سب مسخرہ اور بیوقوف
اور بے ادب کہیں گے۔ اسی طرح مثلاً باپ کو برخوردار نور چشم کہنے لگے
تو معیوب ہوگا۔ غرض ہر شے کے اندر اعتدال ہونا چاہیئے ورنہ پھر وہ
اپنی حد سے نکل کر اپنی ضد میں جا پہنچتی ہے بقول اہل تحقیق اَلشَّیْءُ اِذَا
خَرَجَ عَنْ حَدِّہٖ لحق نقیضہٗ (جبکہ کوئی چیز اپنی حد سے نکل جاتی ہے تو اپنی ضد میں جا پہونچتی ہی)
مثلاً ترحم ہی ہے اس میں اگر اعتدال نہ ہوا مثلاً چوہوں کو نہیں مارا تو
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے آدمیوں کو مارا کیونکہ وہ آدمیوں کو تکلیف

دیں گے کیا اچھا رحم ہوا کہ چوہوں پر تو رحم کیا اور اپنی بنی نوع کا نقصان کیا۔ اسلام نے اخلاق کی تعدیل کی ہے۔ یہ تو نوال میں گفتگو تھی۔ اب کمال کو لیجئے۔ بڑا کمال علم ہے شریعت میں اس کے حاصل کرنے کی بہت ہی تاکید ہے۔ سخاوت اور شجاعت بھی کمال ہیں شریعت نے ان دونوں کا بھی ایسا اہتمام کیا ہے کہ کوئی اس کی نظیر نہیں دکھلا سکتا۔ اب رہ گیا جمال تو اس کا مدار ہے اخلاق پر اس لئے کہ اخلاق جمیلہ میں جو کشش ہے حسن صورت میں اس قدر نہیں ہے اگر کسی میں اخلاق جمیل ہوں اگرچہ ترکیب اعضاء کے قاعدے سے عرفا وہ حسین نہ ہو مگر اس کے اندر ایک دلربائی چہرہ پر حلاوت اور نور ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے حسینوں میں وہ بات نہیں ہوتی۔ بازاری عورتیں اپنے کو بہت بناتی ہیں مگر چونکہ اخلاق ذمیمہ ان کے اندر ہوتے ہیں اس لئے چہرہ پر پھٹکار برستی ہے بھولاپن نہیں ہوتا۔ بخلاف عفیف عورتوں کے کہ کیسی ہی میلی کچیلی کالی کولی ہوں مگر ان کے اوپر ایک نور اور کشش ہوتی ہے سو اعمال صالحہ میں یہ خاصیت بھی ہے کہ جمال بڑھ جاتا ہے حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِم مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ (ان کے آثار بوجہ تاثیر سجدہ کے ان کے چہروں میں نمایاں ہیں) مولانا فرماتے ہیں ؎

نور حق ظاہر بود اندر ولی　　　نیک بیں باشی اگر اہل دلی

(انوار الٰہی ولی میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اگر تو اہل دل ہو تو اس کا ادراک کر سکتا ہے ۱۲)

کسی نے خوب ترجمہ کیا ہے ؎

مرد حقانی کی پیشانی کا نور　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اور اگر کسی کا ذہن اتنا عمیق نہ ہو اور غایت بلاہت سے وہ حسن متعارف ہی میں جمال کو منحصر سمجھتا ہو تب بھی ظاہر ہے کہ محبوبیت کاملہ کے لئے اس کا مدار ہونا مشروط ہوگا اس حسین الصورت کے حسین السیرت ہونے پر جس سے

پھر اصل مدار یتہ ایمان و عمل صالح ہی کے لئے ثابت رہی ورنہ اگر اسکی سیرت اچھی نہوئی تو بعض کو اس سے محبت ہی نہ ہوگی اور اگر کسی کو ہوگی کامل نہ ہوگی یعنی ضعیف ہوگی یا جلدی زائل ہوجاوے گی یعنی جب یہ حسن جاتا رہے گا تو محبوبیت بھی جاتی رہے گی اور حسن سیرت پر جو محبوبیت ہوگی وہ مدت العمر باقی رہے گی علاوہ اس کے اگر اس سے بھی قطع نظر کی جاوے تب بھی محبوبیت کے لئے مجموعہ اسباب کا جمع ہونا ضروری نہیں اگر مومن عامل صالحات میں جمال بھی نہ ہو تب بھی دوسرے اسباب تو قوت کیساتھ موجود ہیں وہ بھی محبوبیت کے لئے کافی ہیں اور اگر کسی کافر میں محبوبیت پائی جاوے تو اگر وہ اخلاق اسلامی میں سے کسی خلق کے پائے جانے سے ہے تب تو اُس کا سبب وہی عمل صالح ٹھیرا باقی یہ بات کہ پھر مومن کی کیا تخصیص ہوئی اس کی تحقیق یہ ہے کہ وہ خلق بھی غیر مومن میں اس کمال کے ساتھ ہرگز نہ پایا جاوے گا جیسا مومن میں کیونکہ مومن میں اس کا مقتضی مضبوط ہوگا یعنی ابتغاء مرضات حق (مرضیات الٰہی کو چاہنا) جس ۱۸
میں تغیر و تبدل نہیں ہوتا بخلاف کافر کے کہ اُس کا جو منشا رہوگا وہ متبدل ہوگا اور اس کے تبدل سے وہ خلق متبدل ہوسکتا ہے پس کمال محبوبیت مومن ہی میں رہی اور اگر اخلاق کے علاوہ اور کوئی امر ہے جیسے حسن صورت وغیرہ تو وہ عام محبوبیت کا سبب نہ ہوگا چنانچہ مسلم ومشہور ہے معشوق من است آنکہ بہ نزدیک تو زشت ست (وہ میرا معشوق ہے جو تیرے نزدیک برا ہے) بخلاف اسباب تعلیم فرمودۂ شریعت کے کہ اُس میں یہ اثر عام ہے البتہ جس کے مدرکات ہی ٹھیک نہ رہے ہوں یا اُس کی کوئی غرض فوت ہوتی ہو اُس کا اعتبار ہی نہیں یہ مضمون آئندہ مقصوداً بھی آتا ہے اور لیجئے ایک سبب محبت کا خوش معاملگی وخوبی معاشرت ہے جو مفہوم کلی کمال میں داخل ہوسکتی ہے شریعت نے اس کی یہاں تک تعلیم کی ہے کہ دور دور تک کے

اِحتمالات تک پر نظر فرمائی ہے کہ کسی کے مال میں بلا اجازت متصرف نہ کرو
کسی کے خلوت خانہ میں بلا اجازت نہ جاؤ اگر جاؤ تو اجازت لیکر جاؤ اور
اس کا طریقہ کیسا اچھا تعلیم فرمایا کہ دروازے پر کھڑے ہو کر کہو کہ السلام علیکم
اَدْخُلُ یعنی میں آؤں تین بار کہنے پر اگر جواب نہ ملے تو واپس چلے آؤ کواڑ
مت کھٹ کھٹاؤ ممکن ہے کہ اِس وقت ملنے سے کچھ عذر ہو سوتا ہو یا جی
نہ چاہتا ہو اُس کو معذور سمجھ کر واپس چلے آؤ اور اگر اندر سے یہ کہہ دیا
جاوے کہ اس وقت واپس جاؤ تو واپس چلے آؤ برا مت مانو چنانچہ ارشاد
ہے هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ کہ یہ زیادہ صفائی کی بات ہے شاہ عبدالقادر صاحب
اِس کی تفسیر میں فرماتے ہیں یعنی اس میں ملاقات صاف رہتی ہے جناب
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ
کے گھر تشریف لے گئے وہ عوالی میں رہتے تھے بعض عوالی کئی کئی میل کے
۱۹ فاصلہ پر تھے اور السّلام علیکم انا اَدْخُلُ (میں آؤں) تین بار فرمایا جب تینوں
مرتبہ جواب نہ آیا تو آپ واپس تشریف لے جانے لگے حضرت سعد بن
عبادہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ دوڑے کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم آپ کہاں چلے فرمایا
کہ تین مرتبہ کے بعد انتظار کرنا نہ چاہیے سعدؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم
میں تو برابر سنتا رہا مگر اس لئے نہیں بولا کہ اچھا ہے یہ دعائیہ کلمات جو
اِس زبان مبارک سے نکل رہے ہیں جتنے مل جائیں غنیمت ہیں افسوس
ہے کہ آجکل بجائے السّلام علیکم کے جو تمام دعاؤں اور ادب کو جامع ہے
آداب کورنشات نکلا ہے آداب کے معنی تو میرے نزدیک یہ ہیں کہ آ
پاؤں داب یہ ادب ہوا کہ دوسرے کو حکم پاؤں دابنے کا کر رہے ہیں
بعض لوگ بندگی کرتے ہیں۔ میں جب کانپور اوّل اوّل گیا تو وہاں مسلمانوں
میں بھی اِس لفظ بندگی کا رواج دیکھا ہے اب جو کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے
تو وہ بندگی کہتا ہے مجھے غصّہ آیا کہا کہ میں کیا ہندو ہوں جو بندگی مجھ کو

کہتے ہیں وہاں کے لوگوں نے کہا کہ یہاں کا رواج ہی یہ ہے۔ یاد رکھو یہ سب خرافات ہیں السلام علیکم سے بہتر کوئی لفظ نہیں ہے تمام دعاؤں کو جامع ہے لیکن خدا تعالےٰ کو ان لوگوں کو اس کی برکات سے محروم کرنا ہے اس لئے ان کو توفیق ہی اس کی نہیں ہوتی غرض حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالےٰ عنہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو پھر لائے دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی خود اپنے اوپر اس قانون کو جاری کیا اور پھر کمال اخلاق یہ ہے کہ شکایت حکایت نہیں یہاں تو کوئی ادنیٰ آدمی بھی ہو تو کہنے لگتا ہے کہ تم بڑے مغرور ہو ہم پکارتے چلاتے رہے سُنا ہی نہیں۔ اور اس باب میں شرع نے یہاں تک رعایت کی ہے کہ ارشاد ہے لَا یَتَنَاجیٰ اِثْنَانِ دُوْنَ الثَّالِثِ یعنی اگر تین آدمی بیٹھے ہوں تو دو آپس میں سرگوشی نہ کریں اس لئے کہ اس کا دل دُکھے گا کہ بس میں ہی غیر تھا مجھ سے چھپانا
۲۰ منظور تھا کہاں ہیں تمدن کے مدعی میں بقسم کہتا ہوں کہ شریعت نے تمدن کی اس قدر رعایت کی ہے کہ اُتنی کوئی کرتا تو کیا اُس کے دقائق اور اس کے علل سمجھنے کے لئے بھی بڑے دماغ کی ضرورت ہے افسوس شریعت جیسے دلبر رعنا کو لوگ ڈائن سمجھتے ہیں ارے شریعت تو وہ محبوب ہے کہ جیسا کسی نے کہا ہے ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ مے نگرم — کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

(سر سے قدم تک جس جگہ دیکھتا ہوں کرشمہ دامن دل کو کھینچتا ہے کہ یہی جگہ محبوبیت کی ہے۔)

جس ادا کو دیکھو دل کھینچتا ہے۔ اے صاحبو! اپنے گھر کی دولت چھوڑ کر کیوں دوسروں سے بھوٹی کوڑیاں مانگتے ہو تمہاری معاشرت تمہارے کھانے پینے تمہارے اخلاق تمہاری سیاست و انتظام شریعت نے کسی بات کو بھی تو نہیں چھوڑا افسوس ہے کہ۔ اور ہزار افسوس ہے کہ ایسی محبوبہ کو چھوڑ کر چڑیلوں پر گرتے ہو کیونکہ شریعت کے سامنے تہذیب جدید کو بالکل یہی نسبت

ہے اور طرفہ یہ کہ شریعت میں دین کی راحت تو ہے ہی دنیا کی بھی پوری آسائش
ہے اور اسی طرح اس تہذیب مخترع میں دین کا تو جو کچھ بھی ضرر ہو خود دنیا کی
بھی کلفتیں ہیں چنانچہ مقابلہ اور امتحان ہی کے طور پر دیکھ لو مثلاً آجکل ہمارے
ترقی یافتہ بھائی آزادی کا بہت دم بھرتے ہیں اور شریعت کو قید بتلاتے
ہیں ہم تو اس کا برعکس دیکھ رہے ہیں کہ یہ لوگ مقید ہیں اور ہم آزاد ہیں
ایک صاحب کانپور میں کوٹ پتلون بوٹ سوٹ سے کسے کسائے میرے پاس
آئے وہ بیٹھنا چاہتے تھے کرسی پر تو وہ سہولت سے بیٹھ جاتے لیکن ہم غریبوں
کے پاس کرسی کہاں ہمارے لئے تو چٹائی پر بیٹھنا فخر ہے اب وہ کھڑے ہیں
لیکن کھڑے کھڑے بات کیسے کریں ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھی چھڑی پر سہارا
دیکر اور تاک لگا کر بھد سے گر پڑے مجھے بڑی ہنسی آئی بتلایئے یہ تہذیب
ہے یا تعذیب یہ آزادی ہے یا قید ہے بیٹھنا تو مصیبت تھا ہی اور اٹھنا
اور بھی زیادہ مصیبت ہوا اور اگر چلتے چلتے گر پڑیں تو بس وہاں ہی پڑے ۲۱
رہتے ہوں گے اور لیجئے اگر جنگل میں کھانے کا وقت آجاوے تو ہم تو دانہ
بھی چبا سکتے ہیں اور روٹی ہو وہ بھی آدمیوں کی طرح بیٹھ کر کھا سکتے ہیں
اور ان کے لئے میز ہو کرسی ہو کانٹا ہو چھری ہو جب یہ کھانا تناول فرمائیں
کپڑوں میں ہماری یہ حالت ہے کہ پاجامہ نہ ہو لنگی باندھ لیں گے اچکن نہ ہو
کرتہ کافی ہے عمامہ نہ ہو ٹوپی ہی سہی پھر ٹوپی بھی خواہ کسی کپڑے کی ہو بجز
حدود شرعیہ کے کوئی قید نہیں اگر وہ بھی نہ ہو تو ننگے سر رہیں گے اور پھر
اچکن اگر بانات کا ہو تو اس کی قید نہیں کہ پاجامہ کشمیرہ کا ہو لٹھے کا ہو
گاڑھے گزی کا ہو کسی شے کا ہو نہ ہو لنگی بھی کفایت کرتی ہے انکو یہ مصیبت
ہے کہ اگر پتلون کسی خاص کپڑے کا ہو تو کوٹ بھی اس کے مناسب ہو
قمیص بھی اس کے مناسب ہو ورنہ فیشن کے خلاف ہے کیوں صاحبو یہ
آزادی تو بڑی بھاری قید ہے میں ان کی آزادی کی حقیقت عرض کرتا

ہوں کہ یہ لوگ صرف خدا تعالےٰ اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آزاد ہیں باقی نہ کھانے میں آزاد نہ پینے میں آزاد نہ پہننے میں آزاد ہر بات میں مقید ہیں اگر آزاد ہیں تو خدا تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آزاد ہیں تو خاک پڑے ایسی آزادی پر اور بھاڑ میں جائے ایسی مطلق العنانی اور مبارک رہے ہم کو یہ قید اگر ہم مقید ہیں تو ہماری قید کی تو حالت یہ ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند — شکارش نجوید خلاص از کمند

(اس کا قیدی قید سے رہائی کا خواہشمند نہیں ہوتا اور اس کا شکار جال سے خلاصی کا طالب نہیں ہوتا۔)

اور یہ وہ قید ہے ؎

گر دو صد زنجیر آری بگسلم — جز سر زلف آں نگار مقبلم

(اگر دو سو زنجیریں لاؤ تو توڑ دوں سوائے اپنے محبوب کی بندش کے یعنی سوائے اپنے محبوب کے کسی کی قید برداشت نہیں کر سکتا)

۲۲ اور ہماری ایسی قید ہے کہ مثلاً ایک محبوب کسی کو ملا ہو اور وہ اپنے عاشق پر مہربان ہے اس کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ وہ عاشق کو اپنے پاس بٹھلا لے اور اس کو نہ چھوڑے تو اس عاشق کی اس وقت کیا حالت ہوگی اس کی تو یہی تمنا ہے یہ حالت ہمیشہ رہے جیسے کسی نے کہا ہے ؎

[illegible] افتادم بدیں امید خرسندم — کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

(جیسے دور پڑا ہوں اس امید پر خوش ہوں کہ کبھی تو میرا ہاتھ دوبارہ میرا محبوب پکڑ لیگا)

بھلا اب کیا حال ہوگا بلکہ اگر وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تم کو زور سے ہاتھ پکڑنے سے تکلیف ہو تو تمہارا ہاتھ چھوڑ دوں تو وہ عاشق یہ کہے گا کہ میرا ہاتھ کیا جان بھی چھوٹ جاوے [illegible] ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت — سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

([illegible])

ہیں جن کو خدا تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس درجہ

محبت ہے کیا وہ اس قید کو ناگوار سمجھے گا ہرگز نہیں جس کو کسی کوئی محبت ہوئی ہوئی ہو گی وہ ہی اس کا لطف جانتا ہے ہاں جس قلب میں محبت کا مذاق ہی نہ ہو وہ کیا جانے کہ اس میں کیا لطف ہے نامرد اصلی کیا جانے کہ عورت میں کیا لطف ہوتا ہے ورنہ اگر مذاق ہے تو خدا جانتا ہے کہ ساری قیدیں آسان ہیں وہ چولھے میں ڈالے گا ان قیدوں سے آزاد ہونے کو اور بھاڑ میں ڈالے گا ایسی عقل کو اور سر پہ رکھ لے گا دیوانگی کو اسی دیوانگی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم   مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس و قلاش اور دیوانہ ہیں یہی دولت کیا کم ہے کہ محبوب حقیقی کی محبت میں مست ہیں)

ایسے شخص پر جو حالت بھی ہو ناداری ہو بیماری ہو افلاس ہو اس کو سب گوارا ہیں اور اول تو ایسے شخص کو کوئی بھی مصیبت نہیں ہوتی اور بالفرض
٢٣ اگر ہوں بھی تو اس کو اس حالت میں بھی چین ہے سکون ہے اطمینان ہے اس کی زندگی لطف کی زندگی ہے خواہ کیسی حالت میں ہو حق تعالیٰ اسی حیات کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً یعنی جو شخص نیک عمل کرے مرد ہو یا عورت اسکو ہم پاکیزہ زندگی عطا فرماتے ہیں ان کی ہر وقت تسلی کی جاتی ہے ان کے قلب میں سکون اور چین کا افاضہ ہوتا رہتا ہے اور ان کو ہر حال میں یہ کہا جاتا ہے ؎

سوئے نومیدی مرو کامیدہاست   سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

(نا امیدی کی راہ نہ جاؤ بہت سی امیدیں ہیں تاریکی کی طرف نہ جاؤ بہت سے آفتاب ہیں یعنی اللہ تعالےٰ سے ناامید نہ ہو بلکہ امید رکھو)

پس اس قید میں اگر ان کو کچھ تعب بھی ہو تو کچھ پرواہ نہیں اور ایسی قید کے مقابلہ میں جو آزادی ہے وہ نری مہمل ہے اور سراسر خسران ہے حرمان ہے

اور یہ آزادی بس خدا تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے آزادی ہے
ورنہ یہ لوگ سراپا مقید ہیں۔ دیکھا آپ نے کہ اسلام نے ہم کو کیسی آسایش کی
معاشرت سکھلائی ہے اور حقوق کی کہاں تک رعایت کی ہے اور لیجئے اسلام
کی تعلیم ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو اور یہ جڑ ہے محبوبیت باہم دگر کی
چنانچہ ارشاد ہے اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ مسلمان
وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں یعنی کسی کو اس سے
ضرر و اذیت نہ پہونچے یہ تو کلیہ ہے پھر اس کی جزئیات کی عملی اور علمی طور
سے ایسی تعلیم فرمائی ہے کہ انتہا کو پہونچا دیا ہے چنانچہ تعلیم ہے کہ اگر کوئی
بھائی مسلمان سوتا ہو اور تم کو اٹھنے اور کہیں جانے کی ضرورت ہو تو
آہستہ سے اٹھو اور آہستہ سے جوتے پہنو آہستہ سے کواڑ کھولو اگر بات
کرو آہستہ سے کرو یہ سب حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھا دیا جیسا
نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالےٰ عنہا سے لَيْلَةُ الْبَرَاءَةِ (شب برات) ۲۴
کے قصہ میں مذکور ہے وقت کم ہے ورنہ ایک ایک جزئی کے متعلق میں
قصے بیان کر دیتا میں نے ایک کتاب آداب المعاشرت لکھی ہے اس میں
یہ دکھلا دیا ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ دینے کی شارع نے کتنی رعایت
کی ہے آجکل جو دیندار کہلاتے ہیں وہ دینداری کو ان چند باتوں میں
منحصر سمجھتے ہیں کہ پائنچے ٹخنے سے اوپر کر لئے ڈاڑھی بڑھالی نماز پڑھ لی
بس دیندار ہو گئے باقی نہ اخلاق کو جزو دین سمجھتے ہیں نہ معاشرت کا
دین سے کچھ تعلق جانتے ہیں نہ معاملات ان کے شریعت کے موافق
ہیں کسی کو ستا لیا کسی کی غیبت کر لی کسی کو حقیر سمجھ لیا کسی کی آبروریزی
کرلی اور پھر دیندار کے دیندار اس کی وہ مثال ہے جو مولانا یا اور کوئی
مصلح فرماتے ہیں ؎

ملنے کا پتہ - مکتبہ تھانوی مسافر خانہ بندر روڈ - کراچی ۱

از بروں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عزوجل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ می دارد یزید

(باہر سے کافر کی قبر کی طرح مزین اور اندر خدائے عزوجل کا عذاب ہو رہا ہے باہر سے تو بایزید بسطامیؒ جیسے پر طعنہ زنی کرتا ہے اور تیری اندرونی حالت سے شیطان بھی شرماتا ہے ۱۲)

ایسے دینداروں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ بس دیندار ایسے ہی ہوتے ہیں اور شریعت کی یہی تعلیم ہے صاحبو! یاد رکھو کہ دین نام صرف ظاہر ہی کے درست کرنے کا نہیں گو ظاہر کی اصلاح بھی دین میں مامور ہے مگر صرف اُس سے پورا دیندار نہیں ہوتا پورا دیندار وہ ہے جو شریعت کے ہر ہر حکم پر عمل کرے ظاہر کے متعلق بھی اور باطن کے متعلق بھی حسین اُس کو کہیں گے جو سر سے پاؤں تک حسین ہو اور اگر سب اعضاء خوبصورت ہوں اور آنکھیں پھوٹی ہوئی ہوں تو وہ حسین نہیں ۲۵
ہے پس جس کے اندر ایک بات بھی دین کے خلاف ہو گو وہ ہم سے اچھا ہے لیکن اُس کو نمونہ دین کیوں سمجھتے ہو۔ اور دیکھئے شریعت کی تعلیم ہے کہ سفارش سے بھی کسی کو تکلیف نہ دو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہؓ سے حضرت مغیثؓ کی سفارش کی جو اوّل اُن کے شوہر تھے اور انھوں نے خیار عتق کی بناء پر تفریق کر لی تھی اُن سے نکاح کرنے کے لئے فرمایا وہ پوچھتی ہیں کہ آپ کیا حکم فرماتے ہیں یا سفارش آپ نے فرمایا سفارش کہنے لگیں مجھ کو منظور نہیں آپ ناخوش نہیں ہوئے اس سے ثابت ہوا کہ سفارش وہی ہے جس میں کسی پر زور نہ ڈالا جاوے تو اتنی تکلیف بھی کسی کو گوارا نہیں کی گئی اسی طرح دین کے اندر صفائی کا حکم ہے دیکھئے اگر معاملات کو صاف رکھیں تو ممکن نہیں کہ دلوں میں فرق آوے بہر حال شریعت کا جو حکم معاملہ و معاشرت و

اخلاق کے متعلق لیجیے اُس کی تفصیل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس تمام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی کو کسی سے تکلیف نہ ہو۔ الحاصل جو اسباب محبت کے ہیں نوال جمال کمال شریعت نے اُن کی بابلغ وجہ (کامل طریقہ سے) تعلیم فرمائی ہے پس جو شخص شریعت پر عمل کریگا جو کہ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (عمل کئے نیک) کا مدلول ہے وہ بالطبع محبوب ہوجائے گا اور اپنی قوم میں تو محبوب ہو ہی گا غیر قوموں میں بھی اس کا اعتبار ہو گا اس سے بعض اعمال صالحہ کا دوستی میں دخل ہونا۔ سمجھ میں آگیا ہو گا جو کہ باب معاملہ و معاشرت و اخلاق سے ہے اب یہ بات رہ گئی کہ ایمان اور نماز روزہ کو کیا دخل ہے محبوبیت میں سو اُس کی نسبت سنو کہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ کوئی کام ہو اول اُس کا قلب میں ارادہ پیدا ہوتا ہے پھر اس کا جوارح سے ظہور ہوتا ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ کسی امر پر نباہ بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ اس کا تقاضا شدید اور قلب میں راسخ ہوجائے اور اُس کے اضداد ۲۶
و موانع قلب سے مرتفع ہوجائیں ورنہ ارادہ ہو گا مگر غیر راسخ جب راسخ نہیں تو اکثر ارادہ بھی نہ ہو گا تو عمل بھی نہ ہو گا پس ثابت ہوا کہ مداومت و استقامت بدون تقاضائے قلب کے نہیں ہوتا پس اس قاعدہ کے موافق اخلاق و معاملات و معاشرت کی درستی بھی جس کا دخیل ہونا محبوبیت میں مسلم ہو چکا ہے جب ہی نبھ سکتی ہے کہ ان چیزوں کا قلب میں تقاضا و رسوخ ہو اور وہ تقاضا و رسوخ بغیر ایمان اور روزہ نماز کے نہیں ہو سکتا اس لئے کہ تمام تعلیمات متعلقہ بصدق و معاملات اللہ تعالیٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہی ہم کو تعلیم فرمائی ہیں تو جب تک تصدیق اللہ تعالےٰ و رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قلب میں راسخ نہوگی تو اُن تعلیمات پر استقامت نہ ہوگی یہ تو ایمان کا دخل ہوا اور روزہ نماز کو یہ دخل ہے کہ یہ کیفیت قلبی تقاضے کی موقوف ہے

قلب کی صفائی پر اور قلب کی صفائی بغیر روزہ نماز نہیں ہوتی روزہ سے تو اس طرح کہ اُس سے قوت بہیمیہ کا انکسار ہوتا ہے اور نماز سے تواضع پیدا ہوتی ہے تکبر ٹوٹتا ہے اور تکبر و بہیمیہ ہی اصل ہے بہت سے اخلاق ذمیمہ کی پس صوم وصلوٰۃ سے اس کی اصلاح ہوگی اور اس کی اصلاح سے معاملات وغیرہ درست ہوں گے جو مدار ہے محبوبیت کا اور مسبب کا سبب ہے پس نماز و روزہ سبب ہوا محبوبیت کا مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ایمان اور صوم وصلوٰۃ کا موضوع لہٗ (جس کیلئے وضع کئے گئے ہیں) صرف یہی ہے اصلی موضوع لہٗ تو اُن کا قرب الٰہی ہے لیکن یہ محبوبیت بھی اوسپر خاصہ لازمہ کے طور پر مرتب ہوجاتی ہے چونکہ یہاں بیان تھا محبوبیت و مودۃ کا اس لئے اس کا بھی اس میں دخل بیان کردیا گیا۔ اب دو سوال

۲۷ رہ گئے ایک سوال تو یہ ہے کہ ہم بعضے دینداروں کو دیکھتے ہیں کہ وہ شریعت کے پورے پابند ہیں اور ساری دنیا کو نصیحت کرتے ہیں لیکن سب سے ان کی لڑائی رہتی ہے لوگ اُن کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھتے وہاں محبوبیت کا ترتب کیوں نہیں ہوا جواب اس کا یہ ہے ع

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

(اے دوست غلطی یہی ہے کہ تو سخن فہم نہیں ہے)

یہ سوال آپ کا کم فہمی سے پیدا ہوا ہے۔ صاحبو! نصیحت کا بھی شارع نے قانون مقرر کیا ہے جب کوئی شخص اُس قانون کے خلاف کریگا تو اُس نے کمال ایمان وعمل صالح ہی میں خلل ڈالا۔ اس لئے لامحالہ وہ ایمان وعمل صالح کے اس ثمرہ مودت ومحبوبیت سے ضرور محروم رہیگا اس سے وہ شبہ جاتا رہا اور وہ قانون یہ ہے کہ نصیحت خیرخواہی اور محبت اور ہمدردی سے ہو نفسانیت کا اس میں شائبہ نہ ہو تو جو شخص اس قانون کے موافق عمل کریگا اس کی کسی سے مخالفت ہو ہی نہیں سکتی

شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے مجلسِ وعظ میں ایک شخص کو دیکھا کہ اُس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک رہا ہے کوئی اور مولوی صاحب ہوتے تو بُلا کر ملامت کرتے بُرا بھلا کہتے سچ یہ ہے کہ ہم لوگ نام کے مولوی ہیں اور نرے الفاظ پرست ہیں حالانکہ الفاظ یاد کر لینے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک حال نہ ہو۔ مولانا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں ؎

قال را بگذار مردِ حال شو　　پیش مردِ کاملے پامال شو

(قال کو چھوڑ دو حال پیدا کرو کسی کامل شخص کے سامنے پامال ہو جاؤ تو صاحب حال بن جاؤ گے)

پس اگر کوئی نرا مولوی ہوتا تو وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (نیک باتوں کا حکم اور بری باتوں سے منع کرنا) کی آیات و احادیث پر اس طرح عمل کرتے کہ بلا کر اس کو بُرا بھلا کہتے اب عداوت و نفرت جانبین میں ہوتی اور اُس کو دیکھ کر بیشک یہ شبہ پیدا ہوتا کہ تم تو کہتے ہو کہ شریعت پر عمل کرنے سے محبوب ہو جاتا ہے اور اس پر لوگ پروانوں کی طرح گرتے ہیں لیکن ہم تو دیکھتے ہیں کہ بجائے دوستی کے اور اُلٹی عداوت اور نفرت ہو گئی۔ لیکن شاہ صاحب نے یہ نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ آپ ذرا ٹھہر جایئے آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے وہ ٹھہر گیا بعد فراغت کے فرمایا کہ بھائی اپنا عیب آدمی کو معلوم نہیں ہوتا مجھے اپنے اندر ایک عیب کا شبہ ہے وہ یہ کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے اور اس پر ایسی ایسی وعیدیں آئی ہیں تو آپ ذرا دیکھ لیں کہ واقعی میرا شبہ صحیح ہے یا نہیں وہ شخص پانی پانی ہو گیا اور عرض کیا کہ حضور آپ کا پاجامہ کیوں لٹکتا میرا البتہ لٹک رہا ہے اور اُسی وقت اس کو جا کر درست کر لیا۔ اور ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی پس اگر محبت اور حکمت عملی سے کہا جاوے تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی بُرا مانے اِسی واسطے امر بالمعروف اور وعظ عام کی ہر شخص کو اجازت نہیں ہے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ
عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی چاہیے کہ ایک جماعت تم میں سے ایسی ہو کہ جو خیر کی
طرف داعی ہوں اور نیک بات کا حکم کریں اور بری بات سے
منع کریں دیکھئے یہ نہیں فرمایا کہ تم سب امر بالمعروف (اچھی باتوں کا حکم کرنا)
کرو بلکہ یہ فرمایا کہ تم میں سے ایک جماعت ایسی بھی ہونا چاہیے کہ
اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف کا ہر شخص اہل نہیں
ہے ہر شخص کو اجازت نہیں ہے کہ وہ وعظ عام اور خطاب عام کرے
البتہ جن پر پوری قدرت ہے جیسے اپنے اہل و عیال وہاں اصلاح
کا ہر شخص مکلف ہے يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ
نَارًا ﴿۵۱﴾ (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ سے بچاؤ) غرض
ہر کام تدبیر سے ہوتا ہے میرا معمول ہے جب میں کہیں سفر میں ہوتا
۹ ہوں مجھ سے فرمائش ہوتی ہے کہ وعظ میں فلاں بات کا ذکر کرنا
میں صاف انکار کر دیتا ہوں بعضے ایسے بھولے بھالے ہوتے ہیں کہ
منبر پر بیٹھ کر وہی سبق گاتے ہیں جو ان کو پڑھایا جاتا ہے لوگوں کو
معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کہلایا ہوا کہہ رہے ہیں اس سے اثر ضعیف
ہو جاتا ہے اور لوگوں کو ناگوار بھی ہوتا ہے میں ایسی فرمائش پر
ہرگز عمل نہیں کرتا حتیٰ کہ نواب صاحب ڈھاکہ نے مجھ کو بلایا تھا
میں نے پہلے یہ شرط کر لی تھی کہ آپ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ آپ
مجھ سے کسی خاص بات کے وعظ میں بیان کرنے کی فرمائش کریں
چنانچہ انھوں نے موافق شرط کے کسی بات کی فرمائش نہیں کی میں نے
وعظ میں جو چاہا بیان کیا کسی نے بھی برا نہیں مانا میں نے اس کا
تجربہ کیا ہے کہ فرمائشی وعظ کا اور رنگ ہوتا ہے اور خود کہنے میں
اور بات ہوتی ہے بس شریعت کا قانون ہے کہ نصیحت و تذکیر

میں آداب و احتساب کی رعایت کرو اور اگر کوئی باوجود آداب کے رعایت کرنے کے بُرا مانے اس پر شبہ واقع نہیں ہوسکتا اس لئے کہ صفراوی کو مٹھائی کڑوی معلوم ہوہی گی اس لئے کہ اس کا مزاج ہی خراب ہے امر بالمعروف کی خاصیت میں کچھ خرابی نہیں اس کا خاصہ تو یہ ہے کہ ممنون ہونا چاہیے ہمارے امراض اس شخص نے معلوم کرائے ایک اعتراض تو یہ تھا جس کا جواب ہوگیا دوسرا سوال یہ ہے کہ بعض دیندار بھی نہیں ہوتے اور پھر بھی وہ محبوب ہوتے ہیں تو پھر محبوبیت صرف دینداری کا خاصہ کیا ہوا میں اس کا راز بتلاتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب کوئی محبوب ہو اور وہ دیندار نہ ہو تو یہ دیکھو کہ علت اس کی محبوبیت کی کیا ہے سو علت اس کی اکثر تو وہی شے نکلے گی جس کا شریعت نے حکم کیا ہے مثلاً کوئی کافر سخی ہے یا عادل ہے تو اس سے اُس کی سخاوت اور عدل کی وجہ سے محبّت ہوتی ہے اور سخاوت اور عدل دونوں کی شریعت نے تعلیم کی ہے کفر کے ساتھ مِل کر بھی اُنھوں نے اپنا اثر دکھلایا ۔ ۳۰

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند صاف گر باشد ندانم چوں کند

یعنی شراب کا گھونٹ مٹی میں مِل کر جب مست بنا دیتا ہے تو خالص شراب تو کیا کچھ نہ کرے گی ۔ اِسی طرح اَعمال شرعیہ کفر کی نجاست کی آلودگی کے ساتھ بھی جب اپنا کام کر رہے ہیں اگر ایمان کے ساتھ ملیں گے تو دیکھو کیا رنگ لاتے ہیں ۔ ایک جواب تو یہ ہوا دوسرا جواب یہ ہے کہ محبوبیت مطلقہ یعنی من کل الوجوہ (ہر اعتبار سے) میں گفتگو ہے ہر شخص کے نزدیک محبوب بنا دے یہ بجز مومن کامل کے کسی کو نصیب نہیں اگر کوئی کافر کسی خلق حسن کے ساتھ متصف ہے تو وہ بعض کے نزدیک محبوب ہے اور بعض کے نزدیک نہیں بلکہ کفر یا بعض اخلاق ذمیمہ کی وجہ سے مبغوض ہے

اب شبہ جاتا رہا اور اگر حسن وغیرہ علت ہو تو اس کا جواب اوپر آچکا ہے اب ایک اعتراض اور باقی رہا وہ یہ ہے کہ ایک مومن جو شریعت کا پورا پابند ہے اس کا کسی سے مقدمہ ہو اور اُس میں وہ مومن ہی حق پر ہے تب بھی فریق مقابل اس کو نظر غیظ سے دیکھتا ہے نظر محبت سے ہرگز نہیں دیکھتا اب وہ خاصہ کہاں گیا جواب اس کا یہ ہے کہ ہر شے کی خاصیت کے ظاہر ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس کا کوئی معارض نہ ہو اگر معارض ہو تو یوں کہیں گے کہ شے اپنے اثر سے مختلف ہو گئی تو یہاں یہ معارض ہے کہ اس کو اس کے زعم میں ضرر پہنچ رہا ہے اِس لئے یہ شخص اگر نظر غیظ سے دیکھے تو ہمارے دعوے کے کچھ منافی نہیں ہے ہاں عام طور سے دیکھو کہ دوسرے لوگ کس نظر سے دیکھتے ہیں سو یقینی بات ہے کہ ایسے موقع پر عام طور پر سب یہی چاہا کرتے ہیں کہ خدا کرے یہ جیت جاوے اِسی طرح اگر غیر مومن اگر مظلوم ہو تو سب کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی فتح ہو اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ کفر سبب مودۃ کا ہے یہاں اس کی مظلومیت اس کی مبغوضیت کے معارض ہو رہی ہے درحقیقت وہ مبغوض ہی ہے۔ پس خلاصہ یہ ہوا کہ محبوبیت اعمالِ صالحہ اور ایمان میں منحصر ہے اس سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوئی کہ جو اتفاق اور محبوبیت و مودت (دوستی) کو اس راہ سے طلب نہیں کرتے ہے۔ ١٥١

ترسم کہ نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں راہ کہ تو میروی بترکستان است

(میں ڈرتا ہوں اے اعرابی تو کعبہ نہ پہونچے گا اِس لئے جو راستہ تو نے چلنا اختیار کیا ہے وہ ترکستان کا ہے)

چنانچہ جو لوگ اِتفاق اتفاق پکار رہے ہیں اور شریعت کے

کے خلاف کر رہے ہیں اُن کو آج تک تو کامیابی ہوئی نہیں اگر کوئی
کہے کہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ بعض جگہ ان میں اِتفاق ہے صاحبو وہ
اتفاق نہیں اِس لئے کہ آپ کو واضح ہو گیا ہے کہ اتفاق ہوتا ہے
باہمی اُلفت سے اور اُن میں اُلفت نہیں وہ عارضی اتفاق کی
صورت ہے بہت جلدی زائل ہوتا ہے کیونکہ منشاء اِس اِتفاق
کا اتحاد اغراض ہے جب تک ؏ اغراض متحد ہوتے ہیں وہ اتفاق
کا ڈھانچہ قائم رہتا ہے اور جب اغراض میں اختلاف ہوتا ہے
فوراً وہ اتفاق ٹوٹ جاتا ہے بخلاف مومن کے اِتفاق کے
اِس لئے کہ اس کی غرض اور مطلوب ہمیشہ اللہ تعالیٰ و رسول اللہ
صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رضا ہے اور اس میں تزاحم محتمل
ہی نہیں اِس لئے اُس کا اتفاق قائم رہتا ہے دو مومن اگر
جنوب و شمال میں بھی ہیں اور ان میں کوئی سابقہ تعلقات ۳۲
بھی نہیں اُن میں بھی اتفاق ہے پس عقلی طور سے ثابت ہو گیا
کہ اتفاق اگر ہے تو مومنین میں ہے اور اگر باقی رہ سکتا ہے تو
اُنہی کا اِتفاق باقی رہ سکتا ہے اور اسی پر قیاس کر لیجئے
اِس کی ضد کو کہ بغض اور عداوت جب ہو گا خلاف شریعت
کے کرنے سے ہو گا اور بغض اگر قائم رہنے والا ہے تو وہ ان
میں ہی ہے جو ایمان یا عمل صالح میں خلل ڈالتے ہیں پھر بھی
مومنین میں جتنا بھی ایمان ہے اسی مقدار کے موافق ان میں
مودت و محبت لازم ہے پس اگر آپ محبوب بننا چاہتے
ہیں اور اپنے آپس میں اتفاق قائم رکھنا چاہتے ہیں تو خدا تعالےٰ

؏ اِس کا ظہور جب کسی غیر قوم سے مخالفت ہو۔ ۱۲ جامع

(باقی آئندہ انشاء اللہ تعالےٰ)

ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کیجئے ، ورنہ مبغوضیت کے لئے تیار ہو جایئے۔ لیکن خدا کے لئے ایمان اور عمل صالح کو اس نیت سے نہ کیجئے کہ ہم محبوب بنیں ، بلکہ قصد تو اطاعت کا حق کا ہونا چاہئے۔

ہاں اس پر یہ ثمرہ بھی مرتب ہو جاتا ہے جیسے جب خانہ کعبہ کا ارادہ ہو تو بمبئی کی سیر کا ارادہ نہ کرو۔ نیت تو ہونا چاہئے حج کی ہاں راستہ میں بمبئی بھی آوے گی اور سیر بھی کرلوگے۔

اور یہاں سے یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ بعض لوگ جو نماز کی حکمت یا حج کی حکمت یہ بیان کیا کرتے ہیں کہ نماز سے صفائی حاصل ہوتی ہے ، اور جماعت کی حکمت یہ کہتے ہیں کہ پانچ وقت جب محلہ کے مسلمان ملیں گے تو آپس میں اتفاق ہوگا اور جمعہ میں شہر کے مسلمانوں میں اتفاق ہوگا۔ اور حج میں تمام عالم کے مسلمانوں میں اتحاد ہوگا میری تقریر کا اُن کی تقریر سے متحد ہونے کا شبہ نہ کیا جاوے کہ وہ بھی ان اعمالِ صالحہ کو مورثِ اتفاق بتلاتے ہیں اور یہی میں نے کہا۔ سو اُن کی اور میری تقریر میں بہت بڑا فرق ہے۔

ان کی غرض تو یہ ہے کہ مقاصد بالاصلیہ ان احکام کے یہی اتحاد و اتفاق ہیں اور میرا مقصود یہ ہے کہ موضوع لہٗ اصلی تو ان طاعات کا قرب الٰہی ہے اور خدا تعالیٰ کا راضی کرنا۔ ہاں جو ثمرہ اُن پر بلا قصد مرتب ہو جاتا ہے وہ یہ بھی ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ گو ان کے لئے یہ اعمال موضوع نہیں۔ پس میری تقریر کو ان کی تقریر کے ہمرنگ ہرگز نہ سمجھا جاوے۔

الحاصل اتفاق کا اتباع شریعت میں اور نا اتفاق کا شریعت کے خلاف کرنے میں منحصر ہونا ثابت ہوگیا۔ اور جس طرح سے اس تقریر سے اتفاق کے اسباب معلوم ہوگئے جن کا حاصل اطاعت حق ہے اسی طرح اس سے نا اتفاقی کے بھی اسباب معلوم ہوگئے ہونگے۔ کہ معصیت حق ہے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعاء کیجئے کہ توفیق عمل کی عطا فرماویں۔ آمین ثم آمین۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً

رواہ البخاری

وعظ مسمّٰی بہ

حقیقتِ احسان

منجملہ ارشادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

"مکتبہ تھانوی"، دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وعظ مسمّٰی بہ

"مواعظِ اشرفیہ"

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

حَامِداً وَّ مُصَلِّیاً وَّ مُسَلِّماً۔ اَمَّا بَعْدُ واضح ہو کہ حضرت زبدۃ العارفین عمدۃ الواعظین مقتدانا مرشدنا مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جو جو وعظ کانپور میں قلمبند ہوئے ہیں منجملہ ان کے یہ ایک بہت بڑا معرکہ کا وعظ ہے جو اکثر ۴ دینی اور دنیوی نصائح و منافع پر مشتمل ہے۔ اور اس کا نام مواعظِ اشرفیہ قرار پایا ہے۔ جو جو صاحب اس سے منتفع ہوں اس میں تمام سعی کرنیوالوں کے لئے دعائے خیر فرماتے رہیں۔

وعظ ششم جو اشرف العلماء سراج الواعظین حضرت مولانا حاجی حافظ شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ۱۷ ربیع الاول سنہ ۲۳ھ روز جمعہ دو گھنٹہ بیس منٹ تک بمقام جامع مسجد کانپور فرمایا۔ دعاء مانگ کر اس خطبۂ ماثورہ کو پڑھ کر وعظ شروع فرمایا:۔

وعظ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ

رَسُوْلَہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَسَلَّمَ۔

اَمَّا بَعْدُ۔ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَلْاِحْسَانُ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ۔

یہ ایک حدیث شریف کا ٹکڑا ہے اور جواب ہے ایک سوال کا جو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے خدمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہو کر کیا تھا۔ جس کا پورا قصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اس حالت میں کہ ہم ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک موجود تھے۔ ناگاہ ہم پر ایک ایسا شخص ظاہر ہوا جس کے کپڑے نہایت سفید اور بال بہت کالے تھے، اس پر سفر کا نشان تو معلوم نہیں ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھڑ کر بادب بیٹھ گیا۔ اور پوچھنے لگا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وآلہ وسلم اسلام کس کو کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعمال اسلامیہ کو ذکر فرمایا۔ کہ خدا کے سوا ۵
کسی کو معبود نہ جاننا، اور محمدؐ کے رسول اللہ ہونے کی تصدیق کرنا، نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا، رمضان شریف کے روزے رکھنا، اور استطاعت ہونے پر بیت اللہ کا حج ادا کرنا۔

یہ سنکر اس شخص نے آپؐ کی تصدیق کی کہ آپ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتا بھی ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے پھر اس شخص نے سوال کیا کہ ایمان کس کو کہتے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عقائد اسلامیہ کو ارشاد فرمایا۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تصدیق کرنا اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا۔ اور قیامت کے دن پر ایمان لانا اور تقدیر کے خیر و شر پر ایمان لانا۔ اس شخص نے اس کو بھی سنکر کہا کہ سچ ارشاد فرماتے ہیں۔

پھر اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ احسان کس کو کہتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ "یعنی احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت کرو کہ گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگر

نہیں دیکھتے ہو تم اس کو پس وہ تحقیق تم کو دیکھتا ہے "

اس سوال کے علاوہ اس شخص نے اور اور سوال بھی کئے تھے جو پوری حدیث میں مذکور ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سب کے جواب بخوبی ارشاد فرماتے تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ اس شخص کے چلے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اے عمرؓ تم جانتے بھی ہو کہ یہ سوال کرنے والے کون تھے، میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ اَللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ[له] "اللہ اور اسکا رسول صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ جاننے والے ہیں " حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا فَاِنَّہٗ جِبْرَئِیْلُ اَتَاکُمْ یُعَلِّمُکُمْ دِیْنَکُمْ " یعنی یہ سوال کرنیوالے جبرئیل علیہ السلام تھے، تمھارے پاس اس لئے آئے تھے کہ تم کو تمھارا دین سکھلادیں "

وجہ اس آنے کی یہ ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو زیادہ پوچھ گچھ سے منع فرمایا تھا۔ لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ امور دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ جو پیش آئیں یا واقع ہوں ان کا پوچھنا تو ضروری ہے اس سے ممانعت نہ تھی۔ دوسرے یہ کہ محض فرضی صورتیں نکال نکال کر احتیاطاً پوچھ رکھنا اگرچہ ابھی نہ ہوئی ہوں، جیسے اب بھی ایک تو عام لوگ ہیں ان کو تو یہ چاہئے کہ جب کوئی امر پیش آوے اس وقت دریافت کرلیں یا ایسا کوئی امر جس کا واقع ہونا غالب ہو وہ دریافت کرلیں۔ یہ نہیں کہ فرضی بعید الوقوع صورتیں دریافت کرکر کے پریشان کریں۔ البتہ طلباء جن کا کام ہے مسائل کی تحقیق کرنا وہ اگر دریافت کریں تو مضائقہ نہیں اور بعض لوگوں کی جو یہ عادت ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ مولویوں کو دق کرنے کے لئے ایسی باتیں پوچھا کرتے ہیں جن کی کوئی صورت نہیں۔ یہ سب بیکار و فضول ہے۔ صحابہؓ کو جو سوال سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا تھا اس کی کئی وجہیں ہیں۔

اوّل تو یہ کہ ایسی فرضی باتیں دریافت کرنا خلاف ادب تھا۔ دوسری یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضروری بات خود ہی بیان فرمادیا کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے

[له] ادب کی وجہ سے صحابہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم سے اس طرح کہدیا کرتے تھے ۱۲

اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (مجھ کو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے) یہ تو آپؐ کا فرضِ منصبی ہی تھا، اور خود آپؐ اعلیٰ درجہ کی شفقت رکھتے تھے۔ ضرورتوں کو سمجھتے تھے آپ بغیر بتلا دیا کرتے تھے۔ ایسی حالت میں سوالات کرتے رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی جس طرح اگر کوئی طبیب حاذق شفیق ہو اس نے نبض دیکھ لی۔ ضروری امور دریافت کر کے تشخیص کر لی نسخہ لکھ دیا، پرہیز بتلا دیا۔ سارے ضروری امور سے خود ہی غایت شفقت کے باعث سے آگاہ کر دیا تو پھر ایسے شخص سے دریافت کرنے کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔

تیسری یہ بھی مصلحت ہو سکتی ہے کہ بعض منافقین گھڑ گھڑ کر صورتیں پوچھا کرتے تھے اور غرض اس سے محض دق کرنا ہوتا تھا اس لئے مسلمانوں کو بھی منع کر دیا گیا تاکہ منافقین کو آڑ نہ ملے۔ چنانچہ خود مجھ[1] سے ایک شخص نے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ دو شخص چلے جاتے تھے اور ان کے ہمراہ ایک عورت تھی، ایک شخص اس کا خاوند تھا دوسرا اس کا بھائی۔ اتفاق سے چوروں نے دونوں کو قتل کر ڈالا سر تن سے جدا ہو گیا۔ وہ رونے لگی۔ اتفاق سے ایک درویش کامل کا اُدھر سے گذر ہوا۔ وہ واقعہ دریافت کرنے کے بعد اس عورت سے کہا کہ دونوں کے سر دھڑ سے لگا دے۔ اس نے خاوند کے دھڑ کے ساتھ بھائی کا سر اور خاوند کا سر بھائی کے دھڑ کے ساتھ لگا دیا۔ انھوں نے دعاء کی دونوں زندہ ہو گئے۔ تو بتلاؤ کہ وہ عورت کس کو ملے گی! میں نے کہہ دیا کہ جناب مجھے نہیں معلوم۔ ایسی باتوں کے پوچھنے سے غرض یہ ہوتی ہے کہ یہ جواب نہ دے سکیں گے تو ہم کہیں گے کہ ہم نے ایسی بات پوچھی کہ اس کا جواب عالم سے بھی نہیں آیا یا ہم ایسے بڑے ہیں ایسے ذہین ہیں اور بس۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ بعض بات آسان ہوتی ہے اور پوچھنے کی بدولت دشوار ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب حج فرض ہوا تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ اَفِیْ کُلِّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللہِ (کیا ہر سال میں ہر بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) آپؐ نے کچھ دیر سکوت فرمایا۔ پھر ارشاد کیا کہ اگر میں

[1] یعنی مولانا اشرف علی صاحب علیہ الرحمۃ سے ۱۲

نَعَمْ (ہاں) کہہ دیتا تو ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور تم لوگوں سے نہ ہو سکتا مصیبت میں پڑ جاتے۔ اور آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ذَرُوْنِیْ مَا تَرَکْتُکُمْ (یعنی مجھ کو چھوڑے رکھو جو مناسب سمجھوں گا اس سے تم کو آگاہ کر دیا کروں گا تم کھود کھود کر نہ پوچھا کرو) یہ وہ مصلحتیں تھیں جو ممانعت سوال کے باعث تھیں اور اس وقت میرے خیال میں آئیں ممکن ہے کہ اور اور بھی مصلحتیں ہوں۔

بہر حال ممانعت سوال کی وجہ سے صحابہؓ دریافت کرنے میں بہت احتیاط کرتے تھے۔ بعض امور دین اُن کے خیال میں آتے ہوں گے لیکن اس میں تردّد ہو جاتا ہو گا کہ نہ معلوم یہ باتیں ضروری ہیں یا نہیں، ان کا پوچھنا بے ادبی تو نہیں ہے اسلئے ڈر کے مارے نہ پوچھ سکتے تھے۔ یہ بھی ایک مرتبہ ہے جو حاصل کرنے کے قابل ہے کہ جو دل میں کھٹکے اُسے ترک کر دیا جاوے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے دَعْ مَا یُرِیْبُکَ اِلٰی مَا لَا یُرِیْبُکَ (یعنی جس چیز سے تمہیں کھٹکا ہو اسے چھوڑ کر ایسی چیز اختیار ہو جس سے کھٹکا نہ ہو) پس خدائے تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو اس لئے بھیجا تھا ۸
کہ وہ پوچھیں گے تو صحابہؓ کو بہت سی دین کی باتیں معلوم ہو جائیں گی۔

اب یہ سمجھئے کہ میں نے اس وقت اس لئے احسان کے بیان کو اختیار کیا ہے کہ اس کی بڑی ضرورت ہے، لوگ اس سے بالکل غافل ہو رہے ہیں۔ احسان کے متعارف معنی جو اردو میں مشہور ہیں وہ یہاں مراد نہیں۔ یہ عربی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں اچھا کرنا، اور یہاں مراد ہے عبادت کو اچھا کرنا۔ اب دیکھئے اوّل تو لوگ عبادت ہی سے بھاگتے ہیں اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔ دنیوی کاموں میں دن رات لگے رہتے ہیں، ذرا ذرا سی باتوں کے لئے مشقت اُٹھاتے ہیں۔ خصوصاً اگر تھوڑی سی دنیا کی امید ہوتی ہے تو بڑی بڑی محنتیں کرتے ہیں اور مشقتیں اٹھانے میں دریغ نہیں کرتے لیکن عبادت میں کوتاہی کرتے ہیں اور دنیا طلبی میں سرگرم ہیں۔ اس پر طرّہ یہ ہے کہ اس کی (یعنی دنیا طلبی کی)، اور ترغیب دی جاتی ہے، جلسے ہوتے ہیں، کمیٹیاں قائم ہوتی ہیں اور کوشش ہے کہ خوب مال و دولت کی حرص بڑھ جاوے، ہوا و ہوس

میں ترقی ہو، دن رات ترقی ترقی کی پکار ہو رہی ہے۔ ہوا و ہوس کا نام بدل کر ترقی رکھ دیا ہے۔ آخر اس سے مطلب کیا ہے، یہی نا کہ مال خوب حاصل کیا جاوے، مکان بھی نہایت عالیشان ہو، کپڑے بھی نہایت قیمتی ہوں، اسباب بھی بیش بہا ہو، غرضیکہ دنیب دی عیش و سامان کے جمع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی جاوے۔ چاہے دین رہے یا جاوے۔

لیکن یہ بھی معلوم رہے کہ ترقی کا مسئلہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے۔ آپ اس کا فیصلہ بھی فرما چکے ہیں جس کا نہایت معتبر اور سچا واقعہ اس طرح پر ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ بالاخانہ پر تشریف رکھتے تھے۔ وہاں صرف ایک چٹائی بچھی ہوئی تھی، آپ اس پر لیٹے ہوئے تھے، جسم شریف پر چٹائی کے نشان بن گئے تھے۔ اور سرہانے کی جانب کچھ کچے چمڑے لٹک رہے تھے۔ پائنتی کی جانب کچھ ببول کی پتیاں پڑی ہوئی تھیں تاکہ ان چمڑوں کو ان سے دباغت دے لیا جاوے۔

9 حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس حالت کو دیکھکر رونے لگے، آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے، اور عرض کرنے لگے کہ یا حضرت صلی اللہ علیہ وسلم قیصر اور کسریٰ وغیرہ جو شرک اور کفر میں مبتلا ہیں خدا کی عبادت نہیں کرتے وہ تو چین و آرام سے گذاریں اور آپ اس تنگی کی حالت بسر کریں۔ آپ دعاء فرمائیے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی امت کو وسعت عنایت کریں۔

یہ حضرت عمرؓ کا ادب تھا کہ امت کی وسعت کے لئے دعاء کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا اَفِیْ شَکٍّ اَنْتَ یَا ابْنَ الْخَطَّابِ (کیا اے عمرؓ بن الخطاب تم اب تک شک ہی میں پڑے ہوئے ہو) اُولٰٓئِکَ عُجِّلَتْ لَهُمْ طَیِّبَاتُهُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا۔ (ان کو لذیذ چیزیں دنیا میں جلدی سے مل گئی ہیں) مطلب یہ ہے کہ تمام آرام و آرائش کفار کو دنیا ہی میں مل گیا ہے آخرت میں وہ محروم رہیں گے۔ اب ہم لوگوں کے لئے خدائے تعالیٰ نے آخرت میں ذخیرہ کر رکھا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کے افلاس اور تنگدستی

کی شکایت کی تھی اور چاہا تھا کہ دعاء کر دی جائے اور فراغت اور وسعت ہو جائے۔
مال و دولت بافراط مل جائے، خوب ہی آسایش و آرام سے گذرنے لگے۔ دوسرے
لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ ترقی کی درخواست کی تھی اور چاہا تھا کہ جیسے کفار کو مال و دولت
میں ترقی حاصل ہے اسی طرح مسلمان بھی ترقی کریں۔ آپ نے فیصلہ فرمادیا کہ انکو یہاں
مل گیا ہے ہم کو قیامت میں ملے گا۔ ایک یہ بات لوگ بہت کہا کرتے ہیں کہ اس
زمانہ میں ترقی کی ضرورت نہ تھی کیونکہ دوسری قومیں بھی ترقی یافتہ نہ تھیں، اب
ضرورت ہے۔ ان سے دریافت کرنا چاہیے کہ کیا اس زمانہ میں کسی نے ترقی نہ کی تھی
قیصر اور کسریٰ کی عیش پرستیاں اور عیش و نشاط کے سامان دیکھیے، تاریخ پڑھیے۔
مال و دولت میں عیش میں آرام میں تزک و احتشام میں کیا تھا جو اُن کے پاس نہ تھا
عمدہ سے عمدہ سامانِ عشرت مہیا تھے۔ اور مسلمانوں کے پاس وہ سامان اور اسباب
نہ تھا۔ پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی ارشاد فرمایا جو اوپر مذکور ہوا۔
۱۰ تو اب کیا باقی رہ گیا۔ بلکہ اگر غور کیا جائے تو صحابہؓ کو افراطِ دنیا سے کچھ ضرر بھی نہ
ہوسکتا تھا، کیونکہ قلب نہایت قوی رکھتے تھے۔ خدا کی اطاعت فرمانبرداری
ان کے دلوں میں رگ و ریشوں میں گھسی ہوئی تھی۔ دل و جان سے احکامِ شرعیہ
کی تعمیل پر آمادہ اور سرگرم رہتے تھے۔ خدا کے خوف سے ہر وقت ترساں و لرزاں
رہا کرتے تھے۔

اور یہ بھی یقینی بات ہے کہ اگر کسی شخص کو سانپ کے پکڑنے اور اس کے زہر
کے اثر نہ کرنے کا منتر یاد کرا دیا گیا ہو تو وہ سانپ کو بے کھٹکے پکڑ سکتا ہے۔ اگرچہ
سانپ اس کے ہاتھ میں ہو۔ مگر وہ ہر طرح سے مطمئن رہتا ہے۔ دنیا اگرچہ سانپ کے
مثل تھی لیکن صحابہؓ کو اس کا منتر یاد تھا۔ یعنی ذکر اللہ۔ خدا کی یاد سے غافل نہ ہوتے
تھے۔ ایسی حالت میں اُن کو دنیا سے کیا ضرر ہوسکتا تھا۔ بخلاف ہم لوگوں کے کہ
منتر تو یاد نہیں اور سانپ کو پکڑنا چاہتے ہیں۔ آخر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ ہلاکت۔ جہاں
ذرا اس نے ڈسا اور خاتمہ ہوا۔

صحابہ کرامؓ کی وہ حالت تھی کہ اس کا کچھ کہنا ہی نہیں۔ حضرت عمرؓ جن کی دیانت، حق پرستی، قوتِ ایمان ایسے تمام اخلاق و صفات موافقین کیا مخالفین کے نزدیک بھی مسلم الثبوت ہیں ذرا ان کی حالت دیکھئے خلافت کا تو زمانہ اور کپڑے پیوند لگے پہنے ہوئے چکنا سالن تک نہ کھاتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ آپ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ نے آپ کی دعوت کی تھی، اور گوشت پکا رکھا تھا، جس میں گھی بھی کسیقدر ڈالا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے وقت حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا میاں تم نے تو ایک سالن کے ساتھ دوسرا سالن بھی جمع کر دیا ہے۔ یعنی ایک تو گھی اس سے بھی روٹی کھائی جاسکتی ہے دوسرا گوشت کہ اس سے بھی روٹی کھا سکتے ہیں، اسقدر اسراف اور تکلف کی ضرورت ہی کیا تھی۔

حضرت عبداللہؓ نے عرض کیا کہ میں نے اس میں مقدار معین سے زیادہ صرف نہیں کیا ہے۔ جس قدر خرچ لے کر گوشت خریدنے نکلا تھا اسیقدر میں بوجہ معمولی گوشت ہونے کے تھوڑے کا گوشت لے لیا اور باقی کا گھی خرید لیا۔ آپ نے فرمایا ۱۱
کہ یہ بات صحیح ہے مگر میرے نزدیک غیر مناسب ہے۔ الغرض وہ کھانا آپ نے نہیں کھایا۔ چھپر رہنے کو تھا، کوئی بڑا محل نہ تھا، دربان نہ تھے، پہرہ چوکی نہ تھا۔ اپنے کام کو خود کر لیا کرتے تھے، راتوں کو گشت لگاتے تھے، لوگوں کی حالت دریافت کرتے تھے، ضعفاء اور مساکین کی خبر لیتے تھے، پھر بھی آپ کی کیفیت اور حالت کو دیکھئے بغور ملاحظہ کیجئے کہ حضرت حذیفہؓ جن کا صاحب اسرار لقب ہے اس وجہ سے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو منافقین کے نام بتلادیئے تھے تو حضرت عمرؓ ان سے قسم دے دے کر پوچھا کرتے تھے کہ سچ بتلانا کہیں میرا نام تو ان لوگوں میں نہیں ہے۔ جب تقویٰ اور خشیت کی یہ حالت ہو تو پھر اگر ایسے لوگوں کے پاس دنیا ہوتی تو ان کو کیا ضرر ہوسکتا تھا۔

اب بتلایئے کہ اس زمانہ کے مناسب کیوں ترقی نہ تھی اور اس زمانہ کے مناسب کیوں ہے؟ کیا اس زمانہ میں کچھ ترقی نہیں ہوئی تھی؟ اکاسرہ اور قیاصرہ کے پاس

اس چیز کی کمی تھی، اور صحابہؓ کو ضرر کا احتمال بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے اور تمام چیزوں میں بھی یہی عذر کیا کرتے ہیں۔ نماز کی نسبت کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں ضرورت تھی جب نئے نئے مسلمان ہوئے تھے، کیونکہ بُت پرستی حال ہی میں چھوڑی تھی اس لئے ضرورت تھی کہ خدا کی عبادت کریں تاکہ بُتوں کا خیال دل سے نکل جائے۔ روزہ رکھنا کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں غصہ وغیرہ کا غلبہ تھا قوت کا زور تھا، اس لئے ضرورت تھی کہ روزہ رکھیں تاکہ ضعف آجائے وہ سختی جاتی رہے۔ اب خود ہی لوگ ضعیف اور مہذب ہو رہے ہیں اب کیا ضرورت ہے۔ آہا حج چونکہ وہ تجارت کا ذریعہ تھا، تجارت کے لئے لوگ جمع ہوا کرتے تھے حج کی بھی بیخ لگا دی۔ آگے رہی زکوٰۃ سو وہ تو ان کی ترقی کے بالکل خلاف ہے۔ تصویروں کے متعلق کہتے ہیں کہ پہلے لوگ بُت پرستی کے عادی ہو رہے تھے، اس کو اچھا سمجھتے تھے، اسلام لانے کے بعد بھی خیال کچھ نہ کچھ دل میں بسا ہوا تھا، اگر تصویر وغیرہ رکھتے تو خیال سابق میں زیادتی ہوتی اور بُت پرستی کا ذریعہ ہو جاتا اب کیا ضرورت ہے۔ اب تو بعض بُت پرست ۱۲
قومیں بھی اس کی قباحت کو تسلیم کرتی جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں میں تو پشتہا پشت سے بُت پرستی کا نام بھی نہیں، اب تصویر سے کیا حرج ہے۔

غرض طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا ہے جو کچھ جی میں آتا ہے لکھتے ہیں۔ یہی کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اسلام ہی کی ضرورت نہیں، چلو چھٹی ہوئی۔ دعویٰ تو اسلام کا اور اس کے تمام احکام سے انکار۔ ہر ہر چیز کے ساتھ پھیر پھار کر دین سے انکار کرنا چاہتے ہیں۔ صاف صاف انکار کرنا تو ذرا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بُرا کہیں گے۔ اگرچہ بعض نے ہمت کر کے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے۔ ایک کمیٹی لکھنؤ میں ہوئی تھی ترقی کے ذرائع اور موانع سوچنے کے متعلق۔ وہاں ایک صاحب نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ مذہب ہی مانع ترقی ہے۔ ایک صاحب نے وہیں خوب ہی جواب دیا اور کہا واقعی یہی بات ہے، لیکن مذہب کی طرح قانون بھی مانع ترقی ہے، جب مذہب سے دستبردار ہو تو قانون کو بھی چھوڑ دو۔

چوری ڈکیتی کی جائے تو بہت سا مال جمع ہو سکتا ہے۔ اگر موقع ہو اور کسی کے قتل سے مال
ہاتھ آتا ہو تو اس سے دریغ کرنے کی کیا وجہ؟ غضب کو بھی جی چاہتا ہوگا، پھر کون مانع
ہے یہی نا کہ قانون ان امور کے مرتکب ہونے والے کو سزا ہوتی ہے۔ ذرا خلاف قانون
کریں تو خبر لیجائے۔ انصاف تو یہ تھا کہ اگر مذہب سے دستبردار ہوتے تھے تو قانون کو
بھی چھوڑ دیتے اس کی بھی پرواہ نہ کرتے۔ غضب ہے حکام ظاہری کے قانون کا تو اتنا
خوف اور حاکم حقیقی اور تمام جہان کے بادشاہ یعنی اللہ تعالیٰ کے قانون میں یہ دلیری
اور گستاخی، عجب اندھیر ہو رہا ہے۔ دنیا میں انہماک ہے ایسی حالت میں عبادت کی
بھلا کہاں نوبت آسکتی ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو توفیق ہوئی بھی تو محض صورت عبادت
کی ہوتی ہے معنی عبادت کے بالکل نہیں ہوتے۔ معنی سے یہ عبادت محض معرّا
ہوتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے بادام تو ہو اور اس میں مغز نہ ہو، صرف
پوست ہی پوست ہو۔ یا جیسے دیوالی کی مورتیں اور تصویریں ہوتی ہیں کہ یہ کمہار ہے
یہ لوہار وغیرہ ہے سب ہی کچھ ہے لیکن اصلیت نہیں۔ نام کو آدمی لیکن آدمیت ۱۳
نہیں۔ نام تو ہاتھی ہے اور کام کچھ نہیں کر سکتا۔ کسی چیز کو اٹھانا تو درکنار وہ خود خریدنے
اور بنانے والے پر لدا لدا پھرتا ہے۔ اگر کوئی حاکم کسی سے کہے کہ ہمیں ایک آدمی کی
ضرورت ہے اور کوئی شخص آدمی کی تصویر پیش کر دے کہ حضور اس کو نوکری میں قبول
فرمادیں، تو کیا وہ حاکم اس بیوقوف نادان سے ناراض نہ ہوگا، اور اس کی بیہودہ
حرکت کو سخت بے ادبی اور گستاخی نہ سمجھے گا، سزا نہ دیگا؟ تو پھر بڑے غضب
کی بات ہے کہ ہم خدا کے سامنے اس ... کر آدمی یعنی صورتِ آدمی کے مثل صورتِ
عبادت کو بے خوف و خطر پیش کریں اور گستاخی کا ذرا خیال بھی نہ آئے۔ عبادت
بے جان تو پیش کریں اور شرماویں نہیں۔

اب سمجھنا چاہیئے کہ عبادت کی رُوح اور جان کیا ہے، اس کی حقیقت اور صورت
میں کیا فرق ہے۔ کونسی چیز ہے جس کے ہونے سے صورتِ عبادت اصلی عبادت
ہو جاتی ہے، اس کا کیا درجہ ہے۔ پس اس حدیث سے دیکھئے عبادت کے اچھا کرنے

حقیقت بتلائی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی چیز کے اچھا ہوتے کے کیا معنی ہوا کرتے ہیں۔ یعنی اس میں کوئی نقصان نہ ہو کوئی کسر نہ رہے جیسی چاہئے ویسی ہی ہو۔ غرض ہر چیز کا اچھا ہونا اس کے مناسب جدا طریق سے ہوتا ہے۔ مثلاً اچھی روٹی وہ ہو گی جس کا مادہ بھی اچھا صورت بھی اچھی ہو جو اس کا ثمرہ ہے وہ بھی اچھا ہو۔ اسی طرح یوں کہا کرتے ہیں کہ فلاں طالب علم امتحان میں اچھا رہا، یعنی اس کی تقریر بھی اچھی تھی، تحریر بھی، طرز بیان بھی خوب صاف تھا، مطلب واضح تھا، حشو و زوائد سے کلام مبرا تھا، یعنی تمام ضروریات مجتمع تھیں۔ کوئی حالت ایسی نہ تھی جس کی کمی رہ گئی ہو۔ اسی پر قیاس کر کے عبادت کے اچھا ہونے کے معنی بھی سمجھئے۔ کہ جتنے امور کی عبادت میں ضرورت ہے جو جو چیزیں واجب الاجتماع ہیں سب کی سب اس میں پائی جاویں' کسی چیز کی کسر نہ رہے۔

یہ تو اجمالاً تھا، اب اس کی تفصیل کہ وہ کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جن سے
۱۴ عبادت اچھی ہوتی ہے شرائع میں غور کرنے سے معلوم ہو سکتی ہیں۔ لوگ عموماً غلطی کرتے ہیں اور صرف صورت اور نقل عبادت ہی کو عبادت سمجھتے ہیں۔ یعنی فقہاء نے جو ضبط کر دیا ہے قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ، قومہ وغیرہ۔ اس میں شک نہیں کہ جو کچھ فقہاء نے لکھا ہے وہ ٹھیک ہے۔ اور جو فقہ کا موضوع تھا اس کے موافق انہوں نے لکھا ہے۔ لیکن یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ تمام امور جن کا عبادت سے تعلق ہے اس میں منحصر ہیں۔ شریعت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے ساتھ اور کچھ بھی ہے۔ اس فقہ کے ساتھ ایک دوسری فقہ یعنی معنی شرع کا بھی اعتبار ہے اس معنوی فقہ کو تصوف کہتے ہیں۔ تصوف کو علیحدہ اور الگ کتابوں میں لکھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فقہ سے خارج ہو جاوے۔ یہ علیحدگی ایسی ہے جیسی فقہ مشہور میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الصلوٰۃ الگ الگ کتابیں ہیں۔ کتاب الصلوٰۃ کے مسائل کتاب الزکوٰۃ میں نہیں ملیں گے اور نہ کتاب الزکوٰۃ کے کتاب الصلوٰۃ میں۔ اس سے کوئی یہ نہیں سمجھتا کہ کتاب الزکوٰۃ یا کتاب الصلوٰۃ فقہ میں داخل نہیں۔ اسی طرح

کتاب التصوف بھی فقہ ہے۔ اگرچہ اس کی کتابیں الگ ہیں۔ اگر کوئی ہدایہ کی ہر ہر کتاب کو الگ الگ چھاپ دے تو کیا کتاب الصلوٰۃ کتاب الزکوٰۃ وغیرہ ہدایہ سے خارج ہو جائیں گی؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اسی طرح توحید، اخلاص یا کبر، تواضع، عجب وغیرہ اخلاقِ حمیدہ اور رذیلہ کے احکام بھی فقہ میں داخل ہیں۔ عموماً لوگ نماز میں قیام، رکوع وغیرہ ہی کو عبادت کی حقیقت سمجھتے ہیں، اور اسی میں عبادت کو محصور جانتے ہیں۔ عوام تو عوام طالب علموں کی بھی شکایت ہے۔ ہم لوگوں کی خود حالت قابلِ افسوس ہے۔ اہلِ علم خود اس کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ میں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کو علم کی تو فکر ہے لیکن عمل کی نہیں۔ بڑا اہتمام اس کا ہوتا ہے کہ ہم ساری کتابیں پوری کرلیں۔ ہدایہ بھی، صدرا بھی، شمس بازغہ بھی، لیکن عمل کرنے کی ذرا بھی پرواہ نہیں قوتِ عملیہ اس درجہ ضعیف ہو رہی ہے اس درجہ اس میں خلل آگیا ہے اس قدر مختل ہو رہی ہے جس کا حساب نہیں۔ ایسی ایسی خفیف حرکات کرتے ہیں جس سے افسوس ہوتا ہے۔ بہت سے معاصی ہیں کہ ان میں شب و روز مبتلا ہیں، اور ۱۵
خیال بھی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا، کسی کی چیز بلا اجازت اٹھالی، اور جہاں چاہا ڈال دی۔ کسی کی کتاب بلا اجازت لے لی اور ایسی جگہ رکھ دی کہ اسکو نہیں ملتی وہ پریشان ہو رہا ہے۔ کسی سے کسی اچھے کام کا وعدہ کیا اور اس کے پورا کرنیکی اصلا فکر نہیں۔ اس طرح سینکڑوں قصے ہیں کہاں تک بیان کئے جاویں۔

لیکن باوجود ان سب باتوں کے پھر بھی ان کے علم و فضل میں شک نہیں ہوتا، حالانکہ فقط کسی چیز کا جان لینا کوئی ایسا کمال نہیں۔ یوں تو شیطان بھی بہت بڑا عالم ہے۔ بڑے بڑوں کو بہکاتا ہے۔ تفسیر میں وہ ماہر، حدیث میں وہ واقف، فقہ میں وہ کامل۔ کیا ہے جس کو وہ نہیں جانتا۔ اگر زیادہ نہ جانتا ہوتا تو علماء کو بہکا کیسے سکتا؟ جب کوئی شخص کسی فن میں ماہر ہوتا ہے جب ہی تو وہ اپنے سے کم جاننے والے کو دھوکا دے سکتا ہے۔ اس میں (یعنی شیطان میں) اگر کمی ہے تو صرف اسی بات کی ہے کہ اپنے علم پر عمل نہیں کرتا۔ چنانچہ حدیث شریف میں

بھی آیا ہے ایسا علم جو عمل کے لئے نہ ہو جہنم کا ذریعہ ہے۔ اس حدیث میں لیجاری بہ العلماء و لیماری بہ السفہاء (تاکہ فخر کریں ساتھ اس کے علماء اور مناظرہ اور جھگڑا کریں ساتھ اس کے سفہاء) وغیرہ الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ہم لوگ ایسے غافل ہو رہے ہیں کہ اپنی اصلاح کی ذرا فکر نہیں کرتے۔ بعض گو لوگ قصداً گناہ نہیں کرتے لیکن بے پرواہی کی وجہ سے ان سے گناہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی شکایت کے قابل ہیں۔ اگر کوئی ملازم سرکاری بے پروائی کرے اور کام خراب کر دے تو کیا اس سے باز پرس نہ ہوگی؟ لوگوں نے عبادت کا ستّ نکال لیا ہے، مثلاً بظاہر اٹھ بیٹھ لئے اور نماز ادا ہوگئی، خصوصاً اہلِ علم بھی اس کا خیال نہیں کرتے کہ سوائے ظاہری قیام، قعود کے اور بھی کچھ ہے اور وہ ضروری بھی ہے۔ جس قرآن میں قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ (تحقیق ان مسلمانوں نے آخرت میں فلاح پائی جو اپنی نماز میں) ہے اسی میں خَاشِعُوْنَ بھی آیا ہے۔ جب صَلٰوتِهِمْ (اپنی نماز) کے
۱۶ لفظ سے نماز کو مطلوب شرعی سمجھتے ہیں تو کیا وجہ خَاشِعُوْنَ (خشوع کرنیوالے ہیں) سے خشوع کو مطلوب نہیں سمجھتے۔ اسی طرح اور مقامات سے پتہ چلتا ہے کہ خشوع بھی ویسا ہی ہے جیسے قیام و رکوع وغیرہ۔ اس غلطی کو دفع کرنا نہایت ضروری ہے کہ ایک کو تو ضروری سمجھیں اور دوسرے کو نہ سمجھیں، حالانکہ دونوں حکم یکساں ضروری ہیں۔ یہ خشوع ہی ہے جس سے عبادت اچھی ہوتی ہے۔ احسان اسی سے حاصل ہوتا ہے۔

احسان کے متعلق تین چیزیں ہیں اوّل احسان کا ضروری ہونا، دوسرے احسان کی حقیقت، تیسرے تحصیلِ طریقِ احسان۔ اجمالاً اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ احسان خشوع سے حاصل ہوتا ہے اور خشوع کا مطلوب ہونا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الخ (تحقیق مسلمانوں نے فلاح پائی) سے معلوم ہو چکا ہے۔ اب اس کا ضروری ہونا سنئے:۔

خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ

قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ۔

ترجمہ کیا ایمان والوں کے لئے اس بات کا وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی نصیحت کے اور جو دین حق (منجانب اللہ تعالیٰ) نازل ہوا ہے اس کے سامنے جھک جاویں اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاویں جن کو ان کے قبل کتاب (آسمانی) ملی تھی (یعنی یہود و نصاریٰ) پھر (اسی حالت میں) اُن پر زمانہ گذر گیا (اور توبہ نہ کی) پس اُن کے دل سخت ہو گئے۔

یہاں ذکر اللہ میں خشوع کی ضرورت کا بیان ہے۔ اور ذکر اللہ میں ساری عبادتیں آگئیں۔ دیکھو عبادت میں خشوع نہ ہونے پر کیسی وعید ہے۔ شکایت کی ہے۔ اور یہود و نصاریٰ سے تشبیہ دے کر ذکر کیا ہے۔ کہ ایسے نہ بنو۔ اس سے ظاہر ہے کہ ترک خشوع کیسی بُری چیز ہے۔ جس کے باعث سے کفار کے ساتھ آدمی مشابہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کا ثمرہ بیان فرمایا ہے فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ (پس ان کے دل سخت ہو گئے) قساوتِ قلب نہایت بُری چیز ہے۔ قساوت کی نسبت قرآن شریف میں ہے فَوَيْلٌ لِّلْقَاسِيَةِ قُلُوبُهُم مِّن ذِكْرِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (یعنی تباہی اور ۱۷
ھلاکت ہے ان کو جن کے دل خدا کی یاد سے سخت ہو رہے ہیں وہ لوگ کھلی کھلی گمراہی میں پڑے ہیں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں قلب قاسی خدا سے بہت دور ہے، ان سب نصوص سے ثابت ہوا کہ قساوت بُری چیز ہے اور خشوع ضروری ہے۔ لیکن خرابی یہ ہو رہی ہے کہ لوگ خشوع کی حقیقت نہیں سمجھتے اسی وجہ سے اس کی فکر بھی نہیں کرتے۔ جو شخص کسی چیز سے واقف نہ ہوگا وہ اس کو حاصل کیا کرے گا۔ عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خشوع کے یہ معنی ہیں کہ خدا کے سوا کسی کا خیال نہ آوے، ایسی مدہوشی ہو جاوے کہ تیر برچھا کچھ ہی لگے اس کی خبر نہ ہو پس انسان جماد کی طرح بن جاوے آدمیت سے گذر جاوے۔ کوئی پوچھے یہ معنی کہاں لکھے ہیں اور کس نے لکھے ہیں اس کا کچھ جواب نہیں۔ اور واقعی کہیں بھی یہ معنی نہیں لکھے ہیں۔ یہ شبہ کم فہم اور غیر شفیق واعظوں کی بدولت پڑا ہے۔ انھوں نے ایسی حکایتیں بیان کیں جن سے دھوکہ میں پڑ گئے۔ پڑھے لکھے آدمی بھی اس سے ناواقف

ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں ان کے درس میں کوئی تصوف کی کتاب تو ہے نہیں، لیکن عام لوگوں کے سنانے کے لئے موجود ہو گئے۔ امراض قلبی اور امراض باطنی کے علاج کرنے پر آمادہ ہیں، وعظ و نصیحت کرنے پر مستعد۔ حالانکہ خود نہیں سمجھتے تو ایسے شخص کی مثال ہے جس نے نہ طب پڑھی ہے۔ مطب کیا اور علاج کرنے لگا۔ علاج کے لئے پہلے طب پڑھنا ضروری ہے اور پھر مطب کرنا بھی لازمی ہے۔ بغیر اس کے قابلیتِ علاج نہیں آسکتی۔ ایسے ہی مدارس کی نسبت کسی نے کہا ہے ؎

اَیُّهَا الْقَوْمُ الَّذِیْ فِی الْمَدْرَسَةِ ؎ کُلُّ مَا حَصَّلْتُمُوْهُ وَسْوَسَه

؎ علم نبود غیرِ علمِ عاشقی ؎ ما بقی تلبیسِ ابلیسِ شقی

"یعنی اے قوم جو کچھ تم نے مدرسہ علم (لفظی) حاصل کیا وہ وسوسہ تھا علم عاشقی کے علاوہ جو علم بھی ہے وہ ابلیس شقی کی تلبیس ہے"

جس طرح کنز و ہدایہ ضروری ہے ویسے ہی ابو طالب مکی کی قوت القلوب اور امام
۱۸ غزالیؒ کی اربعین اور شیخ شہاب الدینؒ سہروردی کی عوارف کا پڑھنا بھی ضروری
ہے۔ یہ تو گویا طب پڑھنا ہے اور اس کا مطب یہ ہے ؎

قال را بگذار مردِ حال شو ؎ پیش مردِ کاملے پامال شو

"قال کو چھوڑ کر حال پیدا کرو، یہ اس وقت پیدا ہوگا جب کسی اہل اللہ کے قدموں میں جاکر پڑو"

کیسی ناانصافی کی بات ہے کہ جب دس برس علم ظاہری کی تحصیل میں صرف کئے تو دس ماہ تو باطن کی اصلاح میں صرف کرو۔ اور اس کا یہی طریق ہے کہ کسی کامل کی صحبت میں رہو۔ اس کے اخلاق، عادات، عبادات کو دیکھو کہ غصہ کے وقت اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ شہوت کے وقت میں وہ کیسی حالت میں رہتا ہے۔ خوشامد کا اس پر کہاں تک اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح تمام اخلاق کا حال ہے۔ کیونکہ پھر جب کبھی اس کو غصہ آئے گا تو سوچے گا کہ اس کامل کی غصہ کے وقت کیا حالت ہوئی تھی ہم بھی ویسا ہی کریں۔ اس کے اخلاق و عادات پیش نظر

ہو جائیں گے۔ یہ اس کا مطلب ہوا۔ چنانچہ کہا ہے ؎

اے بیخبر بکوش کہ صاحب خبر شوی ؏ تا راہ بیں نباشی کے راہ بر شوی
در مکتبِ حقائق پیشِ ادیبِ عشق ؏ ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

"اے بے خبر کوشش کر کہ صاحب خبر ہو جائے۔ جب تک راہ بیں (رستہ دیکھنے والا) نہ ہوگا راہ بر (راستہ دکھلانے والا) کیسے ہو سکتا ہے۔ اس لئے حقائق کے مدرسہ میں ادیبِ عشق کے سامنے کوشش کر کہ ایک نہ ایک روز باپ (یعنی مصلح) بن جائے گا"

ساری خرابی انہی ناعاقبت اندیش واعظوں کی ڈالی ہوئی ہے۔ ایسی ایسی حکایتیں بیان کرتے ہیں جس سے لوگ سمجھتے ہیں کہ عمل کرنا بہت ہی دشوار ہے۔ اور جو کچھ کرتے ہیں ایسی حکایتوں کی وجہ سے اس کو بھی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ مثلاً طلبِ حلال کے متعلق یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص حلال روزی کی طلب میں نکلے، ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے جس کے پاس حلال روزی کی خبر لگی تھی۔ اس
نے جواب دیا کہ تھی تو میرے پاس لیکن چند روز سے حلال نہیں رہی۔ اتفاق سے ۱۹
میرا بَیل دوسرے کے کھیت میں چلا گیا دوسرے کھیت کی مٹی اس کے پَیر میں لگ کر میرے کھیت میں آگری۔ اس لئے اب روزی حلال نہیں رہی" محض مستبعد بات ہے۔ اوّل تو یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کے بَیل کھیت ہی میں ہمیشہ رہا کریں۔ باہر نکلنے کی نوبت ہی نہ آئے۔ اور اگر ہو بھی تو اس سے کہیں حرمت آتی ہے۔ اور تمام امور سے قطع نظر کر کے اگر اس کی کوئی توجیہ بھی ہو تو اس بزرگ کی خاص حالت ہوگی عام تکلیف تو نہیں دی جا سکتی۔

اب ظاہر ہے کہ اس حکایت کو سُن کر یہ خیال پیدا ہوگا کہ حلال روزی تو ممکن نہیں، اس لئے پھر خوب دل کھول کر حرام ہی کمایا جاوے۔ جس طرح ملے، چوری سے، دغا بازی سے، رشوت سے، سُود سے سب لینا چاہئے۔ اور اس طرح تباہ ہو جاتے ہیں۔ ایسی باتیں بیان کرنے سے ان کی غرض ہوتی ہے کہ وعظ میں ذرا رنگ آجاوے۔ نئی بات ہونے کی وجہ سے لوگوں کو پسند آئے، خوب

واہ واہ ہو، شریعت میں ہرگز ایسی تنگی نہیں ہے۔ ایسی تنگی کی تو ایسی مثال ہے جیسے کہ ایک بخیل صاحب کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ بے چراغ بڑھائے ہوئے نماز پڑھنے کو مسجد میں چل کھڑے ہوئے، راستے میں یاد آیا کہ یہ فضول خرچی ہے۔ لوٹ کر چراغ گل کرنے آئے۔ لونڈی نے پوچھا خیر تو ہے، حضور کیسے لوٹ آئے؟ اتنی فضول خرچی ہوئی کہ آپ کے یہاں تک لوٹ کر آنے میں جوتہ گھس گیا ہوگا۔ بڑے خوش ہوئے اور جواب دیا کہ چراغ جلتا ہوا چھوڑ گیا تھا اس کے بجھانے کو آیا ہوں۔ اُس نے جواب دیا کہ میں نے پہلے ہی گل کر دیا تھا۔ وہ بولے شاباش کہ تو بڑی محتاط ہے۔ اور تجھے فکر ہے کہ کوئی فضول خرچی نہ ہو حتّٰی کہ میرے جوتہ گھسنے کا بھی خیال ہے لیکن سمجھ لے کہ میں نے لوٹتے وقت جوتہ اُتار کر بغل میں دبا لیا تھا۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ شریعت ایسی مہمل باتوں سے پاک ہے ایسی تنگی اس میں کہاں؟ بلکہ جب حلال صورتیں بکثرت بتلائی جائیں گی توفیق عمل کی ہوگی، حلال روزی کی فکر کریں گے۔ سمجھ لو کہ ہدایہ و کنز وغیرہ میں جو جو چیزیں حلال لکھی ہیں وہ بلاشبہ حلال ہیں اس میں ذرا شک نہیں۔ بات کیا ہے کہ اہلِ باطن جو مغلوب الحال تھے یہ اُن کی حکایتیں ہیں، عوام کے سامنے اُن کو بیان کر دیا۔ یہ تو وہی مثل ہو گئی کہ ایک شخص کو ہیضہ کا عارضہ تھا، حکیم صاحب نے اُن کے لئے وہی خشکہ تجویز فرمایا۔ اور ایک شخص کو ضعفِ دماغ تھا اس کے لئے مقوی چیزیں گوشت، یخنی، دودھ، قورمہ تجویز کیا۔ اب اگر ہیضہ والا سُن کر اس پر عمل کرنے لگے تباہ نہیں ہوگا تو کیا ہوگا مرے گا۔ ۲۰

اسی طرح جو حالات بیان کئے تھے سچ تھے، لیکن یہ کس کے تھے اہلِ باطن کے لئے، یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات بیان کر ہی دی جائے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی خشوع ہے اور یہی بڑا کمال ہے کہ تیر بھی لگے تو خبر نہ ہو۔ حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ نماز کو ذرا طویل کروں لیکن کسی بچے کے رونے کی

آواز سنتا ہوں تو مختصر کر دیتا ہوں کہ اس کی ماں پریشان ہو جائے گی۔"

اب بتلائیے کہ یہ کمال کی حالت ہے یا وہ۔ تیر کی خبر نہ ہونا بھی ایک حالت ہے جسے استغراق و محویت کہتے ہیں۔ لیکن وہ خشوع نہیں ہے۔ نماز کے معنی اگر کوئی بیان کرے کہ صبح صادق سے لیکر غروب آفتاب تک نہ کھانا تو یہ غلط ہے اگرچہ نماز بھی کوئی چیز ہے لیکن یہ نماز نہیں ہے اسی طرح یہ حالت ہے تو ضرور لیکن یہ خشوع نہیں ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے کہ ایک مرتبہ مقدمہ پیش ہوا، مدعا علیہ نے گواہی پر جرح کی کہ نماز نہیں پڑھتا۔ اس نے کہا واہ صاحب میں تو حج بھی کر آیا ہوں۔ قاضی نے اس سے پوچھا کہ اچھا بتلا زمزم کیا چیز ہے اور عرفات کیا چیز ہے؟ اس نے جواب دیا کہ زمزم ایک بوڑھا آدمی ہے اور عرفات ایک باغ ہے۔ جس میں وہ بوڑھا بیٹھا ہوا ہے۔ قاضی نے کہا کہ کیا غلط کہتا ہے فضول بکتا ہے ہم نے خود حج کیا ہے زمزم ایک کنویں کا نام ہے، اور
عرفات ایک جنگل ہے۔ اس نے کہا جب میں گیا تھا اس وقت تو یہی تھا آپ ۲۱
کے جانے کے وقت بدل گیا ہوگا۔

خشوع کے معنی یہ کہنا کہ کچھ خبر نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے کاذب نے کنویں اور عرفات کی حقیقت بیان کی تھی۔ ہاں اس کا انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ بھی ایک حالت ہے۔ جیسے عرفات و زمزم کا وجود واقعی تھا، گو جو وہ کہتا تھا نہ تھا گو بعض لوگ سرے سے اس حالت کا بھی انکار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ امر خلاف فطرت ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص نماز پڑھتا ہو اس طرح کہ اس کو تیر نکلنے کی خبر نہ ہو۔ اس منکر کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی مادر زاد عنین لذت جماع کا انکار کرے، یا کوئی مادر زاد اندھا کہے کہ لوگ جس کو دیکھنا کہتے ہیں وہ کوئی چیز نہیں ہے۔ حالانکہ ایسے واقعات ثابت ہوئے ہیں۔ امام مالکؒ حدیث شریف کا بیان کر رہے تھے ان کی آستین میں کہیں سے کمبخت ایک بچھو گھس گیا تھا وہ ڈنک مارتا تھا جس کے صدمہ سے ان کا چہرہ متغیر ہو جاتا تھا لیکن اُف

نہیں کرتے تھے اور برابر حدیث شریف کا بیان کرتے رہے۔ حتیٰ کہ گیارہ بار اس نے نیش زنی کی۔ جب گھر میں آکر کرتہ اُتارا تو کرتے میں خادم نے بچھو کو دیکھکر عرض کیا کہ آپ نے اس وقت کیوں نہیں اظہار فرمایا۔ جواب دیا کہ مجھے شرم آئی کہ حدیث شریف کے وقت دوسری طرف متوجہ ہوں ،

لیکن باوجود اس کے خشوع کے یہ معنی نہیں کہ دوسرا خیال نہ آوے۔ جو شخص خشوع کی حقیقت نہ سمجھے گا سخت غلطی میں مبتلا ہوگا۔ سمجھے گا کہ دوسرا خیال تو رک سکتا نہیں اور بندہ خشوع کا ہے مکلف اس لئے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) میں شک کرنے لگے۔ ایسی حکایتوں سے یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔

اب چاہئے کہ خشوع کی حقیقت کو خوب سمجھ لیجئے۔ پہلے لغت کے موافق اس کے معنی بیان کئے جاتے ہیں پھر شرعیات سے اس کی تائید کردیجائے گی۔

۲۲ اس سے معلوم ہوجائے گا کہ خشوع کیا چیز ہے۔ خشوع کے معنی ہیں دَب جانا پست ہوجانا ، یعنی سکون جیسا کہ اس آیت سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنَّكَ تَرَی الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْھَا الْمَآءَ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ

"یعنی منجملہ اس کی (قدرت اور توحید کی) نشانیوں کے ایک یہ ہے کہ (اے مخاطب) تو زمین کو دیکھ رہا ہے کہ دبی دبائی پڑی ہے۔ پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ اُبھرتی ہے"

چونکہ اھْتَزَّتْ وَرَبَتْ سے خَاشِعَۃً کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اہتزاز اور اُبھرنے میں حرکت ہے تو خاشعۃ کے معنی سکون اور پستی والی کے ہوں گے اور مقابلہ سے ثابت کرنے کی چنداں ضرورت نہیں خود لغت شاہد ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ہر شے کا حرکت و سکون جداگانہ ہوتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ ہاتھ چل رہا ہے تو اس کے معنی ہلنے جلنے اور نقلِ مکانی کے ہوں گے۔ اور اگر کہا جائے کہ فلانے کی طبیعت خوب چلتی ہے تو یہاں یہ معنی نہیں مراد ہوں گے بلکہ یہاں اور معنی

ہوں گے یعنی فکر کرنا اور سوچنا۔ جب یہ معلوم ہوگیا تو اب سنئے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کو دو قسم کی چیزیں عنایت فرمائی ہیں ظاہر اور باطن، یا یوں کہو کہ جوارح اور قلب۔ پس کمال خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ جوارح بھی ساکن رہیں اور قلب بھی۔ لیکن دونوں کا سکون جدا جدا ہے۔ جوارح کا سکون تو یہ ہے کہ اِدھر اُدھر دیکھے نہیں ہاتھ پیر نہ ہلائے اور اس کے مقابلات کا نام حرکت ہوگا۔ اور قلب کا سکون اس کی حرکت کے مقابل ہے۔ حرکت تو یہ ہے کہ خیال کرنا، تصور کرنا، فکر کرنا یعنی سوچنا، اور سکون اس کا عدم ہے۔ اور ظاہر ہے کہ فکر کرنا اور سوچنا فعل اختیاری ہے اور قدرت اور اختیار ضدین سے متعلق ہوتا ہے۔ پس جب یہ حرکت اختیاری ہے تو اس کے مقابل سکون بھی یعنی سوچنا اختیاری ہوگا۔ اور آدمی اختیاری ہی چیزوں میں مکلف ہوتا ہے۔ لہٰذا خشوع کے معنی یہ ہوں گے کہ اپنے اختیار سے دوسرا خیال نہ لانا یہ نہیں کہ دوسرے خیال کا دل میں
۲۳ نہ آنا۔ یہ دونوں چیزیں الگ الگ ہیں۔ خیال کا آنا تو اختیاری نہیں ہے۔ اور خیال کا لانا اختیاری ہے۔

پس خشوع کے یہ معنی ہوئے کہ اپنے اختیار سے دوسرے خیالات دل میں نہ لاوے۔ رہا اگر کوئی خیال بلا اختیار آوے تو وہ خشوع کے منافی نہیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض صحابہؓ نے پوچھا کہ میرے دل میں ایسے ایسے خیال آتے ہیں کہ جل کر کوئلہ ہوجانا اُن سے آسان معلوم ہوتا ہے آپؐ نے فرمایا اَوَجَدْتُمُوْہُ قَالُوْا نَعَمْ قَالَ ذٰلِكَ صَرِیْحُ الْاِیْمَانِ، "یعنی آپؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے اس کو پایا ہے۔ یعنی کیا ایسے خیالات تمھیں آتے ہیں؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہاں۔ آپؐ نے فرمایا یہ تو صریح ایمان ہے" اور کیوں نہ ہو، چور تو وہیں آتا ہے جہاں مال ہو متاع ہو۔ اسی طرح شیطان وہیں آتا ہے جہاں متاعِ ایمان ہو۔ مولانا علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

دیو آید سوئے انسان بہر شر ✽ پیش تو ناید کہ از دیوے بتر

"شیطان تو انسان کی طرف شر کے لئے آتا ہے تیرے پاس نہ آئے گا کہ شیطان سے بدتر ہے"

شیطان بڑا استاد ہے اپنا وقت فضول ضائع نہیں کرتا، جو خود شیطان بنگیا ہے اس کو بہکانے کی کوشش نہیں کرتا۔ ہاں جس میں کچھ ایمان باقی ہے اسی کی فکر میں رہتا ہے۔ اپنی دشمن کا پکا ہے۔ ایمان داروں ہی کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ ہم لوگوں کو تو اس سے خاص صفت میں سبق حاصل کرنا چاہیے تھا۔

ایک چور نہایت نامی تھا، ہمیشہ چوری کیا کرتا تھا۔ آخر ایک مرتبہ سولی دیدی گئی۔ حضرت جنیدؒ نے دوڑ کر اس کے پیر چوم لئے۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ اس کی استقامت قابل تعریف ہے۔ اگر ہم خدا کی اطاعت میں ایسی استقامت کریں تو ہمارے مدارج کا کہیں ٹھکانا ہی نہ رہے

اپنے کام میں لگا رہنا چاہیئے اور وسوسہ اور خیالات کی کچھ پرواہ نہ کرنا چاہیئے برے برے خیالات جن پر عمل نہ ہو مگر طبیعت منقبض ہو، اُلجھے، بزرگوں ، ر
۲۲ کو آتے ہیں۔ فاسقوں کو ایسے خیالات نہیں آتے۔ اور ان وساوس سے پریشانی کا باعث یہی ہے کہ کسی طبیب قلب کی صحبت نہیں نصیب ہوئی۔ اگر کوئی جاننے والا مل جاتا تو کہدیتا کہ اگر وسوسے آتے ہیں تو آنے دو کچھ پرواہ نہ کرو۔ قلب کی حالت تو شاہی سڑک کی سی ہے۔ کہ اس پر حاکم، رئیس اور ادنیٰ چمار دونوں گذرتے چلے جاتے ہیں ؎

بحر تلخ و بحر شیریں ہمعناں ٭ درمیان شاں برزخ لایبغیان

"بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر جاری ہیں، مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے
جس کی وجہ سے باہم مخلط اور مشتبہ نہیں ہونے پاتے"

شیطان کی حالت کتے کی سی ہے۔ کتا بھونکا کرے اور التفات نہ کیا جائے تو آپ چپ ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کو دفع کرنا چاہے تو اور زیادہ غصہ کر کر کے بھونکتا ہے۔ اسی طرح وساوس شیطانی کی طرف التفات ہی نہ کرے۔ کیونکہ شیطان سے جو دبتا ہے اور اس کا خیال رکھتا ہے

اس کے سامنے آموجود ہوتا ہے۔ وسوسے پر جو غمگین ہوگا وہ سخت پریشان ہوگا۔ بلکہ جب وسوسہ آوے تو اور خوش ہونا چاہئے کہ الحمد للہ دولت ایمان موجود ہے اگر آدمی میں قوّت توکّل اور اعتماد علی اللہ (اللہ پر بھروسہ) کی صفت ہو تو ایک شیطان کیا اگر لاکھ شیطان ہوں تو کچھ نہیں بنا سکتے۔ ہاں قصداً خیال کا لانا بیشک منافی خشوع اور حضور قلب کے ہے۔

اب اِس تقریر سے ذہن نشین ہوگیا ہوگا کہ خشوع اور حضورِ قلب اختیاری ہے اور نہایت آسان ہے لیکن تاہم جب تک طریق نہ معلوم ہو اور اس پر عمل نہ کیا جاوے کامیابی نہیں ہوسکتی۔ کپڑا سینا آسان ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کیسے کپڑا سیتے ہیں، لیکن سینا جب ہی آسکتا ہے کہ کسی درزی سے طریق سیکھا جاوے اور اُس پر عمل کیا جاوے۔ اسی طرح حضورِ قلب کا حال ہے، اُس طریقے کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ مسئلہ عقلی ہے کہ اَلنَّفْسُ
لَا تَتَوَجَّہُ اِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ اٰنٍ وَّاحِدٍ (نفس ایک آن میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ۲۵
ہوسکتا) یعنی پوری توجہ ایک ہی چیز کی طرف ہوا کرتی ہے۔ ایک آن میں اگر دو چیزیں خیال میں ہوں تو سمجھنا چاہئے کہ دونوں میں سے کسی کی طرف بھی پوری توجہ نہیں۔ یا دو چیزیں نظر آتی ہوں تو توجہ کامل دونوں میں سے کسی کی طرف بھی نہیں۔ جس چیز کو آدمی گھورتا ہے اسی کی طرف دیکھنے میں توجہ ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ طریقہ یہی ہے کہ ایک خیال رکھیں تو دوسرے خیالات خود دفع ہوجائیں گے اور کوئی خیال نہ آئے گا۔ کیونکہ اگر یہ کوشش کی جاوے کہ ایک ایک کرکے خیالات دفع کئے جاویں تو سخت دشواری پیش آوے گی اور دفع ہوجانا ناممکن ہوجاوے گا۔ کیونکہ اوّل تو دیکھی ہوئی چیزیں انسان کی بکثرت ہیں۔ پھر علاوہ اس کے انسانی قوّتِ متفکرہ یا متخیلہ انکو ترکیب دے دیکر بے تعداد فرضی صورتیں اختراع کیا کرتی ہے۔ مثلاً آپ نے دو سر کا آدمی کبھی نہیں دیکھا ہوگا لیکن یہ قوّتِ متفکرہ ایک دھڑ اور دو سر کو جوڑ کر

خیالی صورت بنا کر سامنے کھڑا کر دیتی ہے۔ اور انسان کو معلوم ہونے لگتا ہے کہ دوسر کا آدمی ایسا ہو سکتا ہے۔

بہر حال ایک ایک خیال کو دفع کرنا بہت دشوار اور بڑی ہی مصیبت
ہے۔ کبھی بھول کر بھی خیالات دفع کرنے کے پیچھے مت پڑو۔ پس اس کا طریقہ
یہی ہے کہ کسی نیک چیز کی طرف دھیان لگا دو، اس دھیان کے باندھتے ہی
سارے خیالات خود بخود ہٹ جائیں گے۔ بعض سالکین نے ناواقفی کے باعث
ہجوم وساوس سے پریشان ہو کر خودکشی کر لی ہے۔ یہ کیوں، اس لئے کہ یا تو
ان کو شیخ نہیں ملا یا شیخ کی تعلیم کی قدر نہیں کی۔ شیخ، جس پر یہ امور
گذرے ہوتے ہیں جانتا ہے اور بتلا سکتا ہے۔ ایسی پریشانی کی حالت کو
قبض کہتے ہیں۔ اس میں عبادت میں بھی مزہ نہیں آتا اور جی گھٹتا ہے، اور
جی گھٹنے کی وجہ یہ ہے کہ لذت نہیں ملتی۔ ہم لوگوں کی عجیب حالت ہے۔
عبادت بھی ایسی کرنا چاہتے ہیں جس میں حظِ نفسانی ملے۔ عبادت بھی چاہتے ۲۶
ہیں تو مزیدار۔ حالانکہ مزہ مطلوب نہیں ہے بلکہ تعبد مطلوب ہے۔ البتہ
مزے سے عبادت سہل ہو جاتی ہے۔ غرض طالب کی یہ حالت ہونا چاہیے

خوشا وقت شوریدگانِ غمش ۔۔ اگر ریش بینند و گر مرہمش
اس کے غم کے پریشان لوگوں کا اچھا وقت ہے اگر زخم دیکھتے ہیں اور اگر اس پر مرہم رکھتے ہیں
گدایانے از بادشاہی نفور ۔۔ بامیدش اندر گدائی صبور
ایسے فقیر کہ بادشاہی سے نفرت کرنیوالے اور اس کی امید پر فقیری میں قناعت کرنے والے
دمادم شرابِ الم درکشند ۔۔ اگر تلخ بینند دم درکشند
ہردم رنج کی شراب پیتے ہیں اور جب اس میں رنج کی کڑواہٹ دیکھتے ہیں تو خاموش ہو رہتے ہیں
اگر مردِ عشقی کمِ خویش گیر ۔۔ وگرنہ رہِ عافیت پیش گیر
اگر عاشق ہے تو محبوب کے عشق میں آپکو فنا کر، ورنہ اپنی آسائش کی راہ اختیار کر
مترس[1] از محبت کہ خاکت کند ۔۔ کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند

[1] مت ڈر کہ محبت تجھکو خاک کر دیگی اس لئے کہ اگر تجھ کو ہلاک کریگی تو بقائے جاودانی تجھ کو عطا کرے گی۔

ہرگز نمیرد آں کہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جس کو عشق سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کو لذت قرب علیٰ وجہ الکمال حاصل ہوجاتی ہے اس لئے اسکو مُردہ نہ کہنا چاہیئے۔

باغباں گر پنج روزے صحبتِ گل بایدش بر جفائے خارِ ہجراں صبر بلبل بایدش
اے دل اندر بندِ زلفش از پریشانی منال مُرغ زیرک چوں بدام افتد تحمل بایدش

باغبان کو اگر صحبتِ گُل کی خواہش ہے تو اس کو بلبل کی طرح ہجر کے کانٹوں کی اذیت پر صبر کرنا چاہیئے اے دل محبوب کی زلف کے پھندے میں پھنس کر پریشانی سے گریہ وزاری مت کر۔ سمجھدار پرند جب جال میں پھنس جاتا ہے تو اس کو صبر و تحمل چاہیئے۔

ناخوشِ تو خوش بود بر جانِ من دل فدائے یارِ دل رنجانِ من

محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو وہ طبیعت کو ناخوش ہی کیوں نہ ہو وہ میری جان پر خوش اور پسندیدہ ہے میں اپنے یار پر جو میری جان کو رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں۔

پس زبونِ وسوسہ باشی دلا گر طرب را باز دانی از بلا ۲۷

پس بُرا وسوسہ ہوا اے دل اگر خوشی کو بلا سے جدا جانے۔

ہمت والوں کا تو یہ قول ہے

روز ہا گر رفت گو رو پاک نیست تو بماں اے آنکہ چوں تو پاک نیست

"ایام تلف ہونے پر حسرت نہ کرنا چاہیئے اگر گئے بلا سے، عشق جو اصلی دولت ہے اور سب خرابیوں سے پاک وصاف ہے اس کا ہونا کافی ہے"

تم لذت کی کچھ فکر نہ کرو، کام کئے جاؤ، لذت نہ آئے بلا سے نہ آئے۔ حضورِ قلب کا طریق کلی طور پر تو معلوم ہوگیا۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ کون سی شے ہے جس میں دل لگایا جائے۔ اس کے دو طریق ہیں، ایک تو مشہور ہے جو لوگوں نے اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ (اللہ تعالیٰ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ تم کو دیکھ ہی رہا ہے) سے سمجھا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہ سمجھنا صحیح نہیں۔ اور اس کا بیان آگے آویگا۔

دوسرا طریق (جو استاد علیہ الرحمۃ مولانا محمد یعقوب صاحب نے بتلایا تھا۔ اور الحمد للہ کہ ایک حدیث سے بھی میری سمجھ میں آ گیا اور تجربہ بھی اس کے مفید ہونے پر شاہد ہے) یہ ہے کہ ایک حدیث میں آیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دو رکعت نماز پڑھے اس طرح کہ مُقْبِلًا عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهٖ یعنی حال یہ ہو کہ اپنے دل سے نماز پر متوجہ رہے۔ اب نماز دیکھنا چاہئے کہ نام کس کا ہے۔ سو اس میں بعض چیزیں تو مختلف ہیں ان کی طرف توجہ کرنے سے مبتدی کو یکسوئی حاصل ہونا ذرا تکلف ہے۔ اس لئے دیکھنا چاہئے کہ اس میں ایسی کونسی چیز ہے جو نماز میں برابر ہوتی رہتی ہے۔ سو وہ ذکر اللہ ہے کہ ابتداء سے انتہا تک پایا جاتا ہے۔

تو اب نماز میں متوجہ ہونے کی صورت اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ ذکر اللہ کی طرف برابر توجہ رہے۔ یعنی جو کچھ پڑھا جاوے سوچ سوچ کر پڑھا جائے۔ پہلے
۲۸ سوچ لو پھر زبان سے نکالو، یہ نہیں کہ ریل گاڑی ہے جہاں ڈرائیور نے کل چلادی اور گاڑی اُڑی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اسٹیشن آ گیا اور ڈرائیور نے روکی تو تھمی۔ اس طرح سے اپنے اندر کی ریل گاڑی کو اگر ہم چلائیں گے تو لڑے گی۔ اس کا کیا نتیجہ ہوگا کہ سارے قوائے محمودہ کے مسافر پاش پاش ہو جائیں گے اور زمین باطل میں ہلچل پڑ جائے گی۔ دنیاوی ریل کے لڑنے کا حال تو اسی وقت آنکھ سے نظر آ جاتا ہے ہماری اندرونی ریل کے لڑنے کا حال قیامت میں کھلے گا۔

بہر حال چاہئے کہ ہر ہر لفظ کو سوچ سوچ کر پڑھو۔ اگرچہ اس میں دو چار دن مشقت معلوم ہو گی جی گھبرائے گا، کیونکہ جی روکنا پڑے گا، لیکن جہاں ہم اپنے دنیاوی ذرا ذرا سے کاموں میں مشقت اٹھاتے ہیں خدا کے لئے ذرا سی مشقت اٹھانا گوارا کریں، جب دنیا بے مشقت نہیں ملتی تو خدا کو چاہتے ہو کہ بے مشقت ہی مل جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کے قربان جائیے کیسے چھوٹے چھوٹے لفظوں میں اتنے بڑے بڑے دشوار کلام کو آسان کر کے بتلادیا

اور کیوں نہ ہو عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَعْلِیْمِیْ وَ اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ (اللہ تعالیٰ نے مجھکو تعلیم دی پس بہترین ہے میری تعلیم، اور اللہ تعالیٰ نے مجھکو ادب سکھایا پس بہترین ہے میری تادیب)۔ یہ خدا کی تعلیم ہے ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

آپ کا فرمان اللہ کا فرمان ہے، اگرچہ ایک اللہ کے بندے (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے منہ سے ادا ہوا ہے۔

؎ درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ہمامیگویم

پس پردہ مجھے طوطی کی طرح بٹھادیا ہے، مجھے جو حکم استاد ازل سے ملا تھا وہی کہہ رہا ہوں۔

اس کے علاوہ ایک مشہور طریق حضورِ قلب کا وہ ہے جو حدیث اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ الخ سے لوگوں نے سمجھا ہے۔ یعنی عبادت کرتے وقت یہ خیال کرے کہ میں خدا کو دیکھ رہا ہوں، اور اگر یہ نہ ہو تو یہ سمجھے کہ خدا مجھ کو دیکھ رہا ہے۔ پس گویا دو طریق متقابل ہیں لیکن میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ اول تو نقلوں کے بھی خلاف ہے۔ کیونکہ سوال حقیقتِ احسان سے ہے نہ طریقِ تحصیلِ احسان سے ہے۔ چنانچہ جو جواب دیا گیا ہے اس میں احسان کی حقیقت بتلائی ہے نہ کہ طریق۔ چنانچہ اس کے قبل بھی اسلام اور ایمان کی حقیقت ہی سے سوال وجواب کا ہونا اس کا اور بھی مؤید ہے، دوسرے تجربہ بھی شاہد ہے کہ تصور رویت حق حضورِ قلب کے لئے عموماً اور خصوصاً مبتدی کے لئے بالکل ناکافی ہے۔ کیونکہ طبیعت پریشان ہوتی ہے کہ خدا کو کیسا سمجھوں۔ اور ایک صورت سمجھ میں آتی ہے پھر اس کا دفع کرتا ہے۔ اسی طرح پریشانی میں مبتلا رہتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جس چیز کو کبھی دیکھا نہیں اس کا تصور کیسے جم سکتا ہے۔ البتہ منتہی کو خدا کے دیکھنے کا تصور بے کیف ذوقی طور پر میسر ہو جاتا ہے۔ اور طریقہ عام ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اگر مضاف محذوف مان کر (یعنی طریقہ ان الخ) سے طریق ہی قرار دیا جاوے تو تقابل ٹھیک نہیں ہوتا۔ کیونکہ کَاَنَّکَ تَرَاہُ 29

کے بعد یہ کہا ہے کہ اگر تم اسے دیکھتے نہ ہو تو بیشک وہ تمھیں دیکھتا ہے۔ سو یہ مضمون جملہ اُولیٰ کے ساتھ جمع ہو رہا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ اگر تم ایسی عبادت نہ کر سکو کہ گویا اسے دیکھتے ہو (تو یہ سمجھو) کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ بہر حال یہ طریق الفاظ حدیث اور تجربہ دونوں کے خلاف ہے۔ پس اس حدیث میں حقیقتِ احسان کا بیان ہے، طریق مذکور نہیں۔ رہا حدیث کے معنی کیا ہیں تو اس کا سمجھنا ایک مقدمہ پر موقوف ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کام کر رہا ہو اور اسے معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہمارا مالک اور حاکم دیکھ رہا ہے تو وہ شخص کام بالکل ٹھیک کرنے لگے گا۔ اور احتیاط رکھے گا کہ کوئی خرابی نہ ہونے پائے۔ اور اگر کہیں خود حاکم کو دیکھ لیا تب تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے کام کو خوب اچھی طرح انجام دے گا۔ چنانچہ طالب علموں ہی کو دیکھ لیجئے کہ اُستاد کی عدم موجودگی میں آپس میں بیٹھتے ہیں تو ظرافت اور ہنسی کی باتوں میں بھی
۳۰ باک نہیں ہوتا۔ دل کھول کر ایک دوسرے سے بولتے ہیں، کہیں پیر پھیلائے ہیں، کہیں کوئی شعر پڑھ رہے ہیں۔ اور جہاں کسی نے دیکھ لیا کہ مولوی صاحب دیکھ رہے ہیں فوراً مؤدب ہو کر بیٹھ گئے اور خاموشی اختیار کر لی۔ اور کہیں اپنی نظر استاد پر پڑ گئی تب تو ادب کا ٹھکانا ہی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ حاکم کی نظر کے سامنے ہونے کے وقت کام خوب عمدگی سے ہوتا ہے، تو مطلب اس حدیث کا یہ ہوا کہ خدا کی ایسے حُسن و خوبی سے عبادت کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو یعنی اگر فرضاً تم خدا کو دیکھتے تو سوچو اس وقت تمھاری عبادت کس طرح کی ہوتی۔ اب بھی اسی حالت کے مشابہ تمھاری عبادت ہونا چاہیئے) اس لئے کہ اگر تم اسے نہ بھی دیکھتے ہو تو کیا ہوا وہ تمھیں دیکھ رہا ہے (یہ اس لئے بڑھایا کہ پہلے جملے سے یہ سوال ہو سکتا تھا کہ جب واقع میں ہم نہیں دیکھتے تو اس طرح کی تحسین عبادت کس طرح ممکن ہے، اس کا جواب اس سے مفہوم ہو گیا کہ دیکھنے والے کی تحسین کے لئے حق تعالیٰ کی رویت کا تعلق بھی کافی ہے)۔ غرض

فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ (پس اگر تم اس کو نہیں دیکھتے) میں فائے تعقیب نہ لیجائے، بلکہ فائے علت قرار دی جائے، یہاں تک تو آپ کو خشوع کی حقیقت بھی معلوم ہوگئی۔ اس کا ضروری ہونا بھی ثابت ہوگیا۔ طریقہ سے بھی واقفیت حاصل ہوچکی۔

اب خاتمہ کے طور پر ایک امر اور بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس خشوع کے پیدا کرنے کا وقت کونسا ہے۔ آیا ہر وقت خشوع ہی کے اہتمام میں رہیں یا اس کا کوئی خاص وقت ہے تو اب سنئے کہ **ایک خشوع تو مستحب ہے اور دوسرا واجب ہے**۔ مستحب تو یہ ہے کہ ہر وقت یہی حالت استحضار کی قلب پر غالب رہے۔ لیکن یہ ہر شخص کے لئے نہیں ہے۔ صرف اسی کو جائز ہے جسکی ایسی حالت نہ ہو کہ نہ تو خود اس کی ضروریات میں مخل ہو، نہ کسی دوسرے کی حق تلفی کا باعث ہو ورنہ تباہی کی نوبت آجائے گی۔ مستحب کے لئے واجبات ترک ہونے لگیں گے، بجائے ثواب کے اُلٹا وبال ہوجائے گا۔ مثلاً اگر کسی کی

۳۱ بی بی آٹے کے لئے پیسے دے کہ آٹا لے آؤ بچے بھُوکے ہورہے ہیں اور وہ لگے رہیں خشوع حاصل کرنے میں جس کی وجہ سے بچے بھوکے مریں، تو ایسا خشوع موجبِ قرب نہیں ہوسکتا۔ خدا سے دوری کا باعث ہوگا۔ حکایت ہے کہ ایک ولایتی صاحب کسی مسجد میں ٹھیرے تھے۔ جب رات کو تہجد پڑھنے کھڑے ہوئے تو دیکھا کہ ایک مسافر جو وہاں سورہا تھا خرّاٹے لے رہا ہے۔ آپ نے اس کو کئی دفعہ تو اٹھا اٹھا کر بٹھا دیا اور کہا کہ تم کس طرح سوتے ہو ہمارے خشوع میں خلل پڑتا ہے۔ وہ بیچارہ تھکا ہوا تھا پھر سوگیا۔ آپ کو جو غصہ آیا نکال چھُرا اس کا کام تمام کردیا۔ اچھا خشوع حاصل کیا کہ بیچارے کی جان ہی لے ڈالی۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ انھوں نے اپنی بی بی بچّوں کو تباہ کررکھا ہے۔ اور غلطی میں مبتلا ہیں، دائمی حضورِ قلب اور خشوع کے پیچھے حق تلفیاں کرتے ہیں۔ یہ امر نہایت نازیبا ہے۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوگئی کہ کسی نے نوکر سے کہا کہ ہم بھوکے ہیں کھانا لاؤ، وہ بجائے کھانے کے دوڑ کر برف سے ٹھنڈا

کر کے پانی لے آیا اور اسی پر اصرار کرتا ہے کہ نہیں جناب پانی ہی پیجئے بہت ٹھنڈا ہے، کھانا نہ کھایئے تو ایسے نوکر سے مالک خوش ہوگا یا ناراض۔ جیسے ایک صاحب کا نوکر تھا اس سے مانگا خلال وہ اٹھا لایا بانس، مانگا لحاف وہ اٹھا لایا گھوڑے کا چارجامہ اور اصرار کرتا ہے کہ لو اسی کو اوڑھ لو۔ یہ گستاخی ہے یا نہیں۔ یہ ساری خرابیاں خودرائی کی ہیں، خودرائی بھی بڑی مضر شے ہے ؎

فکرِ خود و رائے خود در عالم رندی نیست　　کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

آپنی رائے اور فکر کو راہِ سلوک میں کچھ دخل نہیں ہے۔ اس طریق میں خود بینی اور خود رائی کفر ہے"

مناسب تو یہ ہے کہ ایسا ہو جائے ؎

چوں قلم در پنجۂ تقلیب رب

یہاں تو جو حکم ہو وہ ہی کرو یہی کمال ہے۔ مثلاً اگر کسی کو پائخانہ زور سے لگا ہو اور وہ نماز پڑھنا چاہے تو بُرا ہے۔ چاہئے کہ پہلے فارغ ہو جائے پھر نماز پڑھے۔ اگر کوئی اصرار کرے اور کہنے لگے کہ صاحب نماز پڑھنا تو عبادت ہے اور پیشاب پائخانہ تو نجاست کا کام ہے میں تو نماز ہی پڑھوں گا، تو وہ بیجا کرتا ہے۔ اس طرح نماز کا بھی ستیاناس کرے گا۔ ۴۲

خلاصہ یہ کہ اس مرتبہ خشوع کا اہتمام اس کے لئے ہے جس سے اسکے باعث نہ تو کسی کا حق تلف ہو، نہ دین کا ضرر ہو اور نہ کسی کو دنیا کا ضرر پہونچے۔ دین کے ضرر کی صورت یہ ہے کہ کوئی طالب علم ہے کہ رات کو تو خشوع پیدا کرتا رہے، مطالعہ دیکھا نہیں۔ صبح کو جب سبق پڑھنے بیٹھے تو کچھ سمجھ میں آتا نہیں آخر بے دلی سے پڑھ پڑھ کر کتابیں تمام کیں۔ نہ کچھ آیا نہ گیا۔ علم دین ایسی ضروری چیز سے محروم رہے۔ بلکہ ناقص سے لوگوں کا مقتدا بنکر تباہ کرنا شروع کیا۔ دُنیا کا ضرر یہ کہ بال بچے جن کا نفقہ اس کے ذمہ ہے اس میں کوتاہی ہونے

لگی۔ اسی طرح ترک اسباب ظاہری اگرچہ مستحب ہے لیکن اسی کے لئے جس کی وجہ سے اہل وعیال کے حقوق کے ادا کرنے میں کمی نہ ہونے پائے ورنہ نہیں۔ لیکن ہاں جسے کسی کی فکر نہ ہو اور وہ بھی اس مرتبہ کی تحصیل سے غافل ہے تو بڑا ظلم ہے۔ ایسے ہی شخص کے بارہ میں ہے ؎

ہر آنکو غافل از حق یکزمان است ۔۔۔ دراں دم کافرست اما نہان است

"جو شخص اس سے ایک گھڑی غافل ہے اس گھڑی میں کافر ہے لیکن نہاں ہے"

؎ حضوری گر ہمی خواہی ازو غافل مشو حافظ
متی ما تلق من تہوی دع الدنیا واہملہا

"اگر محبوب حقیقی کے دربار کی حضوری اور قرب
چاہتے ہو تو اس سے غافل مت ہو بلکہ اس کی طرف
متوجہ رہو اور جب اپنے محبوب سے ملاقات کرو،
یعنی اس کی عبادت میں مشغول ہو تو دنیا اور مافیہا
کی طرف التفات مت کرو"

؎ مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار ۔۔۔ بگذارند و خم طرۂ یاری گیرند

"میرے نزدیک مصلحت یہ ہے کہ یار لوگ تمام کاموں کو چھوڑ کر محبوب حقیقی کے تصور میں لگ جائیں"

؎ جملہ اوراق و کتب در نار کن ۔۔۔ سینہ را از نور حق گلزار کن

"تمام اوراق و کتابیں آگ میں جلادو اور سینہ کو اللہ تعالیٰ کے نور سے روشن کرو"

؎ ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو و سمن درا
تو ز غنچہ کم ندمیدۂ دلِ درکشا بچمن درا

"تمہارے اندر خود چمن ہے اس کو پھاڑ کر تمہارے ہاتھ میں ہے جب جی چاہے سیر کرو"

؎ آسمانہاست در ولایتِ جاں ۔۔۔ کارفرمائے آسمانِ جہاں
در رہِ روح پست و بالاہاست ۔۔۔ کوہہائے بلند و صحراہاست

"ولایتِ جان میں بہت سے آسمان ہیں جو آسمانِ دنیا میں کارفرما ہیں۔ رُوح کی راہ میں نشیب و فراز اور بلند پہاڑ و صحرا ہیں"

۵ بردلِ سالک ہزاراں غم بود گرز باغِ دل خلالے کم بود

"سالک کے دل پر ہزاروں غم ہوتے ہیں اگر دل کے باغ میں سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے"

بہتیرے لوگ ہیں کہ ان کو خدا نے اطمینان دیا ہے۔ جائداد کی آمدنی چلی آرہی ہے، گھر سے باہر قدم نکالنا نہیں پڑتا، پھر بھی دن رات فضول مضمون میں مبتلا رہتے ہیں۔ کہیں یہ ذکر ہو رہا ہے کہ جاپان اور روس میں لڑائی ہو رہی ہے، کہیں جاپان کو ڈگری دلا رہے ہیں کہیں روس کو، فکر پڑی ہے کہ کیا ہونا چاہئے۔ گویا ان کے سامنے روس و جاپان کا مقدمہ پیش ہوگا، اور فیصلہ کی ان سے درخواست کی جائے گی۔

دن رات ایسی ہی لایعنی باتوں میں مصروف ہیں۔ یہ اطمینان رکھیں

۲ ان کے پاس یہ مقدمہ نہیں پیش ہونے کا۔ ہاں اپنے اندر کے روس و جاپان کی فکر کریں۔ اس کی بیشک ان سے بازپرس ہوگی کہ تم نے قوتوں کو جا سے صرف کیا ہے یا بے جا؟

ایسے شخص کو تو چاہئے تھا کہ حُبِّ الٰہی میں غرق ہو کر اُن مقربین میں سے ہو جاتا جن کے ساتھ خصوصیت کے معاملات ہوتے ہیں، چنانچہ ایک بزرگ تھے انھوں نے پاؤں پھیلا دیئے تھے، ان پر عتاب ہوا،

مقربوں کے احکام ہی دوسرے ہو جاتے ہیں، جو باتیں عام لوگوں کو جائز ہوتی ہیں اُن کے لئے بے ادبی میں داخل ہیں۔ ع

مقرّباں رابیش بود حیرانی

"مقربین کے لئے حیرانی بہت ہوتی ہے"

اور گو اس میں مشقت شدید ہے لیکن قرب کے ساتھ اگر

اگر مشقت بھی اٹھانا پڑے تو کیا ؎

ہر کجا یوسف رُخے باشد چو ماہ جنّت است آں گرچہ باشد قعرِ چاہ

"جس جگہ محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے، اگرچہ گہرا کنواں کیوں ہو"

؎ چہ خوش وقتے و خرم روزگارے؛
کہ یارے برخورد از وصل یارے؛

"وہ کیا اچھا وقت اور اچھا زمانہ ہے کہ اس
میں کوئی محب اپنے محبوب کے وصل سے متمتع ہو"

حاصل یہ کہ ایک تو وہ تھا جو فارغ محض تھا، اور ایک وہ ہے جس کے متعلق اور بھی خدمتیں ہیں۔ اہل و عیال کا نان و نفقہ واجب ہے، درس و تدریس میں مشغول ہے، وعظ و نصیحت سے لوگوں کو نفع پہنچاتا ہے، اس کی طرف لوگوں کی حاجت ہے، ایسے شخص کو ایسا اہتمام خشوع کہ ہر وقت اسی میں رہے ناجائز ہے۔ اس کے ذمے خشوع واجب حاصل کرنا ہے۔ اس پر واجب ہے کہ عبادت کے وقت خشوع خاص پیدا کرے۔ کیوں کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ جب تک کسی عبادت میں مشغول ہے دنیا کا کوئی کام تو کر ہی نہیں سکتا۔ پھر فائدہ کیا ہوا کہ اس نے اپنا وقت مفت پریشان کیا۔ اس لئے یہ مرتبہ ہر شخص پر واجب ہے۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔ خدا کا کیا ہی انتظام ہے کہ نہ ہر شخص کو صوفی مستغرق بنا دیا اور نہ غفلت کی اجازت عنایت ہوئی۔ ۲

سارے وعظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ پہلے تو مقدمہ بیان ہوا جس میں عوام و خواص سب ہی کی شکایت تھی، کہ خشوع کیوں حاصل نہیں کرتے ۔ اس کے بعد مقصود کا بیان ہوا، وہ تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ اوّل حقیقت، دوسرے فرضیتِ خشوع، تیسرے طریقِ خشوع۔ اس کے بعد خاتمہ مذکور ہوا جس میں درجات خشوع کا ذکر ہوا۔

اب خدا سے دعاء کرنا چاہیے
کہ خدا تعالےٰ توفیق
عنایت فرمائے خشوع سے
بہرہ ور اور کامیاب بنائے!!
آمین ثم آمین

فقط

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً

رواہ البخاری

وعظ

جو مشتمل ہے آیۂ کریمہ

فَاِنَّ الْجَنَّۃَ هِیَ الْمَاْوٰی

منجملہ ارشادات

حکیم الامّت مجدّد الملّت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنّان غفرلہٗ

مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی ۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وعظ جو مشتمل ہے آیہ کریمہ

فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ (اور جو شخص (دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا)

یہ آیت سورۂ وَالنّٰزِعٰتِ کی ہے، اس میں حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے ایک ایسی چیز کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے جس کا ہر شخص خواستگار ہے۔ جس کو ذرا بھی اطلاع اس کی ہو جائے وہ مفتون ہو جائے۔ مگر پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ کسی چیز کی خواہش معتبر جب ہی ہوتی ہے کہ جب اس کے ذرائع میں بھی سعی کی جائے، جو شخص کسی شے کا طالب، مگر اس کے اسباب حاصل نہ کرے اس کو اس شے کا طالب نہیں کہہ سکتے مثلاً کوئی مالدار ہونا

چاہئے۔ مگر جب اس سے کہیں ان علوم کو حاصل کر جو اکتساب روپیہ کے لئے ضروری ہیں۔ پھر کسی واقف کار کی صحبت میں رہ کر ان علوم پر عمل یعنی اکتساب میں مہارت ہو پھر کوئی کام شروع کر اور آمدنی اور خرچ کا حساب رکھ، کہ خرچ آمدنی سے کم رہے، تاکہ کچھ پس انداز ہو اور تھوڑا تھوڑا جمع ہو کر ایک رقم ہو جائے اور تمول حاصل ہو۔ تو کہتا ہے واہ صاحب مجھ سے علوم میں محنت نہیں ہوتی، کسی کے نخرے کیوں اٹھائے جانے لگے۔ پھر پابندی کا بار خواہ مخواہ اپنے اوپر کیوں لوں اور خرچ کو محدود کر کے دل کو کیوں ماروں جتنا جی چاہے گا خرچ کروں گا؛ اس شخص کو تمول کا طالب نہیں کہتے اس کو بو الہوس کہتے ہیں۔

یا کوئی شخص جامع مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرنا چاہتا ہے مگر ان راستوں کو نہیں اختیار کرتا جن سے جامع مسجد میں پہنچے اور قدم نہیں بڑھاتا، تو یہ شخص جامع مسجد میں کیسے پہونچے گا، اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ یہ ثواب کا طالب ہے؟ یا کوئی شخص چاہتا ہے کہ غلہ اس کے پاس آجائے اور جب کہتے ہیں کھیتی کر، زمین میں بیج ڈال، پانی دے، کھیت کی نگہداشت کر، تو کہتا ہے کون کھیتی کرے اور سینچائی کس سے ہو سکتی ہے، کون گھر چھوڑ کر حفاظت کے لئے جنگل میں جا کر پڑے، مجھے تو غلہ چاہئے، یہ شخص احمق ہے اور غلہ کا طالب ہی نہیں ہے۔

اور جیسے کوئی اولاد چاہے اور جب کہا جائے نکاح کر اولاد ہو جاوے گی تو کہتا ہے کون بکھیڑے میں پڑے، نکاح میں ایک رقم صرف کروں پھر نان ونفقہ کا مطالبہ ہو، مکان چاہئے، مہر کی فکر ہو، اور اور طرح طرح کی مصیبتیں کون مول لے، نکاح تو کرنے کا نہیں بس میں تو لڑکا چاہتا ہوں؛ یہ احمق ہی ہے۔ اللہ میاں نے اس فعل خاص کو ولد کے لئے سبب قرار دیا ہے، اس کو اختیار کرو اولاد بھی مل جائے گی۔

اور جیسے کہ کوئی چاہے کہ پیٹ بھر جائے اور جب کہیں کھانا کھاؤ لقمہ کو چباؤ اور نگلو پیٹ بھر جائے گا تو کہتا ہے کہ صاحب میں یہ تو کرنے کا نہیں۔ ظاہر ہے کہ محض احمق ہے۔

توضیح کے لئے یہ کئی مثالیں دی گئیں تاکہ یہ مقدمہ ذہن نشین ہو جائے میں آگے انشاء اللہ ان سے کام لوں گا۔ غرض طالب اگر ذرائع کو اختیار کرے تو طالب ہے ورنہ بوالہوس ہے۔ ایسا آدمی ضرب المثل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے اور سننے والے کہا کرتے ہیں کہ آدمی تو معقول ہیں مگر خبط ہو گیا ہے۔ دیکھئے پڑھ لکھ کر دماغ خراب ہوا ہے، نکاح تو کرتے نہیں اور اولاد کی دھن ہے۔ کیسا افسوس ہے۔ وجہ یہی ہے کہ مسلم ہے کہ اگر سعی نہ کرے ذرائع میں تو پاگل ہے۔ پس اب تعجب یہ ہے کہ یہ قاعدہ دنیاوی امور میں تو ہر کس و ناکس، عالم، جاہل، بڑے اور چھوٹے سب کے نزدیک تسلیم کیا ہوا ہے، اور جب دین کا معاملہ آپڑتا ہے تو بڑے بڑے عقلاء احمق بنجاتے ہیں۔ وہاں ۸
مقصود کی زبانی طلب کو ہی طلب کہنے لگتے ہیں۔ اور اطمینان رہتا ہے کہ بڑے طالب ہیں اور اس طلب پر نتیجہ ضرور مرتب ہوگا۔ اگر ایسا ہے تو زبان سے اولاد اولاد کہنے والے کو بھی طالب ولد کہنا چاہئے اور امید رکھنی چاہئے کہ اس کے اولاد ہوگی (معلوم نہیں کس طرح ہوگی شاید مرد کے بچہ پیدا ہوگا) معلوم نہیں کیا بات ہے، فرق کی کوئی وجہ نہیں۔ دنیا میں تو اسباب کو دخل ہو اور آخرت میں نہ ہو، بلکہ معاملہ برعکس معلوم ہوتا ہے کہ دنیاوی اسباب کو اتنا دخل اپنے مقاصد میں نہیں ہے جتنا کہ آخرت کے اسباب کو مقاصدِ آخرت میں ہے۔

یہ بات ظاہراً مشکل معلوم ہوئی ہوگی، کیونکہ ذہن نشین یہی ہو رہا ہے کہ دنیاوی کام تو اختیاری ہیں اور اخروی نہیں۔ جو لوگ ذرا عقلمند ہیں وہ اتنا اور کہہ لیتے ہیں کہ ہوتا تو سب کچھ تقدیر ہی سے ہے مگر اسباب

حق تعالیٰ نے معترز فرما دیئے ہیں۔ مسئلہ تقدیر کو سمجھا مگر غلط سمجھا، چاہے فاسق ہوں یا فاجر ہوں، اگر تقدیر میں جنت ہے تو جائیں ہی گے، دنیا میں بھی یونہی کیوں نہ کہا کہ اسباب کو حاصل کریں یا نہ کریں اگر تقدیر میں مسبب لکھا ہے تو ملے ہی گا، نہ کوئی پیشہ کریں نہ کھیتی کریں نہ کھائیں اگر قسمت میں تموّل اور غلہ اور پیٹ بھرنا لکھا ہے تو ہو ہی جائے گا۔

بلکہ جیسا یہ خیال ہے کہ فسق و فجور کے ساتھ بھی جنت مل سکتی ہے باوجودیکہ یہ اعمال اس کے معتز ہیں، اس کے ساتھ یہ خیال بھی تو ہونا چاہیئے تھا کہ دنیا کے مسببات درصورت ذرائع اختیار نہ کرنے کے تو کیا ان کے منافی اسباب کو اختیار کرنے کی صورت میں بھی اگر تقدیر میں ہیں تو مل ہی کر رہیں گے۔ تو جس کو غلہ کی طلب ہو اگر اس کے یہاں کھیت کھڑا ہو تو کھڑے ہوئے کھیت میں آگ لگا دینا چاہیئے اور خوش ہونا چاہیئے کہ اب غلہ ملے گا۔ جیسا کہ اب فسق و فجور کر کے اطمینان سے بیٹھے ہیں کہ جنت ملے ہی گی غلطی یہی کہ دنیا کو اختیاری سمجھا اور آخرت کو نہیں۔ یا تو دونوں کو ۹
اختیاری سمجھا ہوتا یا دونوں میں تقدیر پر بیٹھے رہے ہوتے۔ ذرا غور سے سمجھ میں آجائے گا کہ واقعی بات کیا ہے۔

عقائد کا مسئلہ ہے کہ ہر سبب پر جو اثر مترتب ہوتا ہے وہ باذنہٖ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ کے حکم سے) ہے۔ جلانا آگ کا لگانا اثر دائمی اور متفق علیہ ہے، مگر جب تک اذن نہ ہو احراق[لہ] مترتب نہیں ہو سکتا۔ سب جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں نے نہایت تیز آگ میں ڈالا، مگر باری تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے کہدیا ٹھنڈی ہو جا۔ کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا اور احتراق مترتب نہ ہوا۔ اگر یہ اثر آگ کے لئے ذاتی ہوتا یا جزوِ ماہیت یا لازمِ ماہیت ہوتا تو کیوں منفک[عہ] ہوتا؟ کیا آگ آگ نہ رہی اور یہی قصہ اعمالِ صالحہ میں بھی ہے۔ جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و

لہ جلانا ۱۲ عہ جدا ۱۲

آپ وسلم فرماتے ہیں کوئی اپنے عمل کی وجہ سے جنت میں نہ جائے گا، مطلب یہ ہے کہ عمل تاثیر بالذات نہیں کہ کسی کو جنت میں لے جائے، مشیت ایزدی شرط ہے (جس کا مطلب یہ سمجھ رکھا ہے کہ عمل دخولِ جنت میں کچھ دخل نہیں رکھتا) عمل کو وہی دخل ہے دخولِ جنت میں جو آگ کو ہے احراق میں۔ آگ کے احراق کے لئے بھی مشیت شرط ہے اور دخولِ جنت کے لئے بھی۔

بہرحال ایک آیت اور ایک حدیث سے ثابت ہوگیا کہ کسی چیز میں تاثیر بالذات نہیں ہے اگرچہ اثر کیسا ہی یقینی اور دائمی ہو مگر ذات میں کسی چیز کی داخل نہیں کہ اثر کرے۔ سب مشیت باری تعالیٰ کے ساتھ ہے۔ جب یہ ثابت ہوگیا کہ حق تعالیٰ کے مرتب کرنے سے سبب مرتب ہوتا ہے تو اب اس کی تحقیق باقی ہے کہ آیا اسباب دنیویہ پر مرتب کرنے کا حق تعالیٰ نے یقینی وعدہ کیا ہے یا اسباب اخرویہ پر اس کے مرتب کرنے کا یقینی وعدہ کیا ہے۔
10 تو نصوص و واقعات دونوں سے دیکھئے کہ دنیوی اور دینی دونوں اسباب میں سے کس پر ترتب اثر یقینی ہے کس پر وعدہ ہے باری تعالیٰ کا، اور تجربہ سے بھی کون یقینی ہے۔

سو کہیں نہیں فرمایا گیا نصوص میں کہ اسبابِ دنیوی پر اثر ضرور مرتب ہوگا، اور تجربہ و واقعات سے بھی یہی نکلتا ہے۔ بسا اوقات کھیتی کرتے ہیں، اور ایک دانہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ یہی حال جاہ و ثروت کا ہے۔ بہت سی تدبیریں کی جاتی ہیں مگر عمر گذر جاتی ہے اور غربت ہی رہتی ہے۔ اور کبھی بے تدبیر مالدار ہو جاتا ہے۔ اگر آپ غور کریں گے تو کبھی نہ کہیں گے کہ جاہ و ثروت تدبیر پر ہے۔ میں نے خود ایسے واقعے دیکھے ہیں کہ جن کی اوقات کسی وقت میں دو آنہ کی تھی آج وہ لاکھ پتی ہو گئے۔ اگر آپ کہیں کہ انھوں نے تدبیر سے اسقدر مال حاصل کیا ہے تو میں کہتا ہوں آپ ان کے پاس جائیے، اور اول سے آخر تک ان کی سوانح عمری لکھئے اور ان کی کل تدبیریں بھی

لکھیے کہ پہلے ان کے پاس دو آنہ تھے، اس کا انھوں نے فلاں سودا خریدا اور صبح سے شام تک پھیری کرکے بیچا، اس میں ایک سوا نفع ہوا، ایک آنہ میں سے نصف کھایا اور نصف اصل میں شامل کردیا، اگلے دن ڈھائی آنے کا سودا لے کر پھیری کی، ساڑھے تین آنے یا چار آنے ہوگئے، اسی طرح رأس المال بڑھتا گیا، یہاں تک کہ جب تعداد آنوں سے نکل کر روپیوں میں آگئی تو کچھ پس انداز کرنے لگے، جب ایک کافی رقم جمع ہوگئی تو جائیداد خریدلی، پھر اس کی آمدنی کو بقدرِ ضرورت خرچ کیا، اور کچھ داخلِ خزانہ کرتے گئے یہاں تک کہ خزانہ بڑھتے بڑھتے لاکھ تک پہنچ گیا لکھ پتی ہوگئے۔

اس کو مفصل لکھئے بلکہ تمام تغیرات کو تاریخ وار قلمبند کیجیے، اب اگر یہ تدبیر سبب ہے ان کے جاہ و ثروت کی تو آپ بھی ایسا ہی کیجیے جیسا انھوں نے کیا کہ دو آنہ کا سودا لیجیے اور پھیری کیجیے اور نفع کو شامل راس المال
11 کرتے جائیے، بعد چندے کچھ پس انداز کیجیے اور جائیداد خریدلیجیے پھر خزانہ بڑھائیے یہاں تک کہ لکھ پتی بنجائیے۔ میں کہتا ہوں کبھی بھی تو ان تدبیروں سے آپ ان کی برابر نہیں ہوسکتے۔ کیا وجہ ہے کہ تدبیرے اس نے حاصل کیا اور تم نہیں کرسکتے؟ وجہ یہی ہے کہ سب کچھ باری تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے۔ پس ثابت ہوگیا کہ اسباب دنیا پر ہمیشہ اللہ میاں اثر مترتب نہیں فرماتے۔

میرے دعوے کا ایک جزو ثابت ہوگیا کہ اسباب دنیوی پر نتیجہ کا مترتب ہونا ضروری اور دائمی نہیں رہا۔ دوسرا جزو یعنی آخرت، سو دیکھیے فرماتے ہیں مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا یعنی جو کوئی آخرت کا طالب ہو اور کوشش کرے تو اس کی سعی ضائع نہ جائے گی۔ بلکہ فرماتے ہیں نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ (ہم زیادتی کریں گے اسکے لئے کھیتی میں)، یعنی اس کا نتیجہ بقدر عمل ہی نہیں زیادہ دیا جائے گا! دیکھ لیجیے

وعدہ کے یقینی ہونے سے نتیجہ مترتب ہونا ضروری اور یقینی ہوا یا نہیں۔ میرا مدعا ثابت ہوگیا۔ کہ اسبابِ دنیوی پر اثر مترتب ہونے کا کہیں وعدہ نہیں، اور اسبابِ اخروی کے لئے وعدہ ہے۔

پھر تعجب ہے کہ دنیا میں جس چیز کا ارادہ کرتے ہیں وہ اکثر جتنا چاہتے ہیں نہیں ملتی، مگر پھر اکتساب ذرائع سے کوئی غفلت نہیں کرتا، اور غفلت کرنے والا احمق سمجھا جاتا ہے۔ اور آخرت میں اس قدر ملتا ہے جس کا ارادہ بھی نہیں کیا جاتا اور پھر اکتساب ذرائع سے غفلت ہو اور غفلت کرنے والے کو کوئی احمق نہ کہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (سو کسی شخص کو خبر نہیں جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانہ غیب میں موجود ہے) اور حدیث قدسی میں فرماتے ہیں أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِينَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ "میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی، (السجدہ ۱۲)
نہ کسی کے دل میں اس کا خیال تک گذرا" حالانکہ یہ خیال بڑی وسیع چیز ہے۔ مگر بروئے حدیث وہ چیزیں اسبابِ آخرت پر متفرع ہوتی ہیں جو خیال میں بھی نہ آسکیں۔ اب سوچئے کہاں تک سوچیں گے، جمال، باغ، نہریں، خادم، ماکولات و مشروبات وغیرہ جہاں تک بھی آپ کا خیال پہنچے، پھر ایک مرتبہ ایسا نکلے کہ خیال سے بھی باہر ہو، اور عقل اس کے ادراک سے قاصر ہو مگر وہاں ملے گا انشاء اللہ تعالیٰ اگر فضل ہوا آخرت میں ترتبِ اثر تو کیا اس اثر کا وعدہ ہے کہ سبب ہے اور اس سے کچھ نسبت بھی نہیں۔ جمال اور باغ وغیرہ میں بھی ایسے مراتب نکل سکتے ہیں کہ خیال سے باہر ہوں، اور بعض نتیجے وہاں کے وہ ہیں کہ ان کا صرف لفظ ہی سنا ہے ماہیت تو عقل میں بھی نہیں آتی، وہ رؤیتِ الٰہی ہے۔[1]

غرض ترتبِ اثر یقینی ہوا کیونکہ وعدہ فرمایا ہے باری تعالیٰ نے کہ اثر ہم ضرور

[1] دیدار۔

متفرع کریں گے تم ذرائع کو حاصل کرو، اور لوگوں کے خیال میں یہ جما ہوا ہے کہ آخرت بے اختیاری ہے اور دنیا اختیاری ہے۔ اسی نے لوگوں کو بٹھا دیا کچھ نہیں کرتے اور دنیا کے معاملات میں یہ حال ہے کہ جب چاہتے ہیں دنیا حاصل کرنا اسباب کو جمع کرتے ہیں، حالانکہ بارہا اسباب کے تخلف کو بھی مقاصد سے دیکھ چکے ہیں۔ تعجب ہے کہ جن اسباب کو دخل نہیں وہ جمع کئے جائیں اور جن کو دخل ہے ان کو نہ اختیار کیا جائے، کیسے کہا جائے کہ ایسا شخص جنّت کا طالب ہے۔ اسی کو فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعجب ہے جنت سے کہ اس کا طالب کیسے سوتا ہے!

اس سے اور ماسبق سے ثابت ہو گیا کہ جو اسباب کو حاصل نہ کرے اس کے دماغ میں خلل ہے۔ طلب صرف معتبر نہیں بلکہ طلب صادق ضروری ہے۔ اور اس کے لئے کسب ذرائع لازم ہے جیسا کہ بسط کے ساتھ ابتک
۱۳ بیان کیا گیا۔ سو اس آیت میں اللہ میاں نے جنّت کے طلب کا ذریعہ بتایا ہے جس کے سب لوگ مشتاق ہیں۔

یہاں ایک بات اور قابلِ تحقیق ہے وہ یہ کہ اس آیت سے جنت کا مطلوب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ میں بعض ایسے گذرے ہیں جن کے کلام میں یہ مضمون پایا جاتا ہے کہ نہ ہم کو جنّت کی طلب ہے نہ دوزخ کا خوف ہے تو یا تو جنت مطلوب نہیں یا وہ لوگ مخالف قرآن کے ہیں۔ جیسے ایک صاحبِ حال کی نقل ہے (یہ قصہ حضرت رابعہ بصریہ کا ہے) کہ ایک روز غلبۂ جذب میں ایک ہاتھ میں آگ اور ایک ہاتھ میں پانی لے کر نکلیں۔ لوگوں نے عرض کیا حضرت یہ کیا؟ کہا تمام عالم کو جنّت اور دوزخ ہی کے خیال نے تباہ کر دیا میرے مالک کا نام کوئی نہیں لیتا۔ آج میں فیصلہ کئے دیتی ہوں پانی سے دوزخ کو ٹھنڈا کر دوں گی اور آگ بہشت میں لگا دوں گی" سو بات یہ ہی کہ یہ اقوال و حکایات اہلِ حال کے ہیں، اور غلبۂ حال سے ان کو معذور

سمجھا جاوے گا۔ ہم سوال کو تو ان لوگوں کے اقوال کو نقل کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔ ایسی بات جذب میں کوئی کہدی جائے باقی قصداً کہنا یا اس کو کمال سمجھنا بڑی غلطی ہے۔ خوب یاد رکھئے کہ جذب کوئی کمال نہیں۔ اور یہ وہ اختیاری چیز ہے جو لوگ اختیار سے ایسے لفظ کہتے ہیں حاشا وکلا جو اعلیٰ و ادنیٰ کسی درجہ میں بھی وہ شمار ہوں۔ غلبہ کے تو معنی ہی بے اختیاری کے ہیں۔ پھر بے اختیاری کا اختیار سے ہونا کیا معنی؟

آجکل لوگوں نے اسی کو کمال سمجھ رکھا ہے جو کوئی واہی تباہی کلمات بیباکانہ بکتا ہو اس کو بڑا پہنچا ہوا سمجھتے ہیں کہ فلاں بزرگ مست ہیں۔ سو خوب سمجھ لیجئے کہ جن بزرگوں سے ایسے کلمات منقول ہیں ان کے لئے بھی یہ حالت کچھ کمال کی نہ تھی۔ ہاں غلبۂ حال کی وجہ سے معذور تھے۔ کوئی الزام ان پر عائد نہیں ہوتا۔ اور رہے نقال سو وہ تو کسی طرح معذور ہی نہیں ہو سکتے۔ ان کے اقوال کے دعوے کے ساتھ نقل سخت بیہودگی ہے۔ غرض ان لوگوں کی یہ ایک حالت معذوری کی تھی، ورنہ جس چیز کا مطلوب ہونا قرآن سے ثابت ہو، اور جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم طلب فرماویں اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ وَمَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ اَوْعَمَلٍ۔ (اے اللہ میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں، اور وہ چیز جو اس (جنت) کی طرف قریب کردے، قول ہو یا عمل) اس کی نسبت دوسرے کا کیا منصب ہے کہ ایسا کہے۔ آیات و احادیث میں صاف طور پر طلبِ جنت کی فضیلت آئی ہے۔ اہلِ حال معذور تھے حال کی وجہ سے اور اب تو لوگوں میں حال ہی نہیں رہا، نقل نقل رہ گئی ہے۔ اس کو فرماتے ہیں مولانا ؎ ١٤

حرفِ درویشاں بدزدد مردِ دوں ⁂ تا بہ پیشِ جاہلاں خواند فسوں

"درویشوں کے الفاظ چرا کر کمینہ آدمی جاہلوں کے سامنے ان کو اپنے دام میں پھنسانے کیلئے منتر پڑھتا ہے"

جن میں کچھ ہے ہی نہیں وہ ان کے دعووں کی نقل کر کر کے جاہلوں میں بزرگ بنتے ہیں۔ مجھ کو ایک شخص اسی سفر میں ملے کہ وہ کچھ مالی اعانت چاہتے تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں میں اپنی محویت بھی ظاہر کی۔ لمبی لمبی باتیں کرنے لگے، کیا پرواہ ہے جنت کی اور کیا خیال ہے دوزخ کا۔ میں نے کہا میاں بیٹھے بھی رہو چار روپے کے لئے تو گھر چھوڑے پھرتے ہو جنت کی طرف التفات بھی نہ کروگے۔

ان نقالوں میں رنگ البتہ اصل سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ سو ہر چیز میں تجربہ کر لیجئے کہ اصل میں نقل کی سی آب وتاب نہیں ہوتی، رنگ و روغن کو دیکھکر شیفتہ ہوجانا اس امر کی دلیل ہے کہ اس شخص نے اصل چیز نہیں دیکھی اور محض ناواقف ہے۔

غرض اہلِ حال تو بحث سے مستثنےٰ ہی ہیں، اور جنت کا مطلوب ہونا بحالہٖ باقی رہا، البتہ یہ ضرور ہے کہ مشہور تقسیم میں اس کے مطلوب ہونے ۱۵
کی دو صورتیں ہیں اور میرے نزدیک ایک تیسری صورت اور بھی ہے۔ ایک تو یہ کہ اس کی نعمتوں کو مقصود سمجھکر کھانے کو پینے کو باغوں کو مکانات کو نہروں وغیرہ کو غرض اصلی جان کر طلب کیا جائے۔ مذاق مختلف ہوا کرتے ہیں، کسی کو مکانات کا شوق ہے، کسی کو دلکش فضاؤں کا، کسی کو بچوں کا، کسی کو حسن وجمال کا، کسی کو ماکولات و مشروبات کا، اور جنت میں سب کچھ ہے تو جو چیز جس کو مرغوب ہو ملے گی۔ حدیث شریف میں ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک شخص تمنا کریگا کہ میں تو کھیتی کرتا، اللہ میاں فرمائیں گے ابن آدم کا پیٹ ہی نہیں بھرتا، اور دم کے دم میں سب چیز موجود ہو جاوے گی۔ بات کہتے ہیں ہرا بھرا کھیت پھر انبار کے انبار غلہ تیار ہے تو کتنی کھیتی چاہیئے! یہ ایسا ہے جیسا کہ بچہ طرح طرح کی ضدیں کیا کرتا ہے اور سب پوری کی جاتی ہیں، والدین

جانتے ہیں کہ اولیٰ ضدیں ہیں مگر جو مانگتا ہے دیتے ہیں۔
تو بعض لوگ جنت کو اس لئے طلب کرتے ہیں۔ دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو جنت کو اللہ میاں کی لقاء کے لئے طلب کرتے ہیں یہ لوگ طالب درحقیقت اللہ میاں کے ہیں۔ مگر ان کو معلوم ہوا ہے کہ رویت اور رضا خاص جنت میں ہوگی۔ اس لئے چاہتے ہیں کہ جنت میں پہنچ جائیں تاکہ مقصود اصلی حاصل ہو۔ غرض نعمت کے طالب نہیں بلکہ منعم کے ہیں۔ مثال اس کی یہ ہے کہ ایک محبوب نے باغ میں لوگوں کو بلایا، جس میں ہر قسم کا عیش و نشاط موجود ہے، جو میوے کہیں نہیں ہیں وہ وہاں موجود، وہ مکانات جن کا نقشہ تک کسی کے خیال میں نہ گذرا ہو وہاں تیار، نہریں، حوض، دلکش فضائیں، خادم، غلام۔ غرض جملہ چیزیں موجود ہیں۔ بعض جانے والے ایسے ہوں گے جو غسل کرنے اور حوضوں میں غوطہ لگانے کی غرض سے جائیں گے، اور بعض تازہ بتازہ ہواؤں کا لطف اٹھانے کے لئے اور بعض ۱۶
میووں سے لذت حاصل کرنے کے لئے وعلیٰ ہٰذا۔
اور ایک جانے والے وہ ہیں کہ اس محبوب پر عاشق ہیں اور باغ میں اس واسطے جاتے ہیں کہ ان کو معلوم ہوا ہے کہ ہمارا محبوب باغ میں ہی یہ سُن لیا ہے اور باغ کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ دراصل باغ کو نہیں ڈھونڈتے باغ والے کے شیدائی ہیں، اس وقت چونکہ محبوب باغ میں ہے اس واسطے باغ کی طرف جاتے ہیں اور وہ اگر جنگل میں آجائے تو باغ کا خیال بھی اُن کے ذہن میں کبھی نہ گذرے۔
باغ کی طرف جانے والے یہ دو قسم کے لوگ ہوئے، ایک وہ کہ نفس باغ کے طالب ہیں، دوسرے وہ کہ نہ انھیں باغ کا خیال ہے نہ جنگل کا۔ محبوب کی طرف نگاہ ہے۔ مشہور قسمیں طالبانِ جنت کی تو یہی دو ہیں، اور میرے

ع دیدار۔ عہ یہ پانچ سطریں بعینہ مولانا مدظلہ کے لکھے ہوئے کی نقل ہیں جو مسودہ میں بروقت اصلاح تحریر فرمائیں۔

نزدیک تیسری قسم اور ہے لیکن ذرا دقیق ہے، وہ یہ کہ طالب تو نعمت کے ہیں لیکن نہ حظ کی وجہ سے بلکہ اپنے تذلل اور عبدیت کی وجہ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ بلا واسطہ طالب منعم کے ہوں، وہ اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ اس کے کوچہ کا ایک گوشہ مل جاوے۔ یہ تیسری قسم ہوئی پس طالب نعمت کا مبتدی ہے اور طالب منعم کا متوسط ہے اور طالب نعمۃ لِلعَبدِیَۃ کا واقع میں طالب کامل منعم کا ہے منتہی ہے۔ اور صاحب حال بحث سے خارج ہے۔

(عدم طلب جنت ادنیٰ درجہ نہیں)

خلاصہ یہ کہ لوگوں کا خیال مطلقاً یہ ہے کہ طلبِ جنت سے عدم طلب کا درجہ بڑھ کر ہے۔ حالانکہ غور کرنے سے اس کے خلاف ثابت ہوتا ہے۔ کہیں آیات و نصوص میں اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ عدم طلب کوئی شے حَسَن ہے۔ بہت سے بہت یہ کہہ سکتے ہیں کہ عدم طلب والا معذور ہے، سو معذوری میں فضیلت کہاں۔

۱۷ (فرق مبتدی و منتہی)

حاصل یہ کہ طالب جنت کی تین قسمیں ہوگئیں کہ یا مبتدی ہے یا متوسط یا منتہی۔ سو متوسط کا حال تو اکثر ممتاز ہوتا ہے۔ لیکن مبتدی اور منتہی کا حال بہت متشابہ ہوتا ہے مگر واقع میں زمین و آسمان کا فرق ہے، مبتدی ایک کام میں لگا ہوا ہے گو حقیقت نہیں پہچانتا مگر آہستہ آہستہ بڑھتا جاتا ہے۔ کبھی حقیقت شناس بھی ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں وجد میں آجانا ڈھاریں مارنا مغلوبوں کا کام ہے۔ جو صاحب کمال ہے اس کو حال نہ آنسو ٹپکا سکتا ہے نہ حال اس کے بدن میں حرکت پیدا کرسکتا ہے، نہ حال اس کی زبان سے بیساختہ کلمات نکلوا سکتا ہے۔

شاہ عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد اینجا مردانند کہ دریاہا فرد برند و آروغ نزنند"۔

ھ اس وقت مجلس پر ایک کیفیتِ عجیبہ طاری تھی ۱۲

(منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے فریاد میں آگیا۔ اِس جگہ مرد ہیں کہ دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے) منتہی کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے مگر چونکہ منتہی راستہ طے کئے ہوئے ہوتا ہے اس واسطے ہر مقام پر اس کے افعال سے واقفیت ٹپکا کرتی ہے اور مبتدی مقلدانہ چلتا ہے۔

تفاوت مبتدی و منتہی

اسی طرح جنت کے مانگنے والوں میں جو مبتدی یا منتہی ہیں ان میں فرق یہ ہے کہ مبتدی طالب ہے مزہ کے لئے اور منتہی مزہ سے گذرا ہوا ہے۔ پھر جنت کی طلب جو کرتا ہے سو وہ محبوب کے حکم سے ہے۔ گویا منتہی عبدیت ظاہر کرتا ہے کہ جو حکم ہو اس کی تعمیل کے لئے تیار ہوں۔ اور مبتدی کی فنا میں ابھی کمی ہے۔ اس کا التفات مزہ کی طرف ہنوز باقی ہے۔ فرض کیجئے کہ ایسی چیز کی طلب کا حکم ہوتا کہ مزہ اس میں نہ ہوتا تو ممکن ہو اس صورت میں مبتدی کے پیر اکھڑ جاتے اور منتہی جما ہوا ہے۔ اس کی لغزش کی کوئی وجہ نہیں وہ مزہ کا طالب ہی نہیں جس کے رہنے نہ رہنے پر اس کی طلب ۱۸
کا دار و مدار ہو، چونکہ طلب کا حکم پایا ہے اس واسطے تعمیل کر رہا ہے۔

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہیے) امر کا صیغہ ہے۔ یہ شخص زبانِ حال سے کہہ رہا ہے ؎

طلب امتثال امر ہے

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دین خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

"اگر مجھ سے شہنشاہِ دین طمع خواہاں ہو تو پھر قناعت پر خاک ڈال دوں"

جب اُدھر سے ہی طلب کا حکم ہے تو طلب نہ کرنا عدول حکمی ہے۔ مطیع اطاعت میں ایسا محو ہوتا ہے جیسے کسی کو شراب پلا دیں (شراب دو ہیں حلال اور حرام شراب محبت حلال ہے) شراب پی کر آدمی سب طرف سے بے خبر ہو جاتا ہے اسی طرح جو بندہ ہے وہ امتثالِ امر میں مخمور ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھئے کہ یہ محویت بیخودی نہیں ہے۔ بعض ناواقف اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اگر نماز میں محویت ہو جائے تو رکوع و سجود کیسے ہوں۔ محویت کے معنی یکسوئی کے

محویت بیخودی نہیں

ہیں، صرف باری تعالیٰ کی طرف خیال ہوتا ہے۔ اس صورت میں عبادت بطریق احسن ہوگی، رکوع و سجود نہ ہونا کیا معنی۔

عام لوگ محویت اس کو سمجھتے ہیں کہ کچھ واہی تباہی کلمات زبان سے نکال دیں یا آئندہ کی باتوں پر دعوے کے ساتھ حکم لگا دیا کریں اس کو بڑا کمال سمجھتے ہیں اور کہا کرتے ہیں۔ اللہ میاں پر ایسا ناز ہے کہ جو منہ سے نکل گیا پورا ہو کر رہتا ہے۔ یہ مسلّم سہی کہ دعا، قبول ہوتی ہے مگر ہر چیز کو مانگ بیٹھنا اور وثوق سے حکم لگا دینا انہی سے ہو سکتا ہے جو بیخود ہیں، یہ محویت محمود نہیں، محویت محمود میں حق سبحانہٗ تعالیٰ سے نہایت قرب ہوتا ہے۔ اور جتنا جس کو قرب ہوتا ہے اتنا ہی عظمت کا اس پر ظہور ہوتا ہے اور اتنا ہی اپنے نفس کا تذلل کھل جاتا ہے۔ پھر جس پر محبوب کے اعلیٰ درجہ کی عظمت اور اپنی ذلت کھل گئی ہو اس کی نسبت کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جہاں چاہے بیدھڑک قدم اٹھا بیٹھے گا۔ بادشاہ کے دو بچے ہیں ایک ناسمجھ اور ایک سمجھدار ناسمجھ تو جب آتا ہے سیدھا گود میں جگہ لیتا ہے، نہ آداب مجلس کی کچھ خبر نہ ارکین کا لحاظ نہ بادشاہ کا ادب نہ شاہی پوشاک کا خیال، پیر صاف ہیں یا خاک آلودہ آئے اور زانو پر چڑھ بیٹھے۔

اور ہوشیار بچہ جب آتا ہے تو نیچی نگاہ کئے ہوئے، چہرے پر ارکین کا لحاظ ظاہر، مجلس کا رعب چھایا ہوا اور نہایت ادب سے پاؤں پکڑ کر حاضری کی اجازت مانگ کر مؤدب کھڑا ہوتا ہے۔ وجہ یہی ہے کہ سمجھدار کو عظمت شاہی کی خبر ہے اور ناسمجھ کو نہیں۔ اب کوئی کہہ سکتا ہے کہ ناسمجھ بچہ بادشاہ کے نزدیک زیادہ مرتبہ رکھتا ہے کہ اس قدر قرب اس کو حاصل ہے کہ شاہی پوشاک پر میلے پیروں سے جا چڑھتا ہے اور جو الٹی سیدھی ضدیں کرتا ہے۔ پوری کی جاتی ہیں۔ نہیں۔ قرب صوری اس کو حاصل ہے اور قرب حقیقی سمجھدار کو، اگرچہ سمجھدار گود میں نہیں ہے اور کسیقدر فصل سے کھڑا ہے میلے

پیروں سے کپڑوں پر جا چڑھنا اور اُلٹی سیدھی ضدیں کرنا گستاخی ہے فضیلت نہیں زائد سے زائد یہ ہے کہ بچہ ان حرکات میں معذور سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح اہل حال کہہ اٹھتے ہیں کہ نہ دوزخ نہ بہشت نہ اُس کا خوف ہے نہ اِس کی خواہش۔ ان دونوں میں سے کسی کی خبر ہی نہیں۔ یہ کامل نہیں ہیں ان پر ابھی عظمت کا انکشاف پورا نہیں ہوا۔ اس وجہ سے اتنی جرأت ہے کہ قرب کے اعلیٰ درجہ کا دعویٰ ہے۔

دیکھئے ایک نہایت ذلیل شخص کسی عالی شان محبوب کی طرف جانا چاہتا ہو تو اول تو برسیں چاہئیں اس کوشش کے لئے کہ کسی طرح راستہ کے موانع رفع ہوں، دربان وچوبدار وغیرہ سے ساز ہو جائے تب توقع کی جائے کہ ان کی درخواست محبوب تک پہونچ سکے گی، اگر اس میں کوشش ان کی چل گئی کہ درخواست محبوب تک پہنچ گئی اور پھر قسمت کی یاوری سے محبوب نے بہت ہی لطف
۲۰ فرمایا کہ حاضری کی اجازت دیدی تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دربار میں جاتے وقت ان کی بڑی سے بڑی آرزو کیا ہوگی۔ یہ تو کبھی خیال بھی نہ جائے گا کہ مجھے محبوب بنا لیں، بڑا حوصلہ یہ ہوگا کہ چوکھٹ کو بوسے دینے کی اجازت ملجائے اس کا یہ حوصلہ کرنا کیا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چوکھٹ کا طالب ہے ؟ نہیں یہ شخص چوکھٹ کا طالب نہیں ہے۔ بلکہ اپنی حالت کو دیکھ کر اس سے زیادہ کی ہمت نہیں کرتا۔ حق تعالیٰ اگر اس کو چوکھٹ سے بڑھانا چاہیں تو پیروں میں رعشہ پڑ جائے گا۔ سو منتہی اَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ (آپ سے میں جنت کی درخواست کرتا ہوں) کہے گا نہ اس واسطے کہ جنت کا طالب ہے بلکہ طالب محبوب حقیقی ہی کا ہے مگر اس سے بڑھکر حوصلہ اپنی ذلت اور ان کی عظمت کو دیکھکر نہیں کرسکتا

معلوم ہوگیا ہوگا کہ طالب تین قسم کے ہیں مبتدی یعنی طالب جنت کے حظ کے لئے، اور منتہی یعنی طالبِ جنت عظمتِ محبوب کی وجہ سے اور متوسط الحال مبتدی اور منتہی میں فرق مشکل ہے اور متوسط الحال کا حال ممتاز اور ظاہر

ہوتا ہے حال سے مغلوب ہوتا ہے گو ایسا مغلوب نہ ہو کہ حدِ شرع کی حفاظت نہ کرسکے۔ کیوں کہ ایسا شخص تو جیسا اوپر عرض کیا گیا مبحث سے خارج ہے لیکن مغلوب ہونے سے صرف اس قدر مراد ہے کہ ذرا سی بات پر رونے لگتا ہے، ذرا سی بات پر وجد آجاتا ہے، زبان سے بے اختیارانہ کلمات نکلنے لگتے ہیں اس کو عوام کمال سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ کمال نہیں ہے، کمال یہ ہے کہ حال پر غالب آجائے اور حال کوئی تغیر اس میں نہ پیدا کرسکے۔ ایسے شخص کے پہچاننے کے لئے بڑی بصیرت چاہئے۔ اس کی حالت بالکل مبتدی کی سی ہوتی ہے۔ عام لوگ دونوں میں فرق نہیں کرسکتے۔ منتہی کا پہچاننا کچھ آسان کام نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متوسط اولیاءؒ کو تو لوگوں نے پہچان لیا، اور اولیاء کاملین اور انبیاء علیہم السّلام کو نہ پہچان سکے قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (انھوں نے کہا تم تو مثل ہماری بشر ہو) متوسط اولیاء میں تو جوش و خروش دیکھتے ہیں اور اولیائے کاملین اور انبیاء علیہم السّلام کی حالت بالکل معمولی سی معلوم ہوتی ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

جملہ عالم زیں سبب گمراہ شد　　　کم کسے از سرِّ حق آگاہ شد

تمام دنیا اسی خام خیالی کی وجہ سے گمراہ ہوگئی کہ انھوں نے اللہ کے اولیاء کو پہچانا نہیں،

گفتہ اینک ما بشر ایشاں بشر　　　ما و ایشاں بستۂ خوابیم و خور

اور کہنے لگے ہم بھی انسان وہ بھی انسان وہ بھی کھاتے پیتے ہیں ہم بھی کھاتے پیتے ہیں ،

ایں ندانستند ایشاں از عمےٰ　　　درمیاں فرقے بود بے منتہا

ان بیوقوفوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ ان میں اور ہم میں بڑا فرق ہے ،

ایں خورد گردد پلیدی زو جدا　　　واں خورد گردد ہمہ نورِ خدا

یعنی ایک کھاتا ہے تو اس سے پلیدی، بخل و حسد پیدا ہوتا ہے وہ دوسرا کھاتا ہے تو وہ تمام تر نورِ خدا یعنی عشق الٰہی پیدا کرتا

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

یعنی بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو اگرچہ ظاہر میں دونوں فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر اور شیر

مگر ان کو اس کی ضرورت نہیں کہ پہچانے جائیں ۔ صاحب کمال کو ایک عجیب استغناء ہوتا ہے ۔ دنیا کا ذرا سا کمال کسی کو حاصل ہو جاتا ہے تو کسی کی طرف التفات نہیں کرتا ۔ یہ لوگ تو وہ کمال رکھتے ہیں کہ اس کی ماہیت بھی کسی کو معلوم نہیں ہے ۔ قصداً اظہار تو کہاں ان کو تو غیرت آتی ہے کہ کسی پر اظہار ہو کیمیاگر کبھی اپنے آپ کو ظاہر کرنا نہیں چاہتے ٹھگ البتہ کمالات دکھاتے پھرا کرتے ہیں ۔ پھر دیکھ لیجئے کہ یہ کمالات شعبدے ہی ہوتے ہیں ۔ جس کے اندر کچھ ہے وہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا اور جو دکھاتا پھرتا ہے اس میں کچھ ہے نہیں ۔ ان لوگوں کو تو کبھی اپنے آپ سے بھی غیرت آجاتی ہے قلندر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

۲۲ یعنی مجھکو آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ ان کو محبوب کے چہرۂ انور کو نہ دیکھنے دوں اور کانوں کو بھی ان کی باتیں نہ سننے دوں "

میری آنکھ آپ کی طرف دیکھے ، میرا کان آپ کی بات سنے ۔ یہ لوگ امتثالِ امر میں لگے ہوتے ہیں کوئی اُن کو پہچانے یا نہ پہچانے کچھ پروا نہیں ، نیکی کر اور دریا میں ڈال ۔ اپنی طرف سے کبھی اظہار کا تصور نہیں کرتے ہاں اللہ میاں کبھی ظاہر کر دیتے ہیں ۔ اس وقت یاد رکھنے کی بات ہے کہ اخفاء بے ادبی ہے کیونکہ اطاعت تعمیلِ حکم اور رضا ہے ۔ جس طرح رکھیں بندہ کو اسی طرح رہنا چاہئے ۔ جب کہیں خاموش رہو خاموش ہو جائے اور جب کہیں کھل جا تو بلا تامل کھل جائے ۔ یہ کھل جانا بھی طاعت ہے ۔ اس وقت اخفاء اتباعِ نفس ہے اس وقت اس کو اظہار میں وہی لذت ہو گی جو پہلے اخفاء میں تھی ۔

ع ؎ غالباً وعظ کے وقت مصرعہ اولیٰ دوبارہ پڑھا گیا ہو اس لئے دوبارہ لکھا گیا ہے ۔ ۱۲

غرض صاحب کمال اپنے قصد کو کبھی دخل نہیں دیتا، نہ اخفاء میں نہ اظہار میں بس فنا ہوتا ہے تعمیلِ حکم میں، اور جو کوئی بالقصد اپنے آپ کو ظاہر کرتا پھرتا ہے وہ ابتک فنا ہی نہیں ہوا۔ جب صاحب کمال سرتاپا محو ہوا امتثالِ امر میں تو اس کو اس طرف توجہ ہی نہیں ہوتی کہ میں ظاہر ہوں یا نہ ہوں، بلکہ معمولی سی حالت ہوتی ہے اگر طلب کا حکم نہ ہوتا تو طلب بھی نہ کرتا مگر حکم ہے اس لئے بغرض اس کی تعمیل کے طلب کرتا ہے، مبتدی بھی طلب کرتا ہے اور منتہی بھی۔ طلب میں دونوں شریک ہیں اور کسی بات سے حالت ظاہر نہیں ہوتی۔ پھر فرق کیا جاوے تو کس طرح۔ مولانا فرماتے ہیں

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام　　　پس سخن کوتاہ باید والسلام

یعنی ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا، پس کلام کو کوتاہ کرنا چاہیئے۔

مبتدی اور منتہی میں فرق بڑا مشکل ہے۔

۲۳ بالجملہ طالبوں کی تین قسمیں ہوئیں، اور جنت مطلوب بہرحال ٹھہری اور اس کی طلب مامور بہ اور فرض ہے۔ اب وہ مقدمہ بھی یاد ہوگا کہ ذریعہ کا اکتساب ضروری ہوا۔ جنت جب ہر شخص کی مطلوب ہے تو اس کے ذرائع کی طلب بھی ہر ایک کے ذمہ ہے ورنہ وہی بوالہوسی ہوگی۔ اس ذریعہ اور طریق کو فرماتے ہیں وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَہَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی (اور جو شخص دنیا میں) اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا ہوگا اور اس نے نفس کو حرام خواہش سے روکا ہوگا سو جنت اس کا ٹھکانا ہوگا) سبحان اللہ کَلَامُ الْمُلُوْکِ مُلُوْکُ الْکَلَامِ (بادشاہوں کا کلام کلام کا بادشاہ ہوتا ہے)۔ جنت اتنی بڑی چیز اس کی طلب کا خلاصہ فرمادیا تاکہ طالبوں کو آسانی ہو، اتنے بڑے مطلوب کے لئے جس قدر ذرائع اور طرق ہوتے کم تھے۔ مگر حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایک ایسی بات بتادی جیسے گُر ہوتا ہے۔ گُر اس لئے ہوا کرتا ہے کہ کثیر التعداد افراد کو جن کو بالاستقلال ایک ایک کو یاد رکھنا دشوار

ہو اس کے ذریعہ سے یاد رکھیں۔ جیسے کوئی خادم کو محفل کے دروازے پر بٹھادے اس غرض سے کہ غیر آدمیوں کو اندر نہ آنے دے تو اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ زید، عمرو، بکر، خالد وغیرہ ایک سو نام اس کو بتادیتے جائیں کہ ان میں سے جو کوئی آئے اس کو منع کرے۔ اس میں کسی قدر دقت خادم کو پیش آئیگی، کہ ایک فہرست بنائے گا جس میں یہ سب نام درج ہوں اور ہر آنیوالے سے نام پوچھکر اوپر سے نیچے تک ساری فہرست میں تلاش کرے گا کہ یہ نام اسمائے مندرجہ فہرست میں سے ہے یا نہیں۔ ہر بار ساری فہرست دیکھنی پڑے گی۔ نیز کسی قدر دقت آنے والوں کو ہوگی کہ ہر شخص کو اتنی دیر ٹھہرنا پڑے گا کہ جب تک وہ تمام فہرست کو دیکھے۔ سہولت اس میں ہے کہ مختصر سی بات بتادی جائے کہ جس کو تو پہچانتا ہے اس کو نہ آنے دینا۔ اس سے نہ فہرست کی ضرورت رہے گی نہ کچھ اور دقت پیش آئے گی۔ اسی کو گر کہتے ہیں

جنت کے حصول کے لئے بہت سے طریق ہیں جن کا فرداً فرداً یاد رکھنا نہایت ٢٤
دشوار تھا اس لئے حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک ایسا امر بتادیا کہ جب اس کی رعایت رکھی جاوے تو جو فعل بھی کیا جائے گا وہ وہی ہوگا کہ اس کو کچھ نہ کچھ دخل ہے جنت میں۔ اللہ میاں کے کلام کی قدر اسی کو آتی ہے جو طالب ہے۔ جب کسی کے جنت پیش نظر ہو تو انتہا درجہ کا شوق پیدا ہوگا۔ اور جب بتایا جاوے کہ اس کے مطلب کے فلاں فلاں طریق ہیں (اور چونکہ جنت بڑی چیز ہے اس کے طرق بھی کثیر ہی ہوں گے) ان کی کثرت کو دیکھکر یہ شخص گھبرا اُٹھے گا مگر چونکہ شوق انتہا درجہ کا پیدا ہوچکا ہے اس لئے یہ تو ہوگا نہیں کہ چھوڑ بیٹھے بلکہ ایک حالت سخت اضطراب کی پیدا ہوگی۔ اس شخص کے سامنے اگر کوئی قاعدہ کلیہ پڑھ دیا جائے جو جامع ہو تمام طرق کو تو ہر کوئی اندازہ کرسکتا ہے کہ اس کی کیا حالت ہوگی، وجد کی سی کیفیت ہوجائے گی۔ اس کو قدر آئے گی کہ کلام باری تعالیٰ کیا چیز ہے۔ اس گر کو

فرماتے ہیں وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس نے حرام خواہش سے روکا) اس میں دو کام فرماتے ہیں جو تمام طرق کو جامع ہیں۔ ایک اپنے مالک کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف دوسرا وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (اور نفس کو اس نے حرام خواہش سے روکا) الف لام عوض مضاف الیہ ہے اَیْ عَنْ هَوَاهَا (اس کی خواہشوں سے) نفس کو اس کی خواہشوں سے روکنا، یہ دونوں عمل جملہ طرق حصولِ جنت کو جامع ہیں، ہر چند کہ یہ دونوں عمل افراد بہت سے رکھتے ہیں اور تفصیل کرتے وقت افراد میں کچھ کمی نہ ہوگی مگر اس اختصار کی منفعت یہ ہے کہ جب یہ دونوں مضمون ذہن نشین ہوجائیں تو ہر فردِ عمل میں اس کی رعایت رکھنے سے نیک و بد میں تمیز سہولت سے ہوجائے گی۔ گو میں یہی ہوا کرتا ہے کہ افراد کم نہیں ہوجاتے صرف طریق شناخت میں اختصار و سہولت ہوجاتی ہے۔ دیکھئے کتنی سہولت ہوگئی
25 جب آدمی کے دل میں خوف ہوگا کہ مجھے ہر ہر عمل میں حق سبحانہ تعالیٰ کے سامنے جواب دینا ہوگا تو ہر کام کو تامل کے ساتھ کرے گا اور خیال رکھے گا کہ یہ کام کہیں خلافِ مرضی باری تعالیٰ نہ ہو، اس سے ایک بصیرت پیدا ہوجائیگی کہ ہر بُرے عمل کو پہچان لے گا اور اس سے بچ جائے گا اور جو سمجھ میں نہ آوے گا اس خوف کی وجہ سے اس کو علماء سے پوچھے گا۔ اس طرح سے کوئی فردِ معصیت اس کی نظر سے نہ چھوٹ سکے گا۔ ورنہ جنت جیسی بڑی چیز کے لئے کثرت سے ذرائع ہونے چاہئیں، ظاہر ہے ان کا ابتداءً ذہن میں منضبط کرنا امکان سے بھی باہر معلوم ہوتا ہے۔

آپ نے جان لیا کہ طرقِ طلب جنت کا حاصل دو امر ہیں۔ اب یا تو ایک دونوں میں سے اصل ہے اور دوسرا معین۔ یا دونوں اصل ہیں۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے اپنے مذاق سے کہ اصل نَهَى النَّفْسَ (نفس کو روکنا) ہے اور خوف اس کے لئے معین ہے۔ میں یہ اپنے دل سے نہیں کہتا ہوں بلکہ اس

حدیث سے کہ نَسْئَلُكَ مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهِ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ (وعا مانگتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کہ "اے اللہ ہم مانگتے ہیں خوف میں سے اس قدر کہ حائل ہو جاویں آپ اس سے ہم میں اور معصیت میں" تعلیل سے یہ بات نکلتی ہے کہ خشیت معصیت سے بچنے کے لئے مطلوب ہے بالذات مقصود نہیں، ورنہ نَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ (ہم آپ سے آپ کا خوف مانگتے ہیں) مطلقاً فرماتے۔ کسی چیز کی حد مقرر کرنے سے صاف یہی بات مفہوم ہوا کرتی ہے کہ اس سے زیادہ مطلوب نہیں۔ خوف کی حد فرمادی کہ اس قدر چاہتے ہیں کہ معصیت سے مانع ہو۔ معلوم ہوا کہ اگر خوف اس سے زیادہ ہو جائے تو محمود نہیں۔ خوف مع الرجاء (امید کے ساتھ خوف) یہی ہے۔ اگر خوف ہی خوف ہو کہ رجا نہ رہے اور نا امیدی تک نوبت پہنچ جائے تو یہ کفر ہے۔ اس سے معصیت چھوٹتی نہیں، بلکہ آدمی یہ سمجھ کر کہ طاعت سے کیا ہوگا زیادہ معصیت میں پڑجاتا ہے۔ میں نے خود دیکھا ایک مغلوب کو تب معلوم ہوا کہ شریعت میں جو توسط ہے اس میں یہ مصلحت ہے یہ ایک وکیل صاحب تھے، نماز روزہ کے خوب پابند تھے، خوف غالب ہوا تو عجیب حالت ہوئی پریشان ہوگئے۔ ایسی حالت تھی کہ زبان سے بات ٹھیک نہیں ادا ہوتی تھی قریب تھا کہ نماز بھی چھوڑ دیں، اور یہ سب کچھ ہوا تھا ایک کتاب کو دیکھ کر۔

کتابوں کو بطور خود دیکھنے میں یہ خرابی ہے۔ لوگ کہتے ہیں استادوں کے نخرے کون اٹھائے، عبارت اردو ہوتی ہی ہے اس کے سمجھنے میں کیا دقت ہے، کیوں کہ اردو ہماری زبان مادری ہے۔ اگر یہی بات ہے تو ہر شخص جس فن کا چاہے بلا استاد پورا عالم بن سکتا ہے۔ کتابیں ہر فن کی موجود ہیں حالانکہ مشاہدہ اور تجربہ اس کے خلاف ہے "جائے او ستاذ خالی است (استاد کی جگہ خالی ہے)، وجہ یہ ہے کہ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کتاب میں ایک جگہ نہیں لکھی جا سکتیں ہر بات علیحدہ علیحدہ لکھی جاتی ہے۔ ابواب و فصول

افراط خوف کی مضرت ۲۶

بلا استاد کتب بینی کی مضرت

اسی لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور اگر ایک جگہ متفرق باتیں لکھدی جائیں، تو کتاب کی ترتیب میں فرق آجائے اور ڈھونڈنے والوں کو بڑی دقت پیش آئے، کوئی خاص مضمون کہاں تلاش کریں، مثلاً نماز، روزہ و زکوٰۃ کے مسائل کتب فقہ میں بلا تفصیل ابواب کَیْفَمَا اتَّفَقَ (جیسا اتفاق ہوا) جمع کردیئے جائیں تو کس قدر دقت ہوجائے کہ ایک ذرا سے مسئلہ کی وجہ سے ساری کتاب پر نظر ڈالنی پڑے۔ جملہ علوم و فنون میں یہی حالت ہے کہ کتاب میں متفرق مضامین ایک جگہ نہیں لکھے جاسکتے تو بطور خود کتاب دیکھنے والے کو اگر کوئی شبہ واقع ہو تو اگرچہ حل اس کا کتاب میں کہیں مذکور ہو مگر چونکہ اسکو اطلاع نہیں ہے کہ وہ حل کہاں مذکور ہے اس لئے دل میں وہ اشکال جم جاتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ خیال ہوجاتا ہے کہ کتاب میں غلط لکھا ہے، مصنف خود نہیں سمجھا۔ حالانکہ کتاب میں غلطی نہیں ہے سمجھ کا قصور ہے، جو شبہ ذہن میں آیا ہے وہ کسی دوسری بحث کے مناسب کتاب کے اس باب میں اس کا حل ہوگا۔ اور پڑھانے والا تمام کتاب پر حاوی ہوتا ہوتا ہے۔ متعلم کے شبہ کرنے سے یا از خود تنبیہًا ہر موقع پر اس کی ضرورت کو بتاتا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں سبقًا سبقًا پڑھنا چاہیئے اور فنون کی کتابوں سے زیادہ تصوف میں خاصکر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلا استاد کبھی مطالعہ نہ کرے۔ دیگر فنون میں تو یہ ہے بہت سے بطور خود دیکھنے سے وہ فن نہ آئے گا اور تصوف میں خطرہ ہے کہ آدمی ہلاکت میں پڑ جائے اور ایمان جاتا ہے ؎

گر روی صد سال در راہِ طلب   راہبر نبود چہ حاصل زاں تعب

"اگر راہِ طلب میں سو سال بلا رہبر کامل کے چلے گا تو تعب مشقت کے سوا تجھ کو کچھ حاصل نہ ہوگا"

گر ہوائے ایں سفر داری دلا   دامنِ رہبر بگیر و پس برآ

اے دل اگر اس ہجرت کے سفر طے کرنے کی خواہش رکھتا ہو تو کسی رہبر کامل کا دامن مضبوط پکڑے چلا آ۔

در ارادت باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفاں را کلید

اے فرید حسنِ عقیدت اور ارادت کا دامن کبھی نہ چھوڑ تاکہ تجھ کو گنج معرفت کی کنجی حاصل ہو جائے

بے رفیقے ہر کہ شد در راہِ عشق عمر بگذشت و نہ شد آگاہِ عشق

بلا مرشد کے طریقِ عشق میں جس نے قدم رکھا، اس نے عمر ضائع کی اور عشق سے آگاہ نہ ہوا۔

ان وکیل صاحب نے احیاء العلوم کی کتاب الخوف کو دیکھا تھا اور ایک مقام کو ناتمام سمجھے اس سے ایسا خوف دل میں بیٹھا کہ بات نہ کر سکتے تھے اور نیند اُڑ گئی مگر یہ خیریت تھی کہ آپ ہی آپ کوئی رائے قائم نہیں کی جیسا کہ آجکل عادت ہے کہ بزرگوں کے اقوال کتابوں میں دیکھکر کسی واقف کار سے اُن کے سمجھنے کی کوشش تو کرتے نہیں اپنی طبیعت سے جو چاہتے ہیں حکم لگا دیتے ہیں، حتیٰ کہ ان بزرگوں سے بدعقیدہ ہو جاتے ہیں اور واہی و تباہی کلمات بکنے لگتے ہیں، یا اس کے موافق غلط عقیدہ رکھکر خراب ہوتے ہیں۔ میرے پاس آئے کہ کچھ امید نہیں، کچھ ہی کرے کہ جنت ملے گی تمام ۲۸
عمر کوشش کرے اور دنیا کو تلخ کر دے مگر کتاب کا لکھا ہوا اگر سچ ہے تو خاتمہ ذرا میں بگڑ سکتا ہے۔

جس وقت میرے پاس کتاب لے کر آئے تو یہ حالت تھی کہ ہاتھ کانپتے تھے زبان لڑکھڑاتی تھی کتاب کی عبارت نہ پڑھی جاتی تھی جیسے کسی کو پھانسی کا حکم سنا دیا جاوے۔ اس وقت یہ بات سمجھ میں آئی کہ حد سے زائد غلبۂ خوف اچھی چیز نہیں۔ میں نے اور مقام اسی کتاب کے دکھلائے، بحمد اللہ ان کے سب شبہے حل ہو گئے اور قلب کو سکون ہوا۔ کہنے لگے آپ نے مجھے بچا لیا، جانے کیا ہوتا، میری جان نہ رہتی یا ایمان جاتا۔

لکھا کتاب ہی میں سب کچھ ہے مگر دوسرے سے مدد لینے کی ضرورت ہے۔ لکھنے والوں نے حتی الامکان سہولت اس قدر کر دی کہ اکثر جگہ شبہات بھی حل کر دیئے ہیں لیکن پھر بھی اُستاد کی ضرورت باقی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات کسی حقیقت کا زیادہ انکشاف بھی مضر ہو جاتا ہے جیسا اُن وکیل صاحب پر استغناءِ حق زیادہ متجلّی ہوا، اور یہ حالت ہو گئی، اسی واسطے بزرگانِ دین نے فرمایا ہے کہ جیسے تجلّی رحمت ہے استتار بھی رحمت ہے۔ واللہ اگر تجلّی تام ہو جاوے تو فنائے عالم ہو جاوے یا جان جاتی رہے یا ایمان جاتا رہے۔ میں نے خود دیکھا وکیل صاحب کو کہ قریب تھا کہ نماز تک چھوڑ دیں۔ وجہ کیا تھی کہ صرف غلبۂ خوف۔ اس واسطے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَبَيْنَ مَعَاصِيْكَ (اپنے خوف سے اتنا جو ہمارے اور آپ کے معاصی کے درمیان حائل ہو جاوے) صرف اتنا خوف چاہتے ہیں کہ معصیت کو مانع ہو اتنا نہیں چاہتے کہ ہم متحمل نہ ہوں۔ معلوم ہوا کہ خوف محمود وہی ہے جو معصیت سے روکے، اور جو خوف خود باعث معصیت ہو جاوے وہ معصیت کی طرح بُرا ہے اسی واسطے لکھا ہے کہ بڑھاپے میں امید غالب رکھے اور جوانی میں خوف، بوڑھے آدمی سے ویسے ہی کچھ نہیں ہو سکتا اگر اور خوف غالب ہو جاوے گا تو رہے سہے بھی ہاتھ پیر پھول جائیں گے، اور امید میں کچھ نہ کچھ کئے ہی جاوے گا، اور جوانی میں قوّت ہوتی ہے خوف کا تحمل ہو سکتا ہے جتنا خوف زیادہ ہو گا نفس کو تنبیہ ہو گی، معصیت سے اجتناب ہو گا۔ اور اعمالِ حسنہ کی کوشش کرے گا۔ ہر وقت کے واسطے تدبیر جداگانہ ہے۔ باطنی طب بھی ظاہری طب کی طرح ہے، کبھی دوا سرد دیتے ہیں کبھی گرم کبھی تنقیہ کرنا پڑتا ہے، کبھی تقویت، اسی طرح باطنی امراض کی تدبیریں بھی مختلف ہیں۔

معلوم ہو گیا ہو گا کہ خوف معین ہے اور ترکِ خواہشات اصل۔ اب صاف ہے کہ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ (ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے) ذریعہ ہے اور مقصود نَهَى النَّفْسَ (نفس کو روکنا) ہے۔ ذریعہ اسی حد تک محمود ہوتا ہے کہ مقصود تک پہنچاوے، اور اگر ذریعہ کو اس حد تک پہنچا دیا جاوے کہ مقصود

فوت ہونے لگے تو یہ مذموم ہے کیونکہ ذریعہ ذریعہ نہ رہا، خوف اسی قدر چاہیئے کہ نفس کو تنبیہ ہو۔

پس خلاصہ طریق کا ترک ہوا ہے اور خوف اس کا معین اور یہی حاصل ہے اس گُر کا۔

اب دیکھو کہ نوکر کو یہ بتا دینا کہ ناشناسا کو اندر نہ آنے دینا کہنے میں ذرا سا ہے کرنے میں بہت ہے جو کام کہ فہرست بتانے سے نکلتا وہی اس سے نکلتا ہے، بلکہ فہرست میں تو افراد محدود ہو جاتے، اگر ان کے سوا کوئی ناشناسا آنے والا ہوتا تو اس کو منع نہ کر سکتا اور اس لفظ کے بعد ایک کے منع سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، اور کسی تعداد تک ناشناسا کی حد نہ رہی، اسی طرح حق سبحانہ تعالیٰ نے گُر بتا دیا کہ اگر سوچ تو ولی ہو جاییے، ایک فرد بھی نافرمانی کا اس سے خارج نہیں۔

دیکھیے نافرمانی ہوتی کیوں ہے، مثلاً نماز پڑھی یا تاخیر کر کے پڑھی یا بے توجہی ہوئی، حضورِ قلب کے ساتھ ادا نہ ہوئی اگر غور کیا جائے تو سبب اس کا ضرور ایسا نکلے گا کہ منجملہ افراد خواہشِ نفسانی کے ہوگا۔ فرض کیجئے کہ نماز نہ پڑھنے کا سبب یہ ہوا کہ نیند آرہی تھی عشاء کا وقت ہوا مگر آرام میں خلل گوارا نہ ہوا، سو کر صبح کر دی، آرام اور تن پروری خواہشِ نفسانی ہی ہے، تاخیر بھی اکثر جب ہی ہوتی ہے کہ آدمی دوسرے کسی کام میں لگا ہوا ہو اس کام کے ادھر بیچ میں رہجانے سے نقصان مال کا اندیشہ ہوتا ہے اس نقصان کو گوارا نہ کیا، اور نماز میں تاخیر کر دی، یہ حُبِ مال ہو کہ منجملہ خواہشاتِ نفسانی کے ہے۔ اسی طرح نماز میں بے توجہی بھی جبھی ہوگی کہ جب توجہ دوسری طرف ہو توجہ کا ایک طرف نہ رہنے دینا بھی نفس ہی کا کام ہے۔ اس کی خواہش سے ہوتا ہے۔

غرض کسی نے ترک طاعت کیا یا ارتکاب معصیت تو صرف نفسانی خواہش

سے اس کے اندر بھی کچھ آگیا۔ ہر چیز میں خیال رکھے کہ نفس کی خواہش ہے یا نہیں۔ جب اس پر کوئی مخالفت کرے گا تو ممکن نہیں کہ اس سے معصیت ہو سکے۔ تھوڑے دنوں عادت ڈالنے سے اس کا نفع معلوم ہو سکتا ہے۔ ہر کام کو کرتے وقت سوچ لیا کیجئے کہ اس میں نفس کو لذت آتی ہے یا نہیں اگر لذت آتی ہے تو سمجھ لیجئے کہ یہ ضرور ایک فرد معصیت کا ہے۔ پھر اس لذت سے مغلوب نہ ہو جائیے اور اس کی مضرت کو پیش نظر رکھے۔ اکثر گناہوں میں سب جانتے ہیں کہ مضر ہیں مگر پھر خواہش نفسانی سے مغلوب ہو کر اس کو کرتے ہیں۔ مثلاً غیبت کرنے والا جانتا ہے کہ اگر اس شخص کو خبر پہنچ گئی تو مجھ سے لڑائی ضرور ہو گی اور بہت سے نقصان پہنچیں گے نفع تو کوئی بھی مرتب نہ ہو گا۔ مگر پھر کرتا ہے اور کرنے سے طبیعت کو سکون ہوتا ہے جیسے کسی سے بدلہ لے لیا۔ یہ خواہش نفسانی ہی ہے جس کے سامنے مضرت کا خوف بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ ۲۱۰

ایسے بھی پرہیزگار ہیں کہ خود غیبت نہیں کرتے مگر سننے میں مزہ آتا ہے۔ بہت کیا تو جب کسی نے غیبت کی رفع الزام کے لئے کہہ دیا، میاں جانے دو اور پھر رغبت کے ساتھ سن رہے ہیں دل میں سمجھ رہے ہیں کہ میں غیبت سے محفوظ ہوں، بہت احتیاط کرتا ہوں، دوسرے کو بھی منع کر دیتا ہوں۔ رہا تو یہ تو اللہ میاں سے، جناب اللہ میاں کو دل کی بھی خبر ہے۔

کار با او راست باید داشتن رایت اخلاص وصدق افراشتن

تم کو خدا تعالیٰ کے ساتھ معاملہ درست رکھنا چاہئے اور اخلاص وصدق کا علم بلند رکھنا چاہئے۔

فقط زبانی باتوں سے کیا کام چلتا ہے۔ اگر ان کے باپ کو کوئی گالیاں دینے لگے تو کیسے لڑنے لگیں گے۔ ممانعت اس کو کہتے ہیں اس وقت یہ نہ ہو گا کہ ایک دفعہ اسے منع کر دیں اور پھر بیٹھے سنتے رہیں۔ حضرت ابن

منع سے برأت نہیں ہوتی۔ غیبت میں یہ بھی شامل ہے۔ دیکھئے کہ بعد ممانعت کے اگر وہ خاموش ہو جائے تو ان کے دل میں اشتیاق و انتظار رہتا ہے۔ ظاہراً غیبت نہ کی یہی ظاہر بینوں کی نگاہ میں پرہیزگار بنجائیں مگر باطن میں تو مرض موجود ہے، نفس نے جو خواہش کی تھی اس کا ظاہر تک اثر نہ آیا یہی قلب میں تو اس سے التذاذ اور اس کی طرف میلان عزم کے ساتھ موجود ہے۔ یہی اتباعِ نفس ہے۔ غرض سوچنے والا سمجھ سکتا ہے کہ معصیت کس حد تک ہوگی۔ جہاں تک خواہشِ نفسانی پائی جائے۔ یہ ایسا جامع لفظ ہے کہ کوئی فرد معصیت اس سے باہر نہیں جا سکتا۔ جب کوئی معصیت ہوگی، خواہشِ نفسانی سے اور برائی باوجودیکہ ظاہر ہے مگر نفس کی چال میں بڑے بڑے ہوش مند آجاتے ہیں۔ کوئی چیز رشوت میں مثلاً ملنے لگے تو نفس ضرور بتاتا ہے کہ فلاں فلاں کام مجھے کرنے ہیں اُن کے لئے اتنے خرچ کی ضرورت ہے، اور ساتھ ساتھ تاویل ذہن میں آتی ہے کہ یہ شخص خوشی سے دیتا ہے اور مجھے ضرورت ہے ہی اس وقت لے لینا چاہیئے، پھر اللہ میاں کریم ہیں، یہ ضرورتیں بھی رفع ہو جائیں اور پھر توبہ سے گناہ بھی نہ رہیگا، کیسی اچھی بات ہے۔ حضرت یہ سب تدبیریں ہیں جن سے نفس جال میں پھانستا ہے، اور اس تاویل کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب کہ خوف دل میں ہوتا ہے، ورنہ تاویل کی بھی کون ضرورت ہے۔ اور اتنی دیر کب گوارا ہے گردن پکڑ کر حکم دیا کہ رقم ہرگز جانے نہ پائے بس اس کی تعمیل ہوگئی۔ ہاں جنکو محتاط پاتا ہے ان کے لئے خواہ مخواہ کی ضرورتیں کھڑی کر دیتا ہے اور سمجھا دیتا ہے کہ ان کا پورا کرنا ہے، حالانکہ یہ اسراف ہے۔ مگر ضرورتیں ایسی تراش لیتے ہیں کہ اس کو اسراف بھی نہیں سمجھتے۔ آجکل کے عقلمند اس مرض میں بہت مبتلا ہیں۔ مجھے ایک شخص ملے اور خوش خبری سنائی کہ لڑکا نائب تحصیلدار ہوگیا۔ میں نے کہا بڑی اچھی بات ہے، اب ذرا صاحبزادے کو یہ ۴۲

تنبیہ کیجیے کہ اسراف نہ کریں۔ کہا جناب کچھ سامان تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی آمد و رفت ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ چار بھلے مانس آ کر بیٹھیں اور میز کرسی لیمپ وغیرہ گھٹیا رکھے ہوں یا مکان شاندار نہ ہو۔

یہ اسراف ہے جسے ضروری سمجھ رکھا ہے حالانکہ ضرورت دو قسم کی ہوتی ہے ایک واقعی اور ایک فرضی۔ واقعی ضرورت کی تو انتہا ہو سکتی ہے اور فرضی ضرورت کی کہیں انتہا نہیں۔ ظاہر ہے کہ فرضی میں بے انتہا گنجائش ہے۔ فرض میں محالات تک آ سکتے ہیں۔ جب فرضی ضرورت کی کوئی انتہا نہیں تو اس کے رفع کے لئے کونسی رقم کافی ہو سکتی ہے۔ دنیا میں جو بھی رقم لی جائے گی متناہی ہوگی۔ پھر متناہی لامتناہی کے برابر کیسے ہو سکتی ہے۔

اسراف معصیت تو ہے ہی اور وبال اخروی تو آخرت میں ہوگا، مگر دنیا میں بھی اس کا نتیجہ دیکھ لیجیے۔ کہ خاندان کے خاندان اس کی بدولت تباہ ہو گئے۔ ایک شادی بھی جس نے کی اس میں فرضی ضرورتیں پوری کیں تو نقدی اور جائداد اور مال و متاع سب اُن کے نذر کر دیا۔ اور پھر بھی پورا نہ ہوا۔ قرض لے کر بمشکل آبرو بچائی۔ پھر اس قرض سے بعد چندے آبرو بھی گئی۔ ذرا سا ختنہ ہے یا بسم اللہ ہے اور اس کے لئے ایک بڑی رقم کی ضرورت ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سے آنی چاہئے خواہ رشوت لے کر ہو یا سودی قرض لے کر ہو یا گھر بیچ کر، ایسا نہ ہو کوئی رسم رہ جائے۔ یہ سب فرضی ضرورتیں ہیں، بیوی کے کان میں پانسو سے کم کا زیور نہ ہو خواہ میاں کی اوقات دو ہی پیسہ کی کیوں نہ ہو، کہیں سے پانسو لاؤ تب مُنہ دکھاؤ۔ میز کرسی، پوشاک حسب قاعدہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی بڑا آدمی آئے ہمیں چھوٹا کہدے۔ حضرت بڑے آدمی کو یہ بھی تو معلوم ہوگا کہ میاں کی اوقات صرف پچاس ہی روپے کی ہے پھر بڑا کیسے کہہ دے گا۔ یہ ضرورت نہیں

صرف فیشن ہے۔
لطف یہ ہے کہ علماء رسموں کو منع کرتے ہیں تو یہ لوگ اُن کے شریک ہو جاتے ہیں اور بڑے شکرگذار ہوتے ہیں کہ صاحب یہ تو آپ بڑا کام کرتے ہیں کہ فضولیات کو چھوڑاتے ہیں۔ کیا ضرورت ہے کہ اتنا سونا لاد لیا جائے کان کٹ پڑیں، یہ روپیہ کسی ایسے کام میں کیوں نہ لگایا جاوے جس سے راس المال محفوظ رہے، اور چار پیسے ملنے لگیں، تجارت کی جائے یا جائیداد خرید لی جائے۔ شادی کی رسمیں مطلقاً چھوڑ دی جائیں، اس روپے سے لڑکی کے لئے کوئی صورت بسر اوقات کی کیوں نہ کر دی جائے۔ آتشبازی وغیرہ سے ذرا سی دیر کا حظِ نفس نہ ہوا نہ سہی۔
غرض علماء کی تائید کرتے ہیں۔ البتہ پُرانی وضع کے لوگوں کو ضرور شاق ہوتا ہے۔ اور ان نئے فیشن کے لوگوں کو جب ترکِ دین آسان ہوا تو رسم دنیا کیا۔ یہ لوگ ساتھ دیتے ہیں اور بھولے سیدھے لوگ خوش ہوتے ہیں کہ یہ بھی علماء کے ہمخیال ہیں بُری بات سے منع کرتے ہیں لیکن چوری انکی پکڑی گئی کہ رسموں سے بیوی کو روکتے ہیں اصلاحِ میز و کرسی کے لئے نہ اس واسطے کہ اسراف نہ ہو، یا روپیہ کسی منفعت کے کام میں لگے۔ بلکہ اس لئے کہ اِدھر سے روپیہ بچے تو اپنے فیشن کو درست کریں، میز و کرسی سے کمرہ سجائیں، ہارمونیم باجا منگائیں، کوئی نیلام سے خالی نہیں جاتا۔ بیوی پر تو تقاضا ہے کپڑا کم پہنو، سال بھر کے لئے صرف دو جوڑے کافی ہیں، گھر میں اپنے سب طرح بسر ہو سکتی ہے۔ بہت کرو کہیں جانے کے لئے ایک اُجلا جوڑا بنا لو، زیور جو کچھ میکہ سے لائی ہو وہی کیا تھوڑا ہے، بہت ہوس اچھی نہیں ہوتی، سادگی کے بھی خلاف ہے۔ ایک صاحب نے بیوی سے کہا ہم کماتے کماتے مرے جاتے ہیں اور تمھیں ذرا خیال نہیں جتنا آتا ہے سب خرچ ہو جاتا ہے ایک پیسہ نہیں بچتا، خرچ میں کمی نہیں کرتی بیوی نے کہا میرے یہاں کوئی بازار کی چاٹ

نہیں آتی، کوئی چیز ضرورت سے زائد میں نہیں منگاتی، کسی کو ایک پیسہ تمہاری بلا اجازت میں نہیں دیتی، جو کچھ خرچ ہے تمہارا ہی ہے۔ میں کس چیز میں زیادہ خرچ کرتی ہوں، اور کونسے خرچ میں کمی ہوسکتی ہے۔ کہا نہیں تم نے خرچ بڑھا ہی رکھا ہے۔ اگر ماما نہ رکھو تو اس کی تنخواہ اور خوراک بچے یا نہیں ہم ایک چکی خرید دیں خود پیس لیا کرو اور روز کی پنہاریوں کی دقت نہ ہو اور پسائی کے دام بچیں۔ اس میں تمہارا ایک اور بھی نفع ہے کہ تندرستی اچھی رہے گی، ریاضت کرنا آدمی کے لئے بہت ضروری اور مفید ہے۔ گھر کی لیپ پوت بھی خود کر لیا کرو۔ ذرا ذرا سے کاموں کے لئے مزدور ڈھونڈنے پڑتے ہیں، ان سب ترکیبوں سے ایک کافی رقم بچ سکتی ہے، تھوڑا ہی تھوڑا کرکے بہت ہوجاتا ہے مگر جب تمہیں خیال ہو۔

غرض بیوی کو سب مدوں میں تخفیف کی تدبیریں بتائی جاتی ہیں۔ وہی بیچاری گلا گھونٹنے کے لئے ہے ہر طرح بسر کرسکتی ہے مگر تمہاری کسی مد میں ذرہ بھر کمی نہ ہو۔ کمرہ میں معمولی لیمپ سے کام نہ چلے برقی لیمپ ہونا ضروری اور وہ بھی بقدر ضرورت نہیں بلکہ دس پانچ رکھے ہیں، نازک چیز ہے، شاید کوئی ٹوٹ جائے تو دوسرا موجود رہے۔ اور ان میں بھی آج ایک نئی ایجاد ہوجائے تو پہلے خریدے ہوئے سب ردی ہیں اب نئے طرز کے خریدنے چاہئیں۔ وعلیٰ ہذا۔

بیوی کے لئے تو زیور بھی اسراف ہے اور آپ کے لئے کوئی چیز بھی اسراف نہیں۔ بیوی کا اسراف ایک طرح کا ہے پرانے فیشن کا اور میاں کا اسراف دوسری طرح کا ہے نئے فیشن کا۔ دونوں کو چھوڑو وَتَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيعًا (میں نے لات وعزیٰ سب کو چھوڑ دیا) یہ سب فضولیات ہیں جنکو نفس ضروری بتاکر طلب کرتا ہے، ان کی تکمیل خواہش نفس کی تعمیل ہے جس میں بڑے بڑے عقلمند گرفتار ہیں۔ معلوم نہیں عقل کس طرح روا رکھتی ہے کہ

اپنے آپ کو دشمن کے ہاتھ میں دیدیا جائے جس کی دشمنی دنیا میں بھی ظاہر
ہو چکی، اسراف کے نتائج آپ نے دیکھ لئے ہیں۔ مسلمان کا کام تو یہ تھا کہ
ہر کام میں پوچھتا کہ حق تعالیٰ کا کیا حکم ہے بجائے اس کے ہر کام میں
شیطان اور نفس سے پوچھا جاتا ہے کہ سرکار کا کیا حکم ہے اور جو اس نے
کہدیا بے دھڑک کر ڈالا، خواہ اللہ کے خلاف ہو یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے
مسلمانو! کیا جواب ہوگا اگر پوچھا جائے گا أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي
آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ وَأَنِ اعْبُدُونِي هَٰذَا
صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ۝ وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا ۝ أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ۝
هَٰذِهِ جَهَنَّمُ الَّتِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ ۝

"پوچھیں گے اے بنی آدم کیا میں نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ
شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ تمہارا دشمن ہے، میری عبادت
کرنا، یہ سیدھا راستہ ہے، اور دیکھ چکے تھے کہ بہتوں کو اس نے ۴
گمراہ کر دیا تھا، کیا تمہیں عقل نہ تھی، اب یہ جہنم موجود ہے جس
کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا؟"

میں کہتا ہوں اگر صرف پوچھا ہی جائے اور دوزخ نہ بھی ہو تو یہ کیا تھوڑا
ہے کہ کہا جائے، کیوں صاحب ہمارا عہد یاد ہے، ہم سے تعلق قطع کرکے
باوجودیکہ ہم ہر وقت مہربان تھے، اس سے جوڑا جو ہر وقت دشمن تھا۔ اس کا
جواب کیا ہو سکتا ہے سوائے اس کے کہ خجالت اٹھانی پڑے۔ دنیا میں تو قاعدہ
مسلّمہ ہے کہ بھلائی کا بدلہ بھلائی۔ مگر اللہ میاں کے ساتھ معاملہ برعکس
کیا جاتا ہے۔ جس قدر اُس طرف سے احسانات زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر
اِس طرف سے کفرانِ نعمت ہوتا ہے۔ جس قدر اُدھر سے ساتھ دیا جاتا ہے
اسی قدر اِدھر سے قطع کیا جاتا ہے۔ اور بمقابلہ محسن کے دشمن کی پیروی
ہوتی ہے۔ دشمن نے جس چیز کا حکم کر دیا اس کو کہا جاتا ہے کہ اس کی ضرورت ہے

اور اللہ میاں نے جس کا حکم کیا وہ قدرت سے باہر ہے۔ اور ترقی سے روکنے والا ہے۔ حضرت یہ چیزیں جن کو نفس ضروری ثابت کرتا ہے ان میں انہماک سے حق تعالیٰ سے بُعد بڑھتا ہے۔ اور غفلت پیدا ہوتی ہے ؎

عاقبت سازد ترا از دیں بری ٭ ایں تن آرائی وایں تن پروری

تیری تن آرائی اور تن پروری آخر کار تجھ کو دین سے دور کردے گی"

باہواؤ آرزو کم باش دوست ٭ چوں یضلک عن سبیل اللہ اوست

یعنی آرزو اور ہوائے نفسانی کا پیرو مت بن چونکہ اس کی یہ حالت ہے کہ تجھکو اللہ تعالےٰ کے راستے سے بہکا دیتی ہے "

تاہوا تازہ است ایماں تازہ نیست ٭ چوں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

جب تک خواہش کے تابع ہے تیرا ایمان تازہ نہیں ہے مانند ہوا کے سوائے قفل کے اس کا دروازہ نہیں ہے "

٥ دیکھو ایک جگہ کیا شکایت فرماتے ہیں اَرَءَیۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰـهَهٗ هَوٰىهُ "اس شخص کو بھی دیکھا تم نے جس نے اپنا معبود خواہشِ نفسانی کو بنایا" ہم کو چھوڑ کر ہمارے دشمن کی اطاعت اختیار کی۔ تعجب ہے کہ اللہ میاں نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، احکام کی مصلحتیں بتائیں اور سمجھایا اور خاک نہ سُنا۔ اور نفس نے اندر سے ایک شرہ چھوڑ دیا کہ اِفۡعَلۡ ہٰکَذَا "ایسا کر" بس ایسی بیعت کی ہے کہ کوئی ضرورت نہیں دل کی اور کچھ حاجت نہیں مصلحت دریافت کرنے کی جو حکم ہوا فوراً تعمیل۔ اللہ میاں کے احکام میں کبھی ہر ہر بات کی علت ڈھونڈھی جاتی ہے اور اس کی مصلحت پوچھی جاتی ہے۔ حالانکہ شرائع میں علل اور مصالح ضرور ہیں مگر ہر شخص کی عقلِ نارسا کی رسائی تو وہاں تک نہیں پھر ہم کو علت نکالنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب دلیل صحیح سے ثابت ہوگیا عمل کر لیا۔ کبھی اس میں گنجائش نکالی جاتی ہے کہ کیوں صاحب اس کے خلاف کرنے میں کچھ اسلام سے تو خروج نہیں ہوتا

بس جب اسلام سے خروج نہیں ہوتا اور نفس کا حکم خلاف پر ہے ہی جس کو ضرورت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے پھر کیوں نہ کیا جائے۔ یہ حالت بھی ان لوگوں کی ہے جن کو اسلام کا کسی قدر پاس ہے اور دعویٰ ہے کہ ہم شریعت کے خلاف کوئی کام نہیں کرنا چاہتے۔ (خلاف شریعت شاید منحصر فرد واحد ہے۔ یعنی وہ عمل جس میں خروج عن الاسلام (اسلام سے خارج ہونا ہی لازم آجائے)۔ اور جو لوگ کہ پورے آزاد ہیں اُن کو تو دلیل غیر دلیل سے بحث ہی نہیں، ان کے نزدیک گویا خود احکام کا خلاصہ ہوائے نفس ہی ہے۔ اللہ میاں کے احکام کوئی چیز ہی نہیں۔

جو لوگ اسلام کا پاس رکھتے ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیوں صاحب جس قدر حکمتیں اللہ میاں کے احکام میں ہوتی ہیں اگر نفس کے حکم میں ہوتیں تو کیا حرج تھا۔ اتنی حجت تو کیا اگر نفس سے خواہش کے وقت صرف اتنا ہی پوچھ لیا کریں کہ اس میں کیا مصلحت ہے۔ جس کی وجہ سے اختیار کیا جائے، اور پھر مصلحت میں غور کر لیا کریں کہ واقعی ہے یا فرضی، تب بھی تو بہت سی بُرائیوں سے حفاظت ہو جائے۔

مگر کہاں اس کے ہاتھ میں تو ایسی باگ دی ہے کہ جب وہ کہے چل چلنا پڑتا ہے اور جب کہے ٹھیر، ٹھیرنا پڑتا ہے۔ نفس اگر خندق میں گرائے تو خندق ہی میں گرنا پسند ہے اور اگر آسمان پر چڑھائے تو آسمان پر چڑھنا قبول ہے اللہ میاں نے ایک حکم کیا کہ اس میں مصلحت تھی اس کو نہ کیا۔ اور نفس نے ایک خواہش کی جس میں سراسر مضرت تھی اس کو کر ڈالا،

ایک تاجر سے کوئی سَو کا مال پچیس اوپر سَو کو خریدتا تھا مگر نہ دیا اور دیا کہاں جہاں پچیس اور کم ملے۔ نہ معلوم اوّل خریدار سے اس کو اتنی منافرت کیوں ہے اس کو اتنا خیال کہ پچیس زیادہ دیتا ہے گویا وہ اپنا نقصان کرتا ہے کہ تجارت میں کچھ اس کے چند پڑ رہے اور ان کو ایسی ضد کہ اپنا مال

پھینکیں گے اور خسارہ ہی دیں گے مگر تمھاری مخالفت کو ہاتھ سے نہ جانے دیںگے افسوس۔

خواہشِ نفسانی وہ بُری چیز ہے کہ دنیا کی بھی خرابی اور دین کی بھی صاحبا! معصیتیں ہیں کہ ان میں دنیاوی نقصان ہیں۔ معصیت میں دنیا کی بھی مضرتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اللہ میاں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں آدمی اسباب کو جمع کرتا ہے مگر وہ اسباب، مُؤَدِّیْ اِلَی الْمُسَبَّب (سبب کی طرف پہنچانے والے) بہت کم ہوتے ہیں۔ ہر کام میں پریشان رہتا ہے۔ بعض آدمی ذرائع کم رکھتے ہیں اور کام زیادہ نکلتا ہے۔ اس کے برعکس اس کو ذرائع زیادہ رکھنے پڑتے ہیں اور کام اتنا بھی نہیں ہوتا۔ اور ایک یہ کہ رزق میں تنگی ہوتی ہے۔ آپ کہیں گے ہم پر تو تنگی نہیں۔ میں کہتا ہوں رزق سے مقصود کیا ہے اطمینان یہ معصیت کے ساتھ حاصل نہیں ہوتا، اطمینان فراغِ قلب کا نام ہے ناجائز طریق سے کتنا ہی مال حاصل کر لیجئے مگر جو نشاط اور بے فکری قلب کو تھوڑے حلال کے مال سے ہوتی ہے وہ ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ ایسی بات ہے کہ تجربہ ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ وجدانی سی بات ہے شعر ؎ پرسید یکے کہ عاشقی چیست ؎ گفتیم کہ چوما شوی بدانی

"ایک شخص نے پوچھا عاشق کس کو کہتے ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ جب ہماری طرح ہوگا تو تجھ کو معلوم ہوگا کہ عاشقی کیا ہے"

عنین محض کو کتنا ہی سمجھاؤ کہ عورت کی یہ لذت ہوتی ہے مگر وہ ہرگز نہ سمجھے گا اور اُلٹا تمھیں کو بیوقوف بنائے گا۔ اگر اس کو سمجھانے کی کوئی تدبیر ہے تو بس یہ کہ اس کا علاج کرو، جب قوتِ رجلیت پیدا ہو جائے گی آپ بیوقوفی اور عقلمندی کو سمجھ لے گا، معصیت کو چھوڑ کر طاعت اختیار کرو دیکھو قلب میں کیا بات پیدا ہوتی ہے۔ آشکارا ہو جائے گا کہ اطمینان یہ چیز ہے۔

معصیت کی دنیاوی مضرتیں

اس پر دلیل فلسفی بھی ہے وہ یہ کہ معصیت کرنے والا غیر اللہ کا طالب ہے اور اس تک پہنچ جانا اور اس کو پالینا ضروری نہیں، اور مطیع طالب ہے اللہ میاں کا اور وہ ہر وقت اس کے پاس ہیں۔ ادھر سے ذراسی کوشش چاہئے اُدھر سے خود کرم فرماتے ہیں۔ غیر اللہ کی طلب پر چونکہ نتیجہ کا ترتّب ضروری نہیں اس لئے کامیابی نہیں ہوتی۔ اور دل کو فراغ حاصل نہیں ہوتا اور اللہ میاں کی طلب پر نتیجہ مترتب ہو جاتا ہے، اس لئے قلب کو راحت ملتی ہے۔ اسی کا نام اطمینان اور فراغ ہے۔ طاعت وہ چیز ہے کہ اس کی لذت وہی جانتا ہے جو پاتا ہے ؎

سالہا تو سنگ بودی دل خراش ؎ آزموں را یک زمانے خاک باش

برسوں تو تم دلخراش پتھر (متکبر) بنے رہے آزمائش اور امتحان ہی کی نظر سے کچھ دن خاک بنکر دیکھ لو۔

سالہا تو سنگ بودی دل خراش ؎ آزموں را یک زمانے خاک باش ۸

ارے غافل پتھر تو برسوں رہا ہے امتحان کے لئے ذرا دیر خاک ہو کر بھی دیکھ جو کبھی نام بھی لے پتھر ہونے کا۔ خاک ہونا وہ چیز ہے کہ خاک ہو کر پتھر ہونا کسی نے قبول نہیں کیا۔ اور پتھر بہتیرے خاک ہو گئے۔

طاعت وہ چیز ہے کہ جب تک کسی نے کی نہیں جبھی تک وہ علیحدہ ہے جہاں تھوڑی سی بھی کی پھر طاعت خود اس کو نہیں چھوڑتی۔ وہ چھوڑنا چاہتا ہے مگر یہ اُڑ اُڑ کر لپٹتی ہے۔ کر کے دیکھو، امتحاناً ہی سہی۔ میں کہتا ہوں امتحان کرنے سے تو اثر کیا بھولے سے بھی طاعت اگر ہو گئی تو اثر ضرور کرے گی۔ کپڑا بھولے سے رنگ میں گر جائے تو گو وہ بات نہ آئے گی کہ اگر کوئی قصداً رنگتا، مگر دھبے تو ضرور پڑ ہی جائیں گے۔ تجربہ ہوا ہے لوگوں کو کہ دھوکہ سے اطاعت ہو گئی اور اثر ہو گیا۔ قصہ مشہور ہے کہ ایک چور بادشاہ کی لڑکی پر

ع۸ غالباً حضرت مولانا نے وعظ کے وقت اس کو مکرر پڑھا ہوگا اس لئے مکرر لکھا گیا۔ ۱۲ محمد انعام اللہ عفی عنہ

عاشق تھا ایک روز کہیں چوری کے ارادہ سے بادشاہ کے یہاں پہنچ گیا۔ وہاں بادشاہ اور بیگم میں اسی لڑکی کی شادی کی نسبت گفتگو تھی۔ بادشاہ کہہ رہے تھے کہ میں تو اس کی شادی کسی ایسے شخص سے کروں گا کہ نہایت عابد وزاہد متقی ہو۔ یہ چور صاحب چوری تو بھول گئے اور بہت غنیمت سمجھا کہ آج خوب کام بنا وہاں آکر ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ اور دن رات عبادت کرنا شروع کی، تہجد بھی، اشراق بھی، چاشت بھی، غرض عبادت ہی سے کام تھا۔ لوگوں میں شہرہ ہوا کہ ایک بڑے عابد صاحب تشریف لائے ہیں رفتہ رفتہ تمام شہر میں ان کی شہرت ہوگئی، اُدھر بادشاہ نے آدمی تعینات کر رکھے تھے کہ دیکھو شہر میں سب سے زیادہ عابد و پرہیزگار کون ہے۔

ان مخبروں نے خبر دی کہ ایک عابد صاحب فلاں مسجد میں قیام رکھتے ہیں، ان سے زیادہ متقی و پرہیزگار کوئی نظر نہیں آتا۔ بادشاہ نے خاص
۹ وزیر کو ان کے پاس پیغام لے کر بھیجا اور یہاں کام ہوچکا تھا۔ انھوں نے التفات بھی نہ کیا۔ خیر وزیر نے نہایت ادب سے پیغام شاہی سنایا؛ انھوں نے کہا دراصل نیت تو میری فاسد تھی اسی غرض سے عبادت شروع کی تھی مگر حق سبحانہ تعالیٰ نے اپنا فضل کیا، اب مجھے نہ آپ کی لڑکی کی ضرورت ہے، نہ آپ کے جاہ وحشم کی بس تشریف لیجائیے اور میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔

طاعت ایسی ہی چیز ہے کہ بعض اوقات گو اس میں غرض صالح نہ ہو مگر انجام کار اسی سے درستی ہوجاتی ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ بہت لوگ اغراض فاسدہ سے اسلام قبول کرتے ہیں لیکن آخر کو وہی اسلام کامل ہوجاتا ہے ایسوں کے اسلام کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہئے۔ بعض لوگ غافل نادان کہتے ہیں کہ ان بھکاریوں کو مسلمان نہ کرنا چاہئے۔ ان لوگوں نے پیشہ کرلیا ہے انکے مسلمان کرنے کا نتیجہ ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ مسلمانوں سے روپیہ ٹھگتے

پھریں، کوئی کہتا ہے میرے ذمہ اتنا قرضہ تھا مسلمان لوگ مل کر ادا کریں۔ کوئی کہتا ہے مجھے روزہ نماز سیکھنے کے لئے فلاں فلاں کتاب کی ضرورت ہے، مسلمان لے دیں۔ اس میں اسلام کی بدنامی ہے کہ مسلمان ایسے ہوتے ہیں۔ مجھ سے ایک صاحب یہی فرماتے تھے میں نے ان کو جواب دیا کہ اگر ایسی بدنامی کی وجہ سے اخراج عن الاسلام (اسلام سے خارج کرنا) کریں تو آپ میں بھی ایسے عیوب ہیں جن سے اسلام بدنام ہوتا ہے۔ اُن کی وجہ سے آپ کو اسلام سے کیوں نہ نکال دیں۔ نیا مسلمان تو جنید بغدادی ہی ہو اور موروثی شیطان بھی ہو تو پروا نہیں۔

میں تجربہ سے کہتا ہوں کہ بعض اوقات مسلمان کسی طمع سے ہوتا ہے، مال کی طمع ہو یا اور کسی چیز کی مگر اسلام وہ چیز ہے کہ خود دل میں جگہ کر لیتا ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللّٰهِ فَاَبَى الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ
۱۰ يَّكُوْنَ لِلّٰهِ (میں نے علم سیکھا تو تھا غیر اللہ کے لئے مگر علم نے خود نہ مانا اور اللہ ہی کا ہو کر رہا) آگ جلاؤ اور یہ قصد نہ کرو کہ لکڑی جلے۔ تھوڑی دیر میں لکڑی راکھ ہو جائے گی۔ آگ میں یہ اثر کہ لکڑی میں خود گھس جاتی ہے، آپ کے قصد پر موقوف نہیں۔ کسی بزرگ سے کسی نے کہا دیکھئے صاحب فلاں آدمی دکھلاوے کا ذکر کیا کرتا ہے۔ کہا، تو دکھلاوے کا بھی نہیں کرتا وہ دکھلاوے کا کرتا ہے مگر کرتا تو ہے۔ کبھی نہ کبھی ذکر اس کے دل میں جگہ کر ہی لے گا اور تجھے کیا امید ہے۔

ہمارے حضرتؒ فرماتے تھے عبادت اوّل ریا ہوتی ہے چند روز میں عادت ہو جاتی ہے۔ پھر عبادت اور اخلاص۔ یہ بات بالکل صحیح ہے، دیکھ لیجئے کہ بچپن میں آدمی نماز پڑھتا ہے اس وقت کیا حالت ہوتی ہے۔ پھر سن شعور میں اور کیفیت ہوتی ہے اور بڑی عمر میں کچھ اور ہی بات پیدا ہو جاتی ہے، بچپن میں استاد یا والدین کے خوف سے پڑھی جاتی ہے۔

اگر کسی وقت ان کی نگرانی نہیں ہوتی تو ٹال بھی دی جاتی ہے یا بے وضو ہی اُڑا دیتے ہیں، یہ ریا ہی ہے۔ پھر پڑھتے پڑھتے سن شعور میں پہنچکر طبیعت مانوس ہو جاتی ہے۔ اور جیسا کہ اور امور ضروری کا تقاضا ہوتا ہے ایسا ہی نماز کا ہونے لگتا ہے۔ تاوقتیکہ ادا نہ کرلی جائے، طبیعت پر بار رہتا ہے۔ اگر نفس کبھی ٹالنا چاہتا ہے تو زائد سے زائد تاخیر کی نوبت آتی ہے یہ نہیں ہوتا کہ قضا کردیں۔ یہ مرتبہ عادت کا ہے۔ اس کے بعد تو بحمد اللہ یہ کیفیت ہوتی ہے کہ بلا نماز چین ہی نہیں پڑتا۔ یہ مرتبہ اخلاص کا ہے۔

غرض عبادت ابتداءً کسی کیفیت کے ساتھ ہو مگر کبھی نہ کبھی خود دل میں جگہ پکڑ لیتی ہے۔ اس کا تجربہ مدرسہ میں رہ کر اچھی طرح ہوا۔ بہت سے طلبہ کو دیکھا کہ اوّل ان کی نیت اچھی نہیں ہوتی، مگر فارغ ہوتے ہی مخلص بنجاتے ہیں۔ بالکل حالت پلٹ جاتی ہے۔ وجہ یہی ہے ۱۱
کہ اوّل اگرچہ نیت ٹھیک نہ تھی مگر شروع ایسی چیز کو کیا ہے کہ وہ خود ٹھیک کرلیتی ہے۔ یہی بات ہے کہ اس کو جو لوگ نہیں جانتے ہیں وہ طالب علموں کی ابتدائی حالت دیکھکر طرح طرح کے اعتراض کیا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ لوگ بالکل مہمل ہوتے ہیں، دنیا سے تو نا آشنا ہیں ہی دین میں کیا کمال پیدا کیا۔ میں کہتا ہوں ابھی ان کی حالت کیا دیکھتے ہو، پڑھتے رہو انہی میں مقتدا لوگ ہوں گے اور انہی میں غزالیِ وقت بھی ہوں گے۔ طالب علموں سے اگر ذرا سا قصور ہو جاوے تو تمام شہر میں سُن لیجئے، اسلامی مدرسہ والوں نے یوں کیا، کس قدر مغائرت اس لفظ سے ٹپکتی ہے۔ آپ کو ان سے تعلق رکھنا چاہئے یا قطع کرنا۔ یہ تمھارے دین کے حامل ہیں ان سے قطع کرنا کس سے قطع کرنا ہے، آپ کو ان سے تعلق ہی رکھنا چاہئے۔ اگر آپ کا بچہ بازار میں کسی سے لڑ آئے اور یہ بھی آپکو

معلوم ہوجائے کہ سراسر زیادتی اسی کی تھی تو آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ اگر لڑائی کے وقت آپ پہنچ جائیں گے تو لڑکے کی زیادتی اور عدم زیادتی کی طرف تو خیال بھی نہ ہوگا اس وقت تو اسی کی حفاظت کریں گے اور جس طرح ممکن ہوگا اس کی بات نیچی نہ ہونے دیں گے۔ پھر اس غصہ کے فرو ہونے کے بعد علیحدگی میں بچہ کو فہمائش کریں گے۔ کہ آئندہ ایسی زیادتی نہ کرنا (یہ بھی جب ہے کہ آپ بہت ہی حق پسند ہوں ورنہ باطل ہی کی پیروی ہوگی اور اس کو کچھ علامت وغیرہ نہ ہوگی) اور اگر کوئی غیر آدمی پوچھے گا کہ میاں کیا بات تھی تو یا تو اپنے بچہ کیسی کہیں گے اور اگر بالکل ہی صریح خطا ہوگی تو کہدیں گے کچھ نہیں بازار میں ایک آدمی سے کچھ جھگڑا ہوگیا تھا، لڑکا تیز مزاج ہے دبتا کسی سے ہے نہیں بات بڑھ گئی۔

اپنے بچہ کے عیب کو کیوں مشہور نہ کیا۔ اس کا عیب عیب نہیں ہے

۱۲ وجہ یہ ہے کہ اس سے آپ کو طبعی تعلق ہے، اس کی بدنامی آپ کی بدنامی ہے، بچہ سے طبیعت کے حکم سے تعلق ہے۔ طالب علم سے حق تعالیٰ کے حکم سے تعلق رکھا ہوتا اس کے قصور کو بھی اپنے بچہ کے قصور کی طرح دبایا ہوتا۔ بچہ کی بدنامی میں اپنی بدنامی سمجھی تھی۔ طالب علم کی بدنامی میں اپنے دین کی بدنامی سمجھی ہوتی۔

بعض لوگ کہدیتے ہیں کہ اگر ان کے قصور نہ پکڑے جائیں تو ان کو تنبیہ کیونکر ہو۔ میں کہتا ہوں اپنی طبیعت ہی سے انصاف کرلو کہ جس طرح اپنے بچہ کو تنبیہ کرتے ہو اسی طرح طالب علم کو کرتے ہو یا نہیں! فرض کرلو کہ تمہارا بچہ اس قدر شریر ہو کہ باوجود فہمائش کے بھی نہ مانے اور بدتر سے بدتر حرکتیں کرے جس سے خاندان بھر پر دھبہ آجائے، ننگ و ناموس کو بٹہ لگ جائے تب آپ اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں؟ کیا اس سے بالکل قطع کردیتے ہیں قطع نہیں کرتے۔ اور اگر کوئی قطع بھی کرے تو دل پر وہ صدمہ رہتا ہے کہ

موت سے بدتر ہے۔ باوجود قطع کے تمام عمر یہی چاہتے ہیں کہ کاش یہ احمق اپنی حرکتیں چھوڑ دے۔ خود سمجھانے سے جب اثر نہیں ہوتا تو جن کا وہ لحاظ کرتا ہے اُن سے فہمائش کرائی جاتی ہے۔ طالب علم کے کسی بڑے جرم پر تو کیا ایک چھوٹے سے قصور پر بھی میں پوچھتا ہوں کہ اسی طرح مشفقانہ تنبیہ ہوتی ہے یا اجنبیانہ۔ اگر اسی طرح مشفقانہ تنبیہ آپ کرتے ہیں تو الحمد للہ وہو المقصود (یہی مقصود ہے) اور اگر ایسا نہیں ہے تو میں پھر کہتا ہوں کہ ان سے آپ نے قطع کیوں کیا، کیا وہ آپ کے دین کے محافظ نہیں ہیں؟ یا آپ کے ذمہ دین کی حفاظت نہیں ہے؟ ان کے ایک قصور پر آپ سب کو بدنام کیوں کرتے ہیں۔ کیا آپ کے سب بچے ایک ہی سے صالح ہوتے ہیں! یا بچپن ہی سے آپ کے بچے تمیزدار ہوتے ہیں؟ ان میں بھی اگر ایک کم سمجھ ہے تو بڑے بڑے سمجھدار بھی تو ہیں، آج اگر یہ کم استعداد ہیں تو کل امام وقت اور غزالیِ
۱۳ وقت بھی تو انہی میں سے ہوں گے۔ ابتدائی حالت دیکھ کر اُن پر اعتراض مت کرو۔ ہر طاعت کی ابتدائی حالت ایسی ہی ہوتی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ طاعت ہونی چاہئے خواہ کسی طرح ہو پھر طاعت آدمی کو خود درست کرلیتی ہے۔ اور طاعت ایسی چیز ہے کہ اس میں دنیادی اور دینی دونوں نفعے ہیں۔ رزق میں کشائش ہوتی ہے اگرچہ آدمی چنداں مالدار نہ ہو مگر طاعت کے ساتھ عجیب طرح کا اطمینان اور فراغ قلب میں ہوتا ہے اور برعکس اس کے معصیت سے رزق میں تنگی ہوتی ہے اور اطمینان ہر کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ اور بھی مضرتیں ہیں جو معصیت پر متفرع ہیں مضرات اور یہ تو لازمی۔

غرض فرمانبرداری سے ہمیشہ مسرت ہوتی اور معصیت سے مضرت، اور یہ گو لازمی مضرتیں ہیں۔ اکثر مضرتیں متعدی ہوجاتی ہیں۔ جیسے غیبت کہ جب ایک آدمی کسی کی غیبت کرے گا تو دوسرے کو خبر پہنچے گی۔ پھر وہ کیوں رو کرے گا

بلکہ اس سے زیادہ کرے گا۔ اس سے دونوں میں عداوت پیدا ہوگی۔ پھر عداوت وہ چیز ہے کہ جب دو میں پڑجاتی ہے تو دونوں کا نماز روزہ سب عداوت ہوجاتی ہے، اٹھنے میں بیٹھنے میں سونے میں، ہر وقت یہی فکر رہتی ہے کہ کسی طرح دوسرے کو نقصان پہنچے، نیت نماز کی باندھ رکھی ہے، اور دل میں دوسرے کو نقصان پہنچانے کی تدبیریں سوچی جارہی ہیں۔ یہ کیا نماز ہوئی۔ شغلِ قلب ہوا اور کاہے سے حرام چیز سے، منہ میں روزہ ہے اور زبان دوسرے کی غیبت میں آلودہ ہے، دل میں خوش ہیں کہ روزہ ہے یہ خبر نہیں کہ روزہ میں ان چیزوں کو تو چھوڑا جو فی نفسہٖ حلال تھیں۔ یعنی کھانا پینا اور جو چیز ہمیشہ حرام ہے اس کو نہ چھوڑا تو کیا روزہ ہوا۔

غرض یہ عداوت اسی غیبت کی بدولت ہوتی، اور عداوت وہ چیز ہے کہ قلب کو ایک ہی طرف کا کرلیتی ہے، اور صرف ایک کام کا رہ جاتا ہے، اور
۱۴ حضرت رسائی آپ جانتے ہیں کہ چھوٹا سا لفظ کس قدر شر کو جامع ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں، اظہر من الشمس (سورج سے زیادہ ظاہر) ہے۔ یہ اتحاد کی ضد ہے۔ جتنی خیر دنیاوی و دینی اتحاد میں ہے اتنا ہی شر بمقابلہ اس کے اس میں ہے۔ یہ سب کاہے سے ہوا صرف ذرا سی غیبت سے۔ یہ معصیت کی متعدی مضرت کی مثال ہوئی۔ یہ بھی خواہشِ نفسانی کا ایک فرد ہے۔ اور خواہشِ نفسانی کی ایک خرابی سنئے، میرا اور آپ کا جائداد پر مقدمہ ہے۔ ہر شخص کی خواہش ہوگی کہ مجھ کو ہی پورا مل جاوے۔ بس لڑائی ہوگئی۔ اگر دونوں یہ کہتے کہ ہمیں کچھ نہیں چاہئے تو طول کاہے کو کھنچتا۔ مقدمہ بازی کی نوبت کیوں آتی، اور باہمی نفاق اور عداوتیں کیوں پیدا ہوتیں،

چنانچہ حدیث شریف میں ایک قصہ ہے (امم سابقہ میں بھی بڑے بڑے اچھے لوگ ہوئے ہیں) ایک شخص نے دوسرے کے ہاتھ ایک مکان بیچا، مشتری نے جب دخل لیا تو اس میں ایک گھڑا سونے کا بھرا ہوا پایا۔ وہ گھڑا لے کر

بائع کے پاس آیا کہ تم اپنا گھڑا لے لو، تمھارے مکان میں سے نکلا ہے۔ اس نے کہا میں تو مکان کی قیمت لے چکا میرا اس میں کیا ہے، اس نے کہا میں نے تو قیمت مکان کی دی ہے اس پر عقد ٹھیرا ہے یہ گھڑا عقد میں شامل نہیں میں کیسے لیلوں" ایمانداری اسے کہتے ہیں۔ اگر آجکل گھڑا نکل آئے تو مزہ آجائے۔

کانپور میں دو آدمیوں نے کہیں سُن لیا تھا کہ شب برات میں جو دعاء مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے، شب برات کو دونوں ایک مٹی کا بڑا ڈھیلا لے کر بیٹھے، اور اس پر ایک رومال ڈھانک دیا۔ اور دعاء مانگنی شروع کی، کہ یا اللہ یہ مٹی سونا ہوجائے، جب تمام رات جاگے اور اسی دعاء میں رہے، جوں جوں صبح قریب ہوتی تھی اشتیاق بڑھتا جاتا تھا کہ اب یہ سونے کا ہوجائے گا۔ بشکل صبح پکڑی اور جلدی سے اس کو کھولا۔ دیکھیں تو وہی مٹی، ساری آرزوئیں خاک ہوگئیں اور دل مرگیا کہ شب قدر بھی خالی گئی جسپر بڑا اعتماد تھا، طرح طرح کے شیطانی خیال دل میں آئے کہ دعاء کو ویسے بھی سُنا کرتے تھے کہ قبول ہوتی ہے، اور آج تو شب قدر تھی۔ اسی تردد میں بیٹھے تھے، خیریت ہوئی کہ بندۂ خدا ایک درزی پہنچ گیا، یہ کچھ اہل علم کی صحبت پائے ہوئے تھا، اس نے پوچھا کیسے سُست ہو، انھوں نے سارا قصہ بیان کیا، کہا بھائی شکر کرو، اسی میں کچھ حکمت ہوگی۔ ایک ذرا سی بات تو مجھے معلوم ہوتی ہے کہ اللہ میاں تمھارے بدخواہ نہیں ہیں۔ تم نے تو یہ سمجھا کہ مٹی کے سونا بننے میں تمھارا نفع ہے مگر تھا نقصان۔ ابھی جب صبح کو تم نے ڈھیلہ کو کھولا، اگر وہ سونے کا نکلتا تو تم دونوں میں لڑائی تو ابھی ہوتی، پھر جانے کہاں تک طول کھینچتا، ممکن ہے کہ ڈھیلا کسی تیسرے کا ہوجاتا اور تم دونوں میں لڑائی مفت میں بندھ جاتی! آدمی سمجھدار تھا، دونوں کی تسکین ہوگئی۔ موہوم سونے کے لئے تو اتنی محنت کی، کہیں سونے کا گھڑا نظر پڑجائے تو جانے کیا ہو۔ اس کو دیکھئے کہ گھڑا مالک مکان کو دینے

آیا اور مالک کو دیکھئے کہ لینے سے انکار ہے۔

وہ لوگ ایسے تھے۔ صحابہ کا ایک قصہ کتاب میں آتا ہے کہ ایک غزوے میں بہت سے آدمی شہید ہوئے۔ چند آدمی نزع کی حالت میں تھے، موت کے وقت تشنگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ایک شخص نے آواز دی کہ کوئی میرے حلق میں ذراسا پانی ڈالدے تو بڑا کام کرے۔ ایک بندۂ خدا کاسہ میں پانی لیکر پہنچے، اور چاہتے تھے کہ ان کے منہ میں ڈالیں کہ اتنے میں ایک طرف اور آواز آئی کہ ذراسا پانی کوئی پلاتا انھوں نے پڑے پڑے کہا کہ پہلے ان کو پلاؤ پھر مجھے پلانا، یہ شخص پیالہ لے کر اُن کے پاس پہنچے، پلاتا ہی چاہتے تھے کہ اسی طرح اور ایک آواز آئی، غرض مقتل میں چھ سات جگہ اسی طرح پانی لئے پھرے، اور سب یہی کہتے رہے کہ پہلے میرے بھائی کو پلاؤ۔ اخیر میں جنکے پاس پہنچے ان کو پلانے کی نوبت نہ آئی تھی کہ دم آخر ہوگیا۔ یہ شخص واپس ہوئے اور پہلوں کے پاس پانی لائے جس کو دیکھا دم آخر ہو چکا ہے ایک نے بھی پانی نہ پیا۔ اور پیالہ بھرا ہوا لے کر چلے آئے۔ ۱۶

ایثار اس کو کہتے ہیں، پانی وہ چیز ہے کہ سفرحج میں دیکھا ہے کہ باپ بیٹے کو پیاس کے وقت میں چھوڑ دیتا ہے۔ موت کے وقت کی پیاس کا کیا حال ہوگا۔ غرض ہم میں جو بجائے ایثار کے کشاکشی اور نزاع وجدال ہے اسکی وجہ ہی اتباع ہوا ہے۔ یہی باہم اتفاق نہیں ہونے دیتا۔ آجکل سب نے یاد کرلیا ہے اتفاق اتفاق، یہ خبر نہیں کہ اتفاق کاہے سے ہوتا ہے۔ اتفاق ہوتا ہے خواہشِ نفسانی کو روکنے سے۔ دو شخصوں میں جب جھگڑا ہوگا کسی ایسی ہی چیز پر ہوگا کہ ہر ایک ان میں سے اس کی خواہش رکھتا ہوگا۔ اگر وہ دونوں اپنی خواہش کو روک لیں اور اس چیز کی طلب چھوڑ دیں تو پھر جھگڑا کیسا اور نااتفاقی کہاں، اتفاق اتفاق کہتے رہے اور نفس کو روکتے نہیں تو اس سے کیا ہوتا ہے۔

غرض جملہ شروں کی اگر جڑ ہے تو خواہشِ نفسانی ہی ہے۔ خواہشِ نفسانی ہی روکنے کی چیز ہے۔ دیکھئے اگر روکا نہ جائے نفس کو تو کیا انجام ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو سب ہی نے سمجھا حتیٰ کہ حکام میں سے ان لوگوں نے جن کو مذہب سے علاقہ بھی نہیں حاکم کیا کرتا ہے، بعض افعال سے روکتا ہے اور بعض کی اجازت دیتا ہے۔ جن افعال سے روکتا ہے وہ وہی تو ہیں جنکو لوگ کرنا چاہتے ہیں، مگر اس کے نزدیک باعثِ مضرت نہیں ہیں۔ معلوم ہوا کہ دنیاوی مصلحت کا مقتضا بھی یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنی خواہش پورا کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اگر حاکم ان افعال سے نہ روکے تو دیکھئے کیا ہو، ڈاکوؤں کو ڈاکہ ڈالنے دے، چوروں کو چوری کرنے دے زیردستوں پر زبردستوں کو ظلم کرنے دے۔ غرض ہر شخص کو مخلّٰی بالطبع کر دے کہ اپنی خواہش کے موافق جو چاہو کرو تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس حالت میں کس لطف سے زندگی بسر ہوگی۔

قانون کیا ہے ملک کے افعال کی ایک حد قائم کرنے والی چیز ہے۔ یا کچھ اور ۱۷
جو کوئی حد سے گزرے اس کو جزاء و سزا ہوتی ہے جب اس گزرنے میں کچھ برائی سمجھی گئی ہے تب ہی تو اس پر جزاء و سزا ہے۔ سب کو مخلّٰی بالطبع کیوں نہ چھوڑ دیا فرض کیجئے کسی کو روپے کی ضرورت ہے یا ضرورت نہیں بھی ہے یوں ہی کسی سے چھیننے کو جی چاہتا ہے۔ تو اس کو کیوں منع کرتے۔ اور اگر چھین لے تو چالان کیوں ہوتا ہو وہ یہ کہہ سکتا ہے کہ مجھے ضرورت ہے یا میرے جی کو کیوں مارتے ہو خواہش پوری کرنے دو، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اجازت دینے میں کوئی ایسی مضرت ہے، کہ اس کے مقابلہ میں ضرورت کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔

دنیاوی انتظاموں کو بھی دیکھ کر یہ بات صاف نکلتی ہے کہ خواہشِ نفسانی روکنے ہی کی چیز ہے۔ اگر خواہشِ نفسانی روکنے کی چیز نہیں ہے تو اپنے گھر میں بی بی کو کیوں روکتے ہو، اس کو تو طرح طرح سے سمجھاتے ہو، زیادہ زیور فضول ہی پوشاک میں زیادہ تکلف سے کیا فائدہ، مگر اپنے نفس کو نہیں روکتے۔ اگر آزادی ہی

پسند ہے تو بی بی کو بھی آزادی دو جس طرح چاہے خرچ کرے۔ اور اگر آزادی میں نقصان ہے تو جس طرح بی بی کو بے فائدہ کاموں سے روکتے ہو اپنے نفس کو بھی پابند کرو، مگر دونوں کے آزاد ہونے کو تو کوئی پسند نہ کرے گا تو لامحالہ دوسری ہی شق رہ گئی کہ دونوں پابند ہوں۔ پابندی وہ چیز ہے کہ کسی کو اس سے چارہ نہیں۔ فرق اتنا ہے کہ جو عقلمند ہیں بالاختیار کرتے ہیں اور کم عقل بجبر اور قہر پابند بنائے جاتے ہیں، آپ نفس کو بالکل آزاد کسی طرح نہیں کر سکتے، اگر قانونِ خداوندی سے آزاد کر دیا اور اللہ میاں نے دنیا میں کچھ نہ کہا تو قانونِ دنیاوی پابند بنانے کے لئے موجود ہے۔ اور دست بدست سزا تیار ہے بہت سی خواہشیں ہیں کہ قانون کی وجہ سے چھوڑ دینی پڑتی ہیں۔ کیونکہ ان پر عمل کرنے سے سزا ہوتی ہے۔

اے مسلمانوں قانون کی وجہ سے تم نے خواہشِ نفسانی کو چھوڑ دیا اور
۸ اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم سے نہیں چھوڑتے، کیا غضب کی بات ہے۔ اگر قانوناً ممانعت ہو جائے تو ایک بھی حیلہ باقی نہ رہے۔ اور اللہ میاں اگر کسی کام کی ممانعت کریں تو اس میں حیلے نکالے جائیں، اور ایسی ایسی تاویلیں کی جائیں کہ تاویل کے مرتبہ سے نکل کر تحریف تک پہنچ جائیں۔ اور اگر بالکل ہی صریح حکم ہو تو اس کا مقابلہ ضرورت سے کیا جاتا ہے۔ کہ حکم تو یہی تھا مگر اب ضرورت ہے۔ قانون کے مقابلہ میں یہ ضرورتیں کہاں چلی جاتی ہیں۔ افسوس محبتِ الٰہی مصلحتِ دنیوی کے برابر بھی نہ ہوئی ؎

عشقِ مولٰے کے کم از لیلٰے بود ❊ گوئے گشتن بہر او اولٰے بود

عشقِ مولٰے کے کم از لیلٰے بود ❊ گوئے گشتن بہر او اولٰے بود

مولیٰ کا عشق لیلٰے کے عشق سے کب کم ہو، اس کے لئے کوچہ گردی زیادہ بہتر ہے؟

یہ مردار عورت اگر کہے رات بھر کھڑے رہو تو کر گذریں گے اور اللہ میاں

حق تعالیٰ واعظ صاحب نے اس کو مکرر پڑھا ہوگا جامع وعظ نے بھی مکرر لکھا ہے ۱۲

کے حکم سے عشاء کی نماز بھی بھاری ہے۔

ایک شخص کا قصہ ہے (یہ ایک بزرگ ہیں، پہلے حالت ایسی ہی تھی بعدہٗ بڑے شخص ہوئے ہیں) ایک عورت سے تعشق تھا بڑی تمناؤں کے بعد ایکدن کہیں شام کو بات کرنے کا موقع مل گیا اور صورت یہ تھی کہ کھڑکی کے نیچے بات کرنے کھڑے ہوئے تھے ایسے محو ہوئے کہ تمام رات اسی طرح گذر گئی، عشاء کی نماز بھی فوت ہوئی، جب مؤذن نے اذان دی تو حضرت کیا کہتے ہیں بھلے مانس تجھے بھی آج ہی عشاء کی اذان سویرے کہنی رہ گئی تھی۔ کسی نے کہا جناب خبر بھی ہے صبح ہوگئی، صبح کی اذان ہے۔ منہ پھیر کر دیکھا تو واقعی صبح ہے۔ دل پر اثر ہوا بہت روئے، ایک عورت کے خیال میں حق سبحانہٗ تعالیٰ کا فرض قضا ہوا، ایک بزرگ کے ہاتھ پر توبہ کی اور اس خیال کو چھوڑا۔ پھر صاحب کمال ہوئے اور سبھی کچھ ہوا۔

۱۹ ایک عورت کی محبت میں یہ حالت ہوتی ہے، غور کریں تو آجکل احکام الٰہی کی اتنی بھی تو قدر نہیں جتنی کہ ایک کسبی کے احکام کی، احکامِ الٰہی خواہ کیسے ہی سہل ہوں اور سراسر مفید اور حکمت ہی حکمت ہوں، مگر شاق ہوتے ہیں۔ اگر کسبی انہی احکام کو کہے جو اللہ میاں نے فرمایا تو کچھ تکلیف نہ رہے بلکہ اگر کسبی ان احکام کو بھی کہے جو اللہ میاں کے خلاف ہیں تب بھی کچھ شاق نہوں۔ معلوم ہوا کہ احکام فی نفسہٖ شاق نہیں صرف محبت کی کسر ہے۔ مسلمان کی شان تو یہ تھی کہ اللہ میاں کے سامنے کَالْقَلَمِ فِیْ یَدِ الْکَاتِبِ (کاتب کے ہاتھ میں قلم کی طرح) ہوتا اور غیر کے سامنے لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت ہوتا انصاف کی بات ہے کہ اللہ میاں کی طرف سے بندہ پر کس قدر انعام و افضال ہر وقت ہوتے ہیں اور غیر اللہ کی طرف سے خاک بھی نہیں ملتا، پھر اپنے منعم کے سامنے نرم ہونا چاہئے، یا آپ جیسے عاجز بلکہ دشمن کے سامنے، ظاہر ہے کہ منعم ہی کے سامنے ہونا چاہئے ۔

چونکہ بر میخت بہ بندو بستہ باش ۔ چوں کشاید چابکُ برجستہ باش

ہمچو کلکم درمیانِ اصبعین ۔ نیستم درصفِ طاعت بَین بَین

"جب باندھ دیں تو بندھ جاؤ جب کھولدیں تو چست و چالاک ہوجاؤ۔ میں قلم کی طرح

دو انگلیوں میں ہوں، صفِ طاعت میں بَین بَین نہیں ہوں"

مسلمان کو اللہ میاں کے سامنے ایسا ہونا چاہئے جیسے کاتب کی انگلیوں میں قلم، کہ اسکو کچھ عذر نہیں، کاتب کو اختیار ہے جس طرف چاہے چلائے اور چلائے یا نہ چلائے۔ کیا غضب ہے کہ اللہ میاں کے ہاتھ میں تو ایسے نہ ہوں اور ہوں کس کے ہاتھ میں نفس کے۔ بُت پرستی کو منع کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہر شخص کی بغل میں بُت ہے۔ ظاہری بت پرست پر تو طرح طرح کے طعن کئے جاتے ہیں اور ان کو احمق بتایا جاتا ہے، اور اپنے آپ باطنی بُت پرستی میں مبتلا ہیں اور عقلمندی کا دعویٰ ہے۔ کسی نے ایک بُت کو پوجا کسی نے دوسرے کو۔ کیا
۲۰ فرق ہے لات کو پوجنے والے میں اور عزیٰ کو پوجنے والے میں۔ جہاں ظاہری بُت پرستی چھوڑی ہے باطنی بھی چھوڑ دو، اپنی باگ نفس کے ہاتھ میں مت دو: حق تعالیٰ اپنے منعمِ حقیقی کے تصرف میں ہمہ تن اپنے آپ کو دیدو۔ احکامِ الٰہی کے سامنے سر جھکا دو، اتباع تو وہی ہے کہ آدمی اپنے ارادے کو چھوڑ دے اور دوسرے کے ارادے کے تابع ہوجائے۔ دیکھ لیجئے قانون کے سامنے کیا حال ہوتا ہے کہ اپنی خواہش چھوڑنی پڑتی ہے۔ اور حاکم کے حکم کو ماننا پڑتا ہے۔

اب لوگوں نے حق سبحانہٗ تعالیٰ کے حکم کا اتباع تو بالکل چھوڑ ہی دیا، اوروں ہی کا اتباع اختیار کر لیا، اور اتباع کرنے کی دو چیزیں تھیں، عقائد اور اعمال۔ اعمال میں تو یہ گنجائش نکالی گئی ہے کہ ہم مجبور ہیں اور یہ احکام مصلحت وقت کے موافق نہیں، مگر اب عقائد میں بھی خواہش نفسانی کو ترجیح ہونے لگی ہے۔ اعمال کو پہلے ضروری تو سمجھتے تھے مگر تکلیف سمجھ کر ان کے ادا میں قصور کرتے تھے، اب ان کی ضرورت ہی ذہن سے اُڑ گئی، ادائے اعمال کو تو چھوڑا

تکلیف کی وجہ سے مگر اُن کے وجوب کے عقیدہ میں کیا تکلیف تھی، ہاں اس میں بھی ایک تکلیف تھی، وہ یہ کہ نفس نے دیکھا اگرچہ میں نے اداۓ اعمال سے روک دیا مگر تاوقتیکہ ان کے وجوب کا عقیدہ اس کے ذہن میں ہے ممکن ہے کہ پھر کبھی ادا پر مستعد ہو جاۓ۔ اس وقت پھر مجھے کوئی تدبیر اس کے روکنے کی کرنی پڑے گی۔ اور احتمال ہے کہ روکنے سے نہ رُکے۔ اس لئے اس احتمال کے قطع کرنے اور اپنی بار بار کی تکلیف بچانے کے لئے نفس نے یہ تدبیر نکالی کہ سرے سے اُن کے وجوب کا عقیدہ ہی اڑا دینا چاہیئے۔ عقائد اعمال کے لئے بمنزلہ جڑ کے ہیں۔ جڑ کاٹ دینے سے احتمال ہی نہیں رہتا کہ شاخیں پھر ہری ہوں گی۔ عقائد کے بدلنے سے نفس بہت سی تکلیفوں سے بچ گیا۔

ایک صاحب فرمانے لگے کہ دین میں جو کچھ حارج ہے وہ نماز ہے۔ غیر مذہب کے بہت سے آدمی اس وقت اسلام میں آنے کو تیار ہیں مگر یہ خیال مانع ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنی ہوگی۔ پانچ وقت کی پابندی سر پڑیگی۔ 21

مولوی لوگ نماز کی قید اٹھا دیں تو آج ہی دیکھئے کتنے کافر مسلمان بنتے ہیں، اور مسلمانوں کی جماعت کتنی بڑھ جاتی ہے۔ (نماز ایسی مولویوں کی ہے کہ معاف کر دیں)

ایک صاحب کہتے ہیں سود کی ممانعت سے افلاس آگیا! اور قومیں سود ہی کے ذریعہ سے ترقی کرتی جاتی ہیں؛

غرض جو جسکی سمجھ میں آتا ہے احکام الٰہی میں اصلاح دینے کو تیار ہے، گویا اللہ میاں کو یہ بات بتائی جاتی ہے۔ کہ ہم سے راۓ لیکر کیوں احکام مقرر نہ کئے تھے، کثرتِ راۓ پر کیوں فیصلہ نہ کیا۔

ہم لوگوں کا کیا حال ہے، عقائد میں یہ حال، اعمال میں یہ حال۔ صورت میں آزادی، آمدنی میں حلال حرام کی خبر نہیں، زمینداروں نے طرح طرح کے ناجائز ابواب باندھ رکھے ہیں۔ بیع و شراء میں عقد کے صحت و بطلان کی پرواہ نہیں۔ آم کی بہار بکتی ہے حالانکہ آم کا وجود بھی نہیں ہوتا یہ بیع باطل ہے۔

بیع باطل میں مال مشتری کی ملک نہیں ہوتا۔ اس کا رد واجب ہے یکے بعد دیگرے جہاں تک سلسلہ چلا جائے کسی کی ملک نہ ہوگا۔ گناہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

غرض معاملات کی صفائی کی طرف اصلاً خیال نہیں۔ زبان غیبت میں اور طعن میں مبتلا، قلب حرص میں اور طمع میں گرفتار۔ اونٹ سے کسی نے پوچھا اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی، کہا کوئی بھی نہیں۔ ایسی ہی ہم لوگوں کی حالت ہے، ظاہر کی طرف دیکھئے وہ ٹھیک نہیں باطن کی طرف نظر کیجئے وہ درست نہیں، حالانکہ حق تعالیٰ نے صرف احکام ہی نہیں نازل کئے، بلکہ ایک اتنا بڑا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) بھیج کر یہ بھی بتا دیا کہ اس نمونے کے ہو کر آؤ، تعلیم کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ کسی شے کی پیمائش زبانی بتا دی جائے اور کہہ دیا جائے کہ اتنی لانبی، اتنی چوڑی، اتنی موٹی بنا کر لاؤ۔

اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کا ناپ تول بتانے کے ساتھ بنا ہوا نمونہ بھی دکھا دیا جائے کہ آخری صورت ایسی پیدا ہونی چاہئے یہ نہایت ابلغ ہے ۲۲
خوشنویس لکھنے والوں کو بتاتا ہے کہ الف تین قط کا لکھو، اور اوپر کی نوک ایسی ہو اور نیچے کی ایسی، مگر یہ بتانا کافی نہیں۔ لکھنے والوں کو ہرگز الف بنانا نہیں آسکتا تا وقتیکہ استاد اس کی صورت بھی اپنے ہاتھ سے کھینچکر نہ دکھا دے اگر ہاتھ سے لکھکر دکھانے کی ضرورت نہ ہوتی تو استاد کے نخرے اٹھانیکی کیا ضرورت رہتی، کتابوں میں سب حرفوں کی پیمائش لکھی ہے اسی کو پڑھکر خوشنویس بنجاتے۔ حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

سو احکام تو ظاہر و باطن کی تحدید کا نام ہے جس سے ظاہر و باطن کی ایک خاص صورت پیدا ہوتی ہے۔ جس طرح کہ تین قط سے الف کے طول کی حد قائم ہو اور نصف قط یا کم و بیش سے اس کے عرض کی انتہا مقرر ہو کر ایک خاص صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ممکن تھا کہ اللہ میاں صرف احکام نازل فرما دیتے جو ظاہر و باطن کی ناپ تول ہیں، اور یہ فرما دیتے کہ یہ ناپ تول ہیں، اُن کو پورا پورا

درست کرو یہاں تک کہ وہ صورت پیدا ہوجائے جو ہماری مرضی کے موافق ہو اس وقت معلوم ہوتا کہ ہم لوگ کس قدر حرج میں پڑجاتے اور کیسی کیسی دقتیں پیش آتیں تمام عمر احکام کی پابندی کرتے اور پھر اطمینان نہ ہوتا کہ وہ صورت پیدا ہوگئی جو حق تعالیٰ کی مرضی کے موافق ہے۔ مگر نہیں حق سبحانہٗ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، احکام بھی نازل فرمائے اور محض اپنی رحمت سے نمونہ بھی دکھادیا کہ اصلاً تردد نہ رہے کہ احکام کی پوری پوری تعمیل ہوگئی یا نہیں، اپنی صورت کو نمونے سے ملاکر دیکھ لو ذرا سا بھی فرق ہو تو معلوم ہوجائے گا کسی حکم کی تعمیل میں کسر رہ گئی۔

مگر اس رحمت کی کیا قدر ہوئی ہم کس قدر نمونہ کے موافق بنکر آئے اگر درزی کو اچکن سینے کو دو اور وہ ساری اچکن بہت ٹھیک اور خوب صورت بدن کے موافق سیئے، کہیں جھول تک نہ رہے، سلائی کہیں ٹیڑھی نہ ہو غرض سب طرح ٹھیک ہو صرف ایک آستین کو چار انگل چھوٹا کرلائے تو کیا آپ
۲۴ اس کو لے لیں گے؟ اور کیا یہ بات اس کی سن لیں گے کہ جناب ساری اچکن تو ٹھیک ہے آستین بھی دو ہیں صرف ایک آستین چار انگل کم رہ گئی ہے تو کیا ڈر ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس اچکن کو آپ اس کے سر سے ماریں گے۔ اور اگر اس نے قصداً ایسا کیا ہے تو قیمت واپس لینے پر بھی اکتفا نہ ہوگا کچھ جرمانہ بھی لیا جائے گا۔ حالانکہ نمونہ سے صرف چار انگل مخالفت ہے۔

یہاں نمونہ سے چار انگل بھی مطابقت نہیں۔ اللہ میاں کا حکم تھا کہ نمونہ کے مطابق ہو اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ (اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے محبت کریں گے) مَآ اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ (جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ)۔

افسوس مسلمانوں نے ہر بات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خلاف کیا، جو وضع بتائی اس کے خلاف وضع تراشی، نکاح نیا تراشا، اخلاق نئے اختیار کئے، اب عقائد میں بھی تراش خراش ہونے لگی، اور

پھر لطف یہ ہے کہ دعویٰ ہے اتباع کا، معلوم نہیں کہ اتباع کس چیز کا نام ہے اگر کوئی ایسے لوگوں کو دیکھے تو کیا کہہ سکتا ہے کہ یہ قوم اس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گروہ میں ہے، گروہ میں ہونے کے لئے کسی بات میں بھی مطابقت نہیں، بلکہ جان جان کے مخالفت کی جاتی ہے، اس گروہ میں ہونا تو کہاں اب تو اس گروہ کے لوگوں سے ملنا بھی نہیں چاہتے، کیوں کہ اس گروہ میں ترقی نہیں ہے۔

ایک شخص نے مجھ سے لکھنؤ میں بیان کیا کہ آج کمیٹی ہوئی جس میں ان اسباب پر بحث کی گئی جو مسلمانوں کو ترقی سے روک رہے ہیں۔ بہت سے اسباب بیان کئے گئے، آخر میں یہ طے ہوا کہ مذہب مانع ہے ترقی سے۔ اس کو چھوڑ دینا چاہئے! یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔ اس لامتناہی ترقی ہی نے خرابی ڈالی ہے۔ کہیں اس ہوس کی انتہا بھی ہوگی، حالانکہ یہ ترقی ہرگز اطاعت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اطاعت میں کچھ نہ کچھ پابندی ضرور کرنی پڑے گی
۲۴ اور یہ ترقی مطلق العنانی کو چاہتی ہے۔ یہ ترقی وہی حاصل کر سکتا ہے کہ نہ یہ دیکھے کہ روپیہ حق سے آیا نہ یہ دیکھے کہ ناحق سے۔ چوری سے وہ نڈر ہے۔ ظلم سے اسے خوف نہ ہو، روپیہ حاصل ہو جس طرح ہو، حالانکہ قطع نظر خلافِ دین ہونے سے ایسا مال دنیا ہی میں فلاح نہیں دیتا، بلکہ جس راہ سے آیا تھا اسی راہ جاتا ہے۔ اس میں برکت مطلق نہیں ہوتی۔ رشوت کے ہزار اور حلال کے سو برابر نہیں۔ جو غرض ہے روپیہ سے وہ حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ بیان کیا گیا۔

تو اب سوچو اپنے اوپر ایسی چیزیں کیوں لازم کرلیں جن کے لئے کوئی تعداد روپے کی کافی نہیں ہوتی۔ اور کسی مرتبہ ترقی پر بس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ چیزیں لازم کس نے کیں اسی ہوائے نفس نے۔ حق سبحانہ تعالیٰ نے اسی کا علاج بتایا ہے (اب میں اس پر بیان کو ختم کرتا ہوں)۔

غرض سارا فساد خواہشِ نفسانی سے ہوا ہے، سو علاج کیا ہے کہ نفس کو خواہش سے روکو۔ مرض کا علاج یہی ہوتا ہے کہ اس کے مادّہ اور سبب کو

قطع کیا جائے۔ جب سبب جاتا رہے گا مرض بھی نہ رہے گا۔

مسلمانوں نفسانی خواہشوں کو چھوڑو اور حق سبحانہٗ تعالیٰ کی اطاعت کرو، کیا اللہ میاں کا کچھ حق نہیں ہے آپ لوگوں پر، دیکھئے اللہ میاں ایسے ایسے امراض کا علاج بتاتے ہیں جن کو تم اپنے آپ کسی طرح نہ سمجھ سکتے اور وہ اندر ہی اندر تمہارا کام تمام کر ڈالتے۔ تعجب ہے کہ طبِ اکبر کی قدر ہو مگر احکامِ الٰہی کی قدر نہ ہو۔ جانتے ہیں کہ طبِ اکبر کے خلاف کریں گے تو صحت محفوظ نہ رہے گی اور مرض گھیر لے گا۔

صاحبو! طبِ اکبر پر عمل نہ کرنے سے صحتِ جسمانی میں خرابی آتی ہے اور احکامِ الٰہی پر عمل نہ کرنے سے قلبی اور روحانی صحت برباد ہوتی ہے پھر جو شرف قلب اور روح کو جسم پر ہے وہی اس کی صحت کو اس کی صحت پر اور اس کے محافظ کو اس کے محافظ پر ہونا چاہیے۔ اس سے سمجھ لیجئے کہ احکامِ الٰہی کی کیا عظمت ہونی چاہیے۔ اور اللہ میاں کا بتایا ہوا علاج کس قدر قابلِ قدر چیز ہے۔ وہ علاج یہی ہوائے نفس کا چھوڑنا ہے ۲۵

اس کا آسان طریق میں بتائے دیتا ہوں چند روز کرنا پڑے گا بہت ہی تھوڑے دنوں میں انشاء اللہ تعالیٰ نفع معلوم ہوگا۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ ہر کام ابتداءً تکلیف سے ہوتا ہے۔ پھر کرتے کرتے اس میں ملکۂ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے، سو آپ اس کا التزام کر لیجئے کہ کوئی قول کوئی فعل معاً دل میں آتے ہی نہ کر ڈالا کیجئے کہ وہ خواہشِ نفس کے موافق ہوگا۔ بلکہ ہر کام سے پہلے ذرا سوچنا چاہیے اس کی عادت ڈالنی چاہیے کہ جو کام کیا جائے، پہلے سوچ لیا جائے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے خلاف تو نہیں، یہ میرے لئے مفید ہے یا مضر، بیدھڑک ہو کر کام کرنے کی عادت بالکل چھوڑ دی جائے۔ اول اول یہ ذرا شاق ہوگا مگر تھوڑے دنوں میں عادت ہو جائے گی۔ اس کا ہر کام میں خیال رکھو، یہ حالت ہو جائے کہ بات منہ سے نکالنی ہے مگر رک گئے۔

کہ حق تعالیٰ کا امر کیا ہے اور نفس کی خواہش کیا جس بات میں نفس کی خواہش پائی اس کو زبان سے نہ نکالا نہ اس پر عمل کیا۔ رہی یہ بات کہ تمیز کیونکر ہو حق تعالیٰ کے امر نفس کی خواہش میں اس کے لئے علم دین کی ضرورت ہے تھوڑا علم ضرور چاہئے، کتاب نہیں پڑھ سکتے ہو تو پوچھ لو چند روز یہی عادت ڈالو اس سے کسیقدر آپ کے بولنے میں کمی ہوگی اور کسیقدر آپ کے کھانے میں کمی ہوگی مگر جس وقت لذت اس کی حاصل ہوگی تو آپ پھر تھوڑے کو بہت پر ترجیح دیں گے۔ تھوڑی چیز ہو اور اچھی ہو وہ بہتر ہے اس سے کہ بری ہو اور بہت ہو۔ غلیظ کتنا ہی ہو ایک چھچہ فیرنی پر اس کو ترجیح نہیں ہوسکتی۔

جب طاعت میں کسیکو لذت آنے لگتی ہے تو اس معصیت کی حقارت اس کے ذہن میں بیٹھ جاتی ہے پھر معصیت کا کرنا اس سے زیادہ دشوار ہونے لگتا ہے جتنا کہ پہلے طاعت کرنا تھا (مسلمان پر طاعت کرنے میں عادی ہونے سے پہلے بھی جو بار ہوتا ہے وہ ایک کلفت ہوتی ہے کہ نیا کام کرنے میں محسوس ہوتی ہو جیسا کہ دیگر امور عادیہ کچھ تغیر ہونے
٢٦ سے معلوم ہونے لگا کرتی ہے ورنہ طاعت کو کرکے تو مسلمان کو ہمیشہ نشاط اور فرحت رہی ہوتی ہے) عادی ہوجانیکے بعد تو معصیت سے نفرت ہوجاتی ہے۔ اور اگر احیاناً معصیت ہو بھی گئی تو طبیعت مشوش رہتی ہے اور کسی طرح چین نہیں آتا تاوقتیکہ استغفار نہ کرلے، طاعت میں عجیب لذت ہے کہ آدمی لاکھ روپے پر ایک نماز کو ترجیح دیتا ہے کوئی بات تو ہے کہ اگر مسلمان سے کہیں کہ لاکھ روپے لیلے اور آج ظہر کی نماز نہ پڑھ تو روپیہ نہ لیگا اور ظہر پڑھے گا۔ ضرور کوئی ایسی چیز پاتا ہے کہ لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ حالانکہ ہماری نماز کچھ نماز نہیں، اوّل سے اخیر تک کوئی رکن بھی قابل اعتبار نہیں نیت نماز کی باندھ رکھی ہے اور دل اِدھر اُدھر ہے۔ زبان سے قرأت کررہے ہیں مگر مطلق خبر نہیں کہ اللہ میاں سے کیا کہہ رہے ہیں، خیریت یہ ہے کہ زبان الفاظ پر عادی ہوگئی ہے۔ آپ ہی آپ قرأت کرلیتی ہے ورنہ باعتبار احکام ظاہری بھی عدم صحت کا فتویٰ دیا جاتا۔ اور اعادہ واجب ہوتا۔ سر سجدہ میں ہے مگر خیال اور ہی کہیں ہے اس حالت پہ بھی آدمی لاکھ روپے سے زیادہ کوئی چیز اس میں پاتا ہے کہ لاکھ روپیہ پر اس کو ترجیح دیتا ہے۔ نماز نماز

وجائے تو اندازہ کر لیجئے کہ کیا اثر رکھے ؎

جرعۂ خاک آمیز چوں مجنوں کند ؎ صاف گر باشد ندانم چوں کند

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند ؎ صاف گر باشد ندانم چوں کند

"یعنی جب شراب کا ایک گھونٹ مٹی میں مل کر مست بنا دیتا ہے تو خالص شراب تو کیا کچھ نہ کریگی"

واقعی طاعت وہ چیز ہے اگر اس میں ایک لحظہ کا لطف بھی میسر ہو جائے تو آدمی دنیا و ما فیہا کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے خواہشِ نفسانی کا تو دشمن ہی ہو جائے۔ نفس کے پھندے میں آدمی جب ہی تک آجاتا ہے جب تک کہ طاعت کی لذت سے واقف نہیں ہوا۔ عادت ڈالئے پھر لذت آنے لگے گی اور کچھ کلفت نہ رہے گی۔ ابتداء میں کسیقدر کلفت ضرور ہوتی ہے۔ غرض یہ عادت ڈالنی چاہیے کہ ہر کام کو سوچکر کرے، اگر وہ کام خواہشِ نفس سے ہو تو نہ کیا اس طرح معصیت چھوٹ جائے گی اور طاعت ہی طاعت رہجائے گی اور یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ ترک ہوائے نفس کے لئے معین یہ خوف۔ اور یہ ظاہر بھی ہے جس کام سے بھی کوئی باز رہتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو صرف خوف سے باز رہتا ہے جسمانی سزا کا ۲۷
خوف ہو یا مال کے نقصان کا، یا اپنے شمولوں میں سبکی کا یا جس چیز کا بھی ہو مگر ہوگا خوف ہی ڈاکو ڈاکہ کیوں نہیں ڈالتا سزا کے خوف سے۔ بچہ شرارت سے کیسے رکتا ہے پٹنے کے خوف سے۔ بہت جرم سے لوگ باز رہتے ہیں جرمانہ کے خوف سے محفل میں آدمی تہذیب سے کیوں بیٹھتا ہے اور خلاف متانت حرکت سے کیوں باز رہتا ہے سُبکی کے خوف سے۔ وعلیٰ ہٰذا خوف ہی تو اُٹھ جاتا ہے جو ملک میں امن قائم نہیں رہتا اور غدر ہو جاتا ہے۔ خوف ہی ہے کہ جملہ برائیوں کی جڑ کاٹنے والا ہے خوف ہی ہے کہ جملہ طاعت کا ذریعہ ہے البتہ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ خوف تو ہر مؤمن کو ہے پھر کیا وجہ کہ ہوائے نفسانی نہیں چھوٹتی وجہ اس کی یہ ہے کہ خوف کا استحضار نہیں۔ اور استحضار نہ ہونیکی وجہ صرف ایک ہی عذاب کا نہ سوچنا۔ بس منتہا معالجہ یہ سوچنا ہوا اسی خوف کا غلبہ و استحضار ہونا جو ترک ہوا کیلئے کافی ہو جاویگا۔

اب صرف اس کا طریق سہل بتائے دیتا ہوں کہ سوچنا شروع کیجئے اور اس کیلئے ایک وقت مقرر کیجئے مثلاً سونے کا وقت ہو وقت آپکے کسی دنیا کے کام میں بھی حرج نہوگا۔ دنیا کے کام میں تو سارا وقت دیا ہے اللہ میاں کے کام میں تھوڑا ہی وقت دو، اتنا تو کرو۔ اللہ میاں اس میں تمھارا

علہ مکرر لکھنے کی وجہ ادرگ؛ ہے۔ ۱۲

کام بنا دینگے وہاں تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ بند ذرا ادھر کو منہ کرو اور رحمت کے انبار اس پر بکھیر دیں۔
پندرہ بیس منٹ دیر میں سونے لیٹ کر یا بیٹھ کر یاد کیا کیجئے کہ آج کیا کیا گناہ کیئے فہرست گناہ تیار کیجئے
پھر دل میں خیال جمایئے گویا میدانِ قیامت موجود ہے اور میزان کھڑی ہے۔ اپنا مددگار کوئی بھی نہیں،
دشمن بہتیرے ہیں، حیلہ کوئی چل نہیں سکتا، زمین گرم تانبے کی طرح کھول رہی ہے آفتاب سر پر
دوزخ سامنے ہے، اور ان گناہوں کا حساب ہو رہا ہے کوئی جواب معقول بن نہیں پڑتا۔ یہ سب
حالات پیشِ نظر ہونگے تو بے اختیار ہاتھ جوڑ کر حاکم کے روبرو معذرت کریگا کہ بیشک خطاوار
ہوں کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کچھ سہارا ہے تو صرف حضور کے رحم کا۔ اسی کو استغفار کہتے ہیں۔ رات
کو یہ کیجئے پھر صبح اٹھ کر یاد رکھیئے کہ فلاں فلاں گناہ کئے تھے اور رات ان سے استغفار اور عہد کیا کہ
سو آج وہ گناہ ہونے پائیں۔ اس سے اگر اسی دن تمام گناہ یک لخت نہ چھوٹ جائیں گے تو کمی تو ہو ہی جائیگی
اور چند روز میں تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ گناہ رہ سکیں۔ یہ ایسی تدبیر ہے کہ چند ہی روز کرنے سے
آدمی معاصی سے بالکل محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور دل میں گناہ کیوقت خود ایک ہراس پیدا ہو جاتا ہے۔

محاسبۂ نفس روزانہ

٢٨ پھر اس کیلئے علم کی ضرورت ہوگی کہ معلوم ہو یہ کام معصیت ہے اور یہ طاعت۔ سو علم دین
حاصل کیجئے اور اگر کم فرصتی کا عذر ہے تو چند کتابیں اردو میں منتخب کردی گئی ہیں ان کو کسی سمجھدار
سبقاً سبقاً پڑھ لیجئے، رفعِ ضرورت کیلئے کافی ہیں۔ کتابوں کو خود نہ پڑھے کہ اس سے طبیعت
میں پہلے جو اشکال ہوتے ہیں وہ حل نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات نئے اشکال پیدا ہو جاتے ہیں۔
اور باعثِ مضرت ہوتے ہیں۔

کم فرصتی میں علم دین حاصل کرنے کی تدبیر

حاصل سارے وعظ کا یہ ہوا کہ جنت مطلوب ہے اور اس کا ذریعہ ہے ترکِ
ہویٰ۔ اور اس کا معین ہے خوف۔ اور اس کا طریق ہے مراقبہ۔ جب مراقبہ کیا خوف
پیدا ہوا اس سے خواہشِ نفسانی چھوٹ گئی اس پر نتیجہ مرتب ہوا

فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ہِیَ الْمَاْوٰی ؕ

"بلاشک جنت ہی ایسے لوگوں کا ٹھکانا ہے"

اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فہم اور توفیق عمل کی عطا فرما دیں۔ آمین۔

تمت

ملنے کا پتہ .. مکتبہ تھانوی ۔ دفتر الابقاء، متصل مسافرخانہ بندر روڈ ۔ کراچی ۱

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

(رواہ البخاری)

وعظ مسمّٰی بہ

ما علیہ الصبر

۲۹

منجملہ ارشادات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محمد عبد المنان غفرلہٗ

"مکتبہ تھانوی"، دفتر "الابقاء"

متصل مسافر خانہ بندر روڈ کراچی نمبر۱

سلسلۃ التبلیغ کا وعظ

مُسَمّٰی بہ

مَاعَلَیْہِ الصَّبْرُ

آَیْنَ	مَتٰی	کَمْ	کَیْفَ	لِمَ	مَاذَا	مَنِ الْمُسْتَمِعُوْنَ	مَنْ ضَبَطَ	[illegible]	اَلْاَشْتَاتُ
اشارہ الی المکان	اشارہ الی الزمان	اشارہ الی الکمیۃ	اشارہ الی الکیفیۃ	اشارہ الی العلۃ	اشارہ الی المضمون	اشارہ الی المستمعین	اشارہ الی الضابط	[illegible]	متفرقات
خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون در کوٹھی مدرسہ	۲۰ محرم ۱۳۴۲ھ بروز یکشنبہ بعد نماز صبح	ایک گھنٹہ ۲۵ منٹ	بیٹھکر	بعض مہمانوں نے بیان کی فرمائش کی اُن کی طلب پر ہوا	ماعلیہ الصبر اعمال اموریہ ہیں اور صبر علی الاعمال کی ایک صورت ہے حقیقت ایک نہیں ہے یعنی اس پر نظر رکھے کہ مقصود	[illegible]	احقر ظفر احمد عفا اللہ عنہ وکان لہ		یہ بیان حقیقۃ الصبر سے متعلق ہے چونکہ اس میں پابندی اعمال کے طرق کا بیان رہ گیا تھا، اس لئے اس جزو کو بیان کرکے مضمون کو مکمل کر دیا گیا۔ فقط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ اَمَّا بَعْدُ فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ اُولٰٓئِکَ عَلَیْھِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَرَحْمَۃٌ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ ۝

۳۱ "ان لوگوں پر خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت بھی ہوگی اور یہی لوگ ہیں سیدھی راہ پر"

جس جزو کی آیت میں نے تلاوت کی ہے اس کے سننے سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ بیان ماسبق کا تتمہ ہے (کیونکہ پرسوں اسی آیت کے متعلق بیان ہوچکا ہے اس بیان کا نام حقیقۃ الصبر ہے) ہر چند کہ یہ بیان بظاہر غیر ضروری ہے، کیونکہ اسی جمعہ کو اس مضمون پر بیان ہوچکا ہے۔ نیز اس وقت میرا قصد بھی بیان کا نہ تھا، اور جب بعض مہمانوں نے فرمائش کی تو میں دیر تک سوچتا رہا کہ کیا بیان کروں، مگر پھر خیال آیا کہ پہلے بیان میں ایک جزو بیان سے رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس وقت بھی ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ اگر وقت ملتا تو میں ایک جزو اس مضمون کے متعلق اور بیان کرتا۔ مگر اس وقت تمہید طویل ہوگئی اور دوسرے مضامین ضروریہ کے بیان میں دیر ہوگئی اس لئے یہ جزو رہ گیا، تو چونکہ اس وقت ایک ایسا مضمون بیان کیا جائے گا جو پہلے بیان نہیں ہوا۔ اور اس کے بغیر مضمون سابق ناتمام رہا جاتا ہے اس لئے یہ بیان غیر ضروری نہیں اور سننے کے بعد

اس کی ضرورت خود ہی معلوم ہو جائیگی۔
اب میں اول اس جزو کی تعیین کئے دیتا ہوں پھر اس کے متعلق ضروری تفصیل بھی عرض کر دوں گا۔ گو وقت تنگ ہے، کیونکہ جن مہمانوں نے بیان کی فرمائش کی ہے وہ اسی ریل سے جانیوالے ہیں اس لئے زیادہ تفصیل کا موقع نہیں، اگرچہ میں نے انسے یہ کہدیا ہے کہ بیان ممتد ہو جائے تو وہ گھڑی دیکھکر وسط بیان میں اٹھکر چلے جائیں بلکہ اگر بیان ریل کے وقت تک ختم نہ ہوا تو میں انشاء اللہ درمیان میں خود ہی اطلاع کر دوں گا کہ ریل پر جانے والے اب چلے جائیں، اسی لئے میں نے گھڑی اپنے پاس رکھ لی ہے تاکہ وقت کو دیکھتا رہوں۔ لیکن جی یہ چاہتا ہے کہ جن صاحبوں نے فرمائش کی ہے وہ اول سے اخیر تک بیان میں شریک رہیں تاکہ کامل مضمون اُن کے کانوں میں پڑ جائے، کیونکہ پورا مضمون اول سے اخیر تک شریک رہنے سے معلوم ہوا کرتا ہے بعض دفعہ کسی مضمون میں کچھ قیود ہوتی ہیں جو اخیر میں بیان کی جاتی ہیں۔ اس لئے وسط میں اُٹھ جانے سے اکثر ناتمام مضمون کانوں میں پڑتا ہے۔ تو جی یہ چاہتا ہے کہ فرمائش کرنیوالوں کے سامنے ہی مضمون ختم ہو جائے۔ اسی لئے میں نے نماز فجر کے متصل ہی بیان شروع کر دیا ہے مگر پھر بھی وقت زیادہ نہیں اس لئے میں قدر ضرورت پر اکتفاء کروں گا اور زیادہ تفصیل نہ کروں گا، مگر انشاء اللہ ضروری باتیں سب بیان کر دی جائیں گی جو لوگ پہلے بیان میں شریک تھے، ان کو معلوم ہے کہ اس وقت بعد چند مقدمات کے یہ ثابت کیا گیا تھا کہ حقیقت صبر میں پابندیِ اعمال بھی داخل ہے عام طور پر لوگ اس کو صبر میں داخل نہیں سمجھتے بلکہ صرف ترکِ جزع و فزع کے ساتھ اس کو مختص سمجھتے ہیں اس خیال کی غلطی اس بیان میں تفصیل کے ساتھ ظاہر کی گئی تھی۔ اس کے بعد یہ تصریح کی گئی تھی کہ مَا عَلَيۡهِ الصَّبۡرُ اور محلِ صبر حقیقت میں ایک ہی چیز ہے۔ مگر اسوقت ماعلیہ الصبر کی تعیین نہ کی گئی تھی، اس وقت میں اس کی تعیین کرنا چاہتا ہوں یہی وہ جزو ہے جو اس وقت بیان سے رہ گیا تھا۔ ۳۲
اب سمجھئے کہ ماعلیہ الصبر کیا ہے تعیین اجمالی اس کی یہ ہے کہ ماعلیہ الصبر ما مور بہ ہے

یعنی جس وقت جس کام کا امر ہو اس پر ثابت رہنا صبر ہے اور وہ مامور بہ ما علیہ الصبر ہے۔ پس اگر کسی وقت معمولات کے ترک کا امر ہو تو اس وقت ترک معمولات ہی ما علیہ الصبر ہوگا اور معمولات مناسب نہ ہوگا۔ یہ بات اس بیان سے واضح نہ ہوئی تھی بلکہ اس وقت اجمالاً اتنا کہہ دیا گیا تھا کہ اعمال طاعات محلِ صبر ہیں، اور یہ بتلایا تھا کہ صبر کا ایک محل خاص ہے کہ ناگوار واقعات میں ناگواری کا تحمل کرنا اور جزع فزع نہ کرنا۔ اور ایک محل عام ہے کہ اس وقت تمام معمولات کو ادا کریں اور کسی وقت امر ناگوار کی وجہ سے اعمال میں خلل نہ ڈالیں۔ ورنہ اس گنوار کی سی مثال ہوگی جس نے رمضان کا روزہ رکھا تھا اتفاق سے اس کی بھینس مرگئی تو اس نے فوراً روزہ توڑ ڈالا، اور خدا تعالیٰ سے خطاب کرکے کہا کہ آپ نے میری بھینس مار دی تو جاؤ ہم نے بھی روزہ توڑ دیا۔

ہم بین گو اس طرح کھلا نہ کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ درپردہ وہ بھی ایسا ہی کرتے ہیں گو اعتقاداً نہ سہی مگر عملاً سب ایسا کرتے ہیں۔ کہ جہاں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی امر ناگوار پیش آیا اس کی وجہ سے فوراً اعمال میں خلل ڈال دیا۔ حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ ناگوار واقعات میں ہمارا کیا بگڑتا ہے، کچھ بھی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے سہ "ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود"۔ ناگوار واقعات میں جس قدر حکمتیں ہوتی ہیں ان پر نظر کرکے یہ کہنا غلط ہے کہ ان سے ہمارا کچھ بگڑ گیا ہے۔ بلکہ درحقیقت وہ عین رحمت ہیں جیسے میں نے استاد کی مار اور ڈاکٹر کے اپریشن کی مثال سے اس کو بیانِ گذشتہ میں واضح کردیا تھا۔ نیز میں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ واقعات ہمارے اوپر بطور امتحان کے آتے ہیں جس میں کامیاب ہونے پر ہم کو اجر عظیم کی بشارت ہے تو حق تعالیٰ نے آپ کو انعام دینے کی غرض سے آزمایا تھا۔ آپ سمجھے کہ ہمارا نقصان کردیا۔ یہ تو وہی مثل ہوگئی کہ گدھے کو دیا تھا نمک اس نے سمجھا کہ میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں۔ پھر جس چیز میں حق تعالیٰ نے تصرف کیا ہے وہ اُن کی ہی چیز تھی آپ کا اس میں تھا کیا کچھ بھی نہیں۔ خدا تعالیٰ اگر ہمارے حال میں تصرف کریں یا متعلقین میں تصرف کریں یا جائداد اور اولاد میں تصرف کریں تو یہ سب چیزیں انہی کی تو ہیں۔ اپنی چیز

چیز میں اگر وہ تصرف کریں تو تمہارا کیا بگڑا ۔ یہی مقدمہ غلط ہے کہ یہ چیزیں تمہاری ہیں ۔ جب تمہاری کوئی چیز نہیں تو ان کے نقصان سے تمہارا کچھ بھی نہیں بگڑتا ۔ پھر اعمال میں کوتاہی کس لئے ہے ۔ صاحبو! یہ حق تعالیٰ کی کتنی بڑی رحمت ہے ۔ کہ اپنی چیز میں تصرف کر کے بندوں کو صبر کا صلہ دیتے ہیں ۔ حالانکہ بندوں کو کسی تصرف پر نہ غم کرنے کا کچھ حق ہے نہ رنج کرنے کا ۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے ان کا بگاڑا ہی کچھ نہیں جو اُن کو رنج و غم کا حق ہو اور اگر وہ ناحق رنج کر کے صبر بھی کریں ، تو یہ کچھ کمال کی بات نہیں ۔ بس ان کے رنج کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی پادشاہ اپنا خزانہ ایک خزانچی کے سپرد کر کے کسی وقت میں لے اور خزانچی رونے چلانے لگے تو کیا کوئی عاقل اس کے رنج کو بجا کہہ سکتا ہے ۔ ہرگز نہیں اور اگر وہ رنج کر کے صبر و تحمل بھی کر لے تو کیا کوئی اس کو اس صبر و تحمل کی بناء پر مستحق انعام کہہ سکتا ہے ۔ ہرگز نہیں ۔

یہی حالت ہماری ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو خزانچی بنا رکھا ہے ۔ اور اپنی کچھ چیزیں
۲ ہمارے سپرد کر دی ہیں ۔ اور جب چاہتے ہیں وہ اپنی چیزوں میں تصرف کر لیتے ہیں ۔ تو ہم کو نہ اس میں کچھ رنج و ملال کا حق ہے نہ بے جا رنج پر صبر کر کے کچھ انعام کا استحقاق ہے ۔ مگر حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس بے جا رنج پر صبر کرنے سے اجر و ثواب اور انعام و جزا کی بشارت دی ہے پھر حسرت ہو کہ ہم ناگوار واقعات میں خدا تعالیٰ سے خفا ہو کر اعمال میں خلل ڈالنے لگیں ، جیسا کہ اس گنوار نے کیا تھا کہ بھینس کے مرنے پر روزہ توڑ دیا ۔ اور کم و بیش ناگواری سے بہت کم لوگ خالی ہیں ۔ طبعی رنج تو غیر اختیاری ہے مگر افسوس یہ ہے کہ ہم لوگ عقلی ناگواری میں مبتلا ہو جاتے ہیں ۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ وہ چیز جس میں حق تعالیٰ نے تصرف کیا ہے تمہاری ہی چیز تھی اور یہ بھی مان لیا جائے کہ تمہارا کچھ بگڑ بھی گیا تب بھی ناگواری کا حق نہ ہونا چاہئے ۔ کیونکہ ؎

آنکہ بجائے نست ہر دم کرمے ٭ عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

"جس شخص نے تجھ پر عمر بھر احسان کیا ہو اگر اس سے کبھی کوئی غلطی ہو جائے تو معذور سمجھ"

اے صاحب جس خدا نے سالہا سال ہم کو راحت و آرام میں رکھا ہے، اگر کسی وقت وہ تکلیف بھی دے دیں تو کیا یہی انسانیت ہے کہ ہم اس تکلیف کو زبان پر لائیں اور ناگواری کا اثر لے کر اطاعت میں کوتاہی کرنے لگیں؟ صاحبو! سلاطینِ عالم فوجی ملازموں کو سالہا سال بے مشقت گھر بیٹھے تنخواہ دیتے ہیں، اور کسی وقت دشمن کے مقابلہ میں بھی بھیجدیتے ہیں، تو بتلایئے کیا اس وقت فوجی ملازم کو اس حکم پر ناگواری کا کچھ بھی حق ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ اس وقت کہا جاتا ہے کہ نمک حلالی یہی ہے کہ جس بادشاہ نے برسوں گھر بیٹھے تنخواہ دی ہے، اور بلا کسی مشقت و کلفت کے خبرگیری کی ہے کسی وقت اس کے حکم سے مشقت بھی ضرور برداشت کرنا چاہئے، (بشرطیکہ وہ حکمِ خدا تعالیٰ کے خلاف نہ ہو)۔ چنانچہ فوجی ملازم کبھی ایسے وقت میں انکار نہیں کرتا اور خوشی کے ساتھ دشمن کے مقابلہ میں بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے ہر قسم کی مصیبت کو برداشت کرتا ہے اور جان دینے کو اپنی سعادت اور نمک حلالی سمجھتا ہے۔

۳ پھر کس قدر افسوس ہے کہ باوجود دعویٔ شرافت کے ہمارا خدا تعالیٰ کے ساتھ وہ برتاؤ بھی نہ ہو جو ایک ادنیٰ فوجی ملازم کا جو اکثر چھوٹی قوموں کے لوگ ہوتے ہیں ایک ادنیٰ بادشاہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ واقعی اگر مصیبت میں ہمارا کچھ بگڑ ابھی ہوتا جب بھی ایسے محسن سے ناگواری کا خیال دل میں لانا یا زبان سے ظاہر کرنا بالکل ہی انسانیت سے دور اور شرافت کے خلاف ہے۔

حضرت لقمان علیہ السلام کی حکایت ہے کہ وہ ابتدا میں کسی شخص کے غلام تھے، ایک دفعہ ان کے آقا نے ککڑی منگائی اور اس کی قاشیں کر کے پہلے ایک قاش اپنے ہاتھ سے حضرت لقمانؑ کو دی، جس کو انھوں نے خوشی خوشی کھا لیا، وہ اتفاق سے بہت تلخ تھی مگر حضرت لقمان نے ذرا منہ نہ بنایا نہ کوئی اثر ناگواری کا ظاہر ہونے دیا آقا سمجھا کہ شیریں ہوگی، اس نے بھی ایک قاش کھائی تو فوراً تھوکنے لگا اور ان سے سوال کیا کہ کیا تم کو یہ کڑوی نہیں لگی، فرمایا تلخی معلوم تو ہوئی تھی، پوچھا پھر تم نے خوشی خوشی کیسے کھا لیا ذرا بھی منہ نہ بنایا، فرمایا کہ حضور جس ہاتھ سے میں نے عمر بھر

اتنی شیرینیاں کھائی ہیں کیا اس کے ہاتھ سے ایک تلخی پر منہ بناتا۔ یہ تو انسانیت کے خلاف تھا اس لئے میں نے ناگواری ظاہر نہیں کی۔ اسی کو سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

آنرا کہ بجائے تست ہر دم کرمے ✽ عذرش بنہ ار کند بعمرے ستمے

پھر کوئی یہ تو بتلائے کہ ناگواری کی حالت میں اعمال کے اندر خلل ڈالنے سے حق تعالیٰ کا کیا نقصان ہے اگر تم نماز روزہ کی پابندی کرو گے تو حق تعالیٰ کو بخش دو گے اور جو نہیں کرو گے تو ان کا کیا بگاڑ دو گے؟ جو کچھ نقصان ہوگا تمہارا ہی ہوگا۔ پھر اس حالت میں تو کسی مصیبت کی وجہ سے اعمالِ طاعات میں خلل ڈالنے کی ایسی مثال ہوئی جیسے کسی نے ایک شخص سے روپیہ قرض لے کر مکان بنایا تھا، قرضخواہ نے روپیہ کا تقاضا کیا، تو کہدیا ابھی روپیہ ہمارے پاس نہیں ہے، اس نے زیادہ تقاضا کیا تو آپ نے غصہ میں آکر مزدور لگا کر بنا بنایا مکان ڈھا دیا، کہ جاؤ ہم تمہارے روپیہ کا مکان ہی نہیں رکھتے، بھلا اس نے مکان ڈھا کر کس کا نقصان کیا۔ قرضخواہ
کے روپے تو پھر بھی ذمہ رہے، ایک نقصان اور سر لے لیا کہ مکان سے بھی ہاتھ دھویا ۴

اسی طرح ناگوار واقعات میں اعمال و معمولات کے ترک سے مصیبت تو کم ہو نہیں جاتی، ہاں ترکِ اعمال کا نقصان اور بڑھ جاتا ہے۔ ایک نقصان تو غیر اختیاری ہوا تھا یہ دوسرا نقصان ہم اپنے ہاتھوں کرتے ہیں، جس سے مصیبت کو اور ترقی ہوتی ہے، جیسے کسی شخص کی ناک پر بار بار مکھی بیٹھتی تھی جس سے وہ تنگ آگیا، تو اس نے غصہ میں ناک ہی کاٹ ڈالی کہ جاؤ ہم اڈا ہی نہیں رکھتے۔ بھلا مکھی کا اس سے کیا نقصان ہوا اس کو تو اب چشمۂ شیریں مل گیا اور ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں ✽ مگس و مرغ و مور گرد آیند

"جس جگہ میٹھا پانی ہوتا ہے وہاں مکھیاں اور دوسرے جانور جمع ہوتے ہیں۔"

پہلے تو مکھی ہی آتی تھی اب چیونٹی اور چیونٹے بھی آئیں گے، یہی حال ہمارا ہے کہ ایک مصیبت میں اعمال ترک کرکے ہم دوسری آفتوں کو بھی بلا لیتے ہیں۔

حـ ترجمہ پہلے گذر گیا ۱۲

اس مضمون کو پہلے بیان میں تفصیل کے ساتھ بیان کر کے میں نے یہ کہا تھا کہ مصائب کے وقت اعمال میں خلل نہ ڈالنا چاہئے جس سے متبادر یہ ہوا تھا کہ اپنے معمولات پر پابند رہنا چاہئے، اور اسی کو ماعلیہ الصبر سمجھا گیا تھا۔ اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ اعمالِ ظاہرہ ماعلیہ الصبر کی صورت ہیں، اور اس کی حقیقت دوسری شے ہے، یعنی امتثالِ امر یعنی جس وقت جس بات کا امر ہو اس کا بجا لانا صبر ہے، اور وہ مامور بہ ماعلیہ الصبر ہے اگر کسی وقت پابندیٔ معمولات میں امتثالِ امر ہو اس وقت معمولات ماعلیہ الصبر ہیں، اور جس وقت ترکِ معمولات میں امتثالِ امر ہو اس وقت ترکِ معمولات ماعلیہ الصبر ہیں، یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ماعلیہ الصبر فقط صورتِ اعمال کے ساتھ خاص ہے بلکہ امتثالِ امر کی رعایت اس میں ضروری ہے اس کو میں پہلے صراحۃً بیان نہ کر سکا تھا کیونکہ وقت نہ ملا، اب اس کو بیان کرتا ہوں، اور اس کے لئے مجھے دوسری آیت تلاش کرنے کی فکر ہوتی، مگر الحمد للہ کہ اسی آیت میں ایک لفظ اس پر دال ہے۔ وہ
لفظ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ہے۔ میں نے پہلے اس کو بطور بشارت کے بیان کیا ۵
تھا، مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی ماعلیہ الصبر اور مامور بہ ہے۔ گویا اسمیں صابرین کا پتہ بتلایا گیا ہے کہ صابر وہ لوگ ہیں جو ناگواری کے وقت ہدایت پر قائم رہتے ہیں یعنی سیدھے راستہ پر جمے رہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ راستہ پر چلنے سے کسی مقصود پر پہنچنا مطلوب ہوتا ہے، پس مُهْتَدُوْنَ کا حاصل یہ ہوا کہ ناگواری کے وقت وہ لوگ سیدھے راستہ پر چلتے ہیں اور مقصود پر نظر رکھتے ہیں، پس یہاں ایک تو یہ بات بتلائی گئی ہے کہ یہاں دو راستے ہیں ایک سیدھا اور ایک ٹیڑھا۔ چنانچہ دوسری آیت میں اسکو صراحۃً بیان فرمایا ہے وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ دوسرے مقام پر ارشاد ہے وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد ہے کہ لوگوں سے فرما دیجئے کہ یہ میرا راستہ ہے سیدھا اس کا اتباع کرو اور دوسرے راستوں کا اتباع نہ کرو وہ تم کو خدا کے راستہ سے متفرق کر دیں گے۔ مقصود تو یہ ہے کہ ٹیڑھا راستہ تم کو خدا تعالیٰ سے جدا کر دے تا

مگر تَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ مبالغۃً فرمایا گیا ہے کہ ٹیڑھے راستوں پر چل کر تم کو خدا تو کیا ملتا خدا کا راستہ بھی نہ ملے گا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ میں سیدھے راستہ پر چلنے کا ذکر تو صراحۃً ہے۔ کیونکہ ہدایت اسی کو کہتے ہیں ٹیڑھے راستہ پر چلنے کو ہدایت نہیں کہتے بلکہ ضلالت کہتے ہیں۔ رہی دوسری بات یعنی سیدھے راستہ پر چلنے کے ساتھ مقصود پر نظر رکھنا، سو گو اس کا ذکر صراحۃً نہیں، مگر ادنیٰ تامل سے اس پر بھی اس کی دلالت واضح ہے، کیونکہ یہ تو ظاہر ہے کہ کسی راستہ پر چلنے سے کسی مقصود پر پہنچنا ہی مطلوب ہوتا ہے راستہ خود مطلوب نہیں ہوتا، اس کے ساتھ دوسرا مقدمہ یہ ملایا جائے کہ طریق دو قسم کے ہیں ایک حسی دوسرے معنوی۔ طریق حسی کا موصل الی المقصود ہونا چلنے والے کے قصد و ارادہ پر موقوف نہیں، بلکہ اگر راستہ سیدھا ہو تو آنکھیں بند کر کے بھی چلنے سے مقصود تک وصول ہو جاتا ہے، مثلاً دہلی کو جو سیدھی سڑک جاتی ہے اس پر جو کوئی بھی چلے گا دہلی پہنچ جائے گا، خواہ دہلی کا
۶ قصد ہو یا نہ ہو، اور طریقِ معنوی کی یہ حالت نہیں، اس میں بدون قصد و ارادہ کے وصول نہیں ہو سکتا۔ گو راستہ سیدھا بھی ہو، مگر ہر وقت مقصود پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے،

اب سمجھو کہ اس طریق کا مقصود کیا ہے، سو نصوص میں غور کرنے سے یہ بات ظاہر ہے کہ مقصود اس طریقِ معنوی سے رضائے حق ہے، اور نصوص ہی سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ یہ مقصود بدون ارادہ و نیت کے حاصل نہیں ہو سکتا گو راستہ سیدھا ہی اختیار کیا گیا ہو، چنانچہ حدیث میں ہے:۔

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ وَاِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَّانَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَأَۃٍ یَّتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ۔

"تمام اعمال کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اور آدمی کو وہی ملتا ہے جو اسکی نیت ہو، پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)

کے دین کی خاطر ہو اس کو اسی کا اجر ملے گا، اور جو شخص ہجرت دنیا یا کسی عورت
سے نکاح کی نیت سے کرے تو اس کی ہجرت اسی کے لئے ہے جس کے لئے
کی (یعنی ایسی ہجرت دنیا کے لئے ہے دین کے لئے نہیں اس لئے اس کا
اجر و ثواب بھی نہیں)۔"

اس حدیث کا پہلا جزو اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ بتلا رہا ہے کہ اعمالِ شرعیہ سے ثواب بدون نیت کے حاصل نہیں ہوتا (اعمال کی تفسیر اعمالِ شرعیہ سے اس لئے کی گئی کہ شارع علیہ السلام کو اعمالِ غیر شرعیہ سے بحث کی ضرورت ہی نہیں۔ پھر آگے ہجرت کا ذکر فرمانا اس کا قرینہ ہے اور ثواب الاعمال سے تفسیر اس لئے کی گئی کہ وجودِ اعمال بدونِ نیت کے ہو سکتا ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے، لہٰذا توقف وجودِ اعمال علی النیۃ شارع کا مقصود نہیں ہو سکتا، کیونکہ اوّل تو یہ خلاف واقع ہے، دوسرے وجود اشیاء بھی ان امور کے قبیل سے ہے جو شارع علیہ السلام کی بحث سے خارج ہیں، شارع کا مقصود بیانِ احکام ہوتا ہے نہ کہ بیانِ کیفیات وجود۔ اب اس میں گفتگو ہو سکتی ہے کہ یہاں صحت اعمال مراد ہے یا ثواب اعمال۔ سو اس کا جواب حنفیہ نے کتبِ فقہ میں دیدیا ہے، کہ چونکہ ثواب اعمال کا نیت پر موقوف ہونا اجماعی ہے، اس لئے تقدیر صحت سے تقدیر ثواب اولیٰ ہے ۱۲ جامع) اور ثواب و رضا باہم قریب قریب ہیں، جب حق تعالیٰ کسی عمل پر ثواب دیں گے تو اس سے راضی بھی ہوں گے۔ دوسرے ثواب سے بھی رضا ہی مقصود ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ رضا ثواب کی اعلیٰ فرد ہے۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے متعلق صاف فرمایا کہ اگر اس سے خدا مطلوب نہ ہو تو وہ شرعاً قابلِ قدر اور لائق اعتبار نہیں اور اس سے خدا تک وصول نہ ہوگا، تو دیکھئے ہجرت کتنا بڑا عمل ہے کہ جہاد کے برابر ہے، اور اس کا طریقِ ہدایت ہونا یقینی ہے کیونکہ عمل شرعی ہے مگر بدونِ نیت و ارادہ کے وہ بھی موصل نہیں۔ علیٰ ھٰذا نماز کتنا بڑا عمل ہے لیکن خدا کے لئے نہ ہو بلکہ ریا کاری سے ہو تو ہرگز وصول و قرب مرتب نہ ہوگا، اسی طرح جملہ اعمالِ شرعیہ میں غور کر لیا جائے کہ مقصود کی نیت اور قصد

سب میں شرط ہے بدون اس کے وہ موجب وصول نہیں ہو سکتی، جب نصوصِ شرعیہ سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ بدون نیت کے کوئی عمل مقبول نہیں، تو معلوم ہوا کہ ہدایت صرف اس کا نام نہیں کہ اعمالِ شرعیہ کی صورت کو اختیار کر لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ طلب رضاءِ حق بھی شرط ہے پس یہ ثابت ہو گیا کہ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ میں سیدھے راستہ پر چلنے کے ساتھ مقصود پر نظر رکھنا بھی مذکور ہے، کیونکہ اس کے بغیر ہدایت کی صورت ہی صورت ہوگی حقیقت نہ ہوگی، اور مقصود رضاءِ حق ہے، پس حاصل یہ ہوا کہ صابر وہ ہیں جو ناگواری کے وقت رضاءِ حق پر نظر رکھتے ہیں اور اس کو فوت نہیں کرتے، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ رضاءِ حق کا مدار امتثالِ امر پر ہے، پس صبر کی حقیقت امتثالِ امر ہوئی، اور ما علیہ الصبر مامور بہ ہوا، یہی مطلوب تھا،

اب ہمارے اندر بعض لوگ تو ایسے ہیں جو پریشانی کے وقت طریق ہی میں خلل ڈالتے
ہیں کہ جہاں مصیبت آئی فوراً اعمال سابقہ کی پابندی چھوڑ دی اور ناجائز امور میں مبتلا
ہو گئے، اکثر لوگ تو ایسے ہی ہیں ان کی تو زیادہ شکایت نہیں، یہ تو گفتگو ہی سے خارج ۸
ہیں، دوسری جماعت وہ ہے جو طریق پر غلو کے ساتھ جمے رہتے ہیں کسی حال میں بھی انکی تسبیحیں اور معمولات فوت نہیں ہوتے۔ مگر ان کی نظر مقصود پر نہیں ہوتی اس لئے بعض دفعہ ان سے مقصود فوت ہو جاتا ہے، مثلاً بعض لوگ ایسے معمولات کے پابند ہوتے ہیں کہ چاہے لڑکا مر جاوے مگر وظیفہ فوت نہیں ہوتا، لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں کہ بڑے پابند اوقات ہیں، مگر قواعدِ شرعیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی پابندی شرعاً محمود نہیں، یہ غلو فی الدین میں داخل ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ پابندی کا توڑنا بھی مامور بہ ہے، بلکہ بعض دفعہ نماز شروع کر دینے کے بعد نماز کا توڑ دینا بھی واجب ہوتا ہے جیسے کوئی اندھا آرہا ہو اور اس کے راستہ میں کنواں یا گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہو تو نماز کا توڑنا اور اس کا بچانا واجب ہے۔ اس وقت امتثالِ امر اسی میں ہے کہ عمل کو توڑ دے اس وقت نماز پڑھنے میں امتثالِ امر نہیں۔

ایک صحابی کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ وہ جنگل میں گھوڑے پر سوار چلے جا رہے تھے کہ

نماز کا وقت آگیا، وہ گھوڑے سے اُترے اور وضو کر کے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لے کر نماز میں مشغول ہوگئے، وہ گھوڑا کبھی کبھی شوخی کر کے ایک دو قدم چلتا تھا تو آپ بھی ایک دو قدم اس کے ساتھ آگے پیچھے ہٹ جاتے تھے، ایک خارجی نے ان کو نماز میں آگے پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھکر اعتراض کیا کہ یہ کیسی نماز ہے، ان صحابی نے فرمایا کہ تم کیا جانو، ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے ہیں، آپؐ نے ہم پر ایسی سختی نہیں کی کہ سفر میں بھی اسی طرح خشوع و اطمینان سے نماز پڑھیں جس طرح حضر میں پڑھا کرتے ہیں ۲) بھلا اگر میں گھوڑے کو چھوڑ کر نماز پڑھتا اور گھوڑا بھاگ جاتا، تو پھر کیسی پریشانی ہوتی، پھر شاید اس وقت یہ خیال آتا کہ ہائے میں نے نماز ہی کیوں پڑھی تھی جو اتنا نقصان ہوا، اور یہ حالت بہت سخت ہے، کہ انسان طاعت کر کے اس پر پچھتائے " اس لئے حضرات صحابہؓ کو تقویٰ کا غلو نہ تھا، کہ چاہے کچھ ہی ہو جائے مگر معمول نہ چھوٹے، کیونکہ بعض دفعہ معمول کی پابندی ظاہر میں تو اچھی ہوتی ہے مگر باطن میں اس سے یہ نقصان ہوتا ہے کہ پابندی
۹ سے جب دنیا کا ضرر ہوتا ہے تو اس وقت طاعت پر پچھتاتا ہے، اسی لئے میں بعض لوگوں سے جو حج کا ارادہ کر کے جاتے ہیں یہ کہدیتا ہوں کہ سفر مدینہ میں اگر خطرات سے پورا اطمینان ہو تو جانا ورنہ حج کر کے واپس آجانا، گو یہ بات ظاہر میں بہت سخت ہے مگر میں اس نیت سے کہدیتا ہوں کہ ایسا نہ ہو خطرہ کی حالت میں سفر کر کے بعد میں نفس یہ کہے کہ ہائے میں ناحق ہی آیا، اور سفرِ مدینہ پر پچھتائے تو یہ حالت مدینہ نہ جانے سے زیادہ سخت ہوگی۔ کیونکہ اس وقت تو یہی حسرت ہوگی کہ ہائے میں زیارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے محروم رہا اور امید ہے کہ یہ حسرت ہی کام دے جائے، اور اب یہ افسوس ہوگا کہ ہائے میں کیوں آیا تھا، اور ان دونوں حالتوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے۔ اس خارجی معترض کی نگاہ اس دسیسہ پر نہ پہنچی تھی، اس لئے اس نے صحابی پر اعتراض کیا۔ خارجی لوگ بظاہر اعمال کے بہت پابند ہوتے تھے، اور وہ نماز روزہ میں اہلِ سنت سے زیادہ پختہ تھے، کیونکہ ان کے یہاں اعمال جزوِ ایمان ہیں اور ان کے نزدیک گناہ کبیرہ سے بھی آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ مگر ان میں اعمال کی صورت ہی صورت تھی حقیقت نہ تھی،

جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بعض لوگ قرآن کو ایسا سنوار کر پڑھیں گے جیسا کہ تیر کو سیدھا کیا جاتا ہے مگر حالت یہ ہوگی کہ قرآن ان کے گلے سے نیچے نہ اُترے گا بس اوپر ہی اوپر رہیگا وہ اسلام سے ایسے نکلیں گے جیسے تیر بعض دفعہ نشانہ سے تیزی کے ساتھ نکل جاتا ہے کہ اس میں خون کا نشان تک نہیں ہوتا، معلوم ہوا کہ شریعت میں اعمال ظاہرہ کی ایسی پابندی مطلوب نہیں جس میں محض صورت ہی صورت ہو اور مقصود پر نظر نہ ہو، بلکہ ایسی پابندی مطلوب ہے جس میں ہر وقت مقصود یعنی رضائے حق پر نظر ہو، گو اس سے بعض دفعہ صورت میں بھی خلل آجائے، چنانچہ ایک بار امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سفر میں تھے اونٹ پر چلتے ہوئے نیند آگئی اور بالکل طلوعِ شمس کے قریب آنکھ کھلی، جلدی سے اُتر کر وضو کیا، نماز شروع کی، امام ابو یوسف امام بنائے گئے، امام ابو یوسف نے چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھیں اور تمام ارکان میں تخفیف کی، رکوع اور سجدہ وغیرہ جلدی جلدی ادا کیا، اس وقت کوئی زاہد خشک ہوتا تو یوں کہتا کہ نماز ناقص ہوئی، مگر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ نے نماز کے بعد فرمایا
۱۰ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ صَارَ یَعْقُوْبُنَا فَقِیْہًا خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یعقوب یعنی امام ابو یوسف فقیہ ہوگئے، اس وقت ان کا نماز میں جلدی کرنا تفقہ کی علامت تھی، کیونکہ طلوعِ شمس قریب تھا اگر وہ جلدی نہ کرتے تو نماز قضا ہو جاتی، اور گناہ ہوتا، دوسرے ادا نماز کا درجہ قضا سے بہت بڑھا ہوا ہے، پس اس وقت جلدی کرنے ہی سے نماز کامل ہوئی، خشوع خضوع کے ساتھ پڑھنے سے ناقص ہوتی، مگر ان باتوں پر فقیہ کی نظر ہی پہنچ سکتی ہے کہ اس وقت جلدی مناسب ہے یا ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا مناسب ہے، جاہل تو ہر حالت میں ایک سی ہی نماز پڑھے گا، چاہے وہ ادا ہو یا قضا ہو جائے، یا رفقاء کو ایذا ہونے لگے، چنانچہ ایک بزرگ ہمارے ساتھ سفر میں تھے، راستہ میں مغرب کی نماز پڑھی گئی تو اس بندۂ خدا نے فرض و سنت کے بعد صلوٰۃ الاوابین شروع کردی، اب جب تک ان کی صلوٰۃ اوابین ختم نہ ہوگئی سب لوگ رُکے رہے، تمام رفقاء کو تکلیف ہوئی، اسی طرح ایک اور بزرگ کے ساتھ لوگ سفر میں چل رہے تھے، ظہر کی نماز کا وقت آیا تو وہ حضرت فرضوں کے بعد وظیفہ پڑھنے بیٹھ گئے، لوگوں نے کہا سوار ہو جائیے، تو آپ فرماتے ہیں کہ میں تو ظہر سے عصر

تک بیٹھا کرتا ہوں میں عصر سے پہلے نہیں اُٹھ سکتا تمام رفقاء سخت پریشان ہوئے اور آئندہ کو تو عہد کر لیا ہوگا کہ ان کے ساتھ کبھی سفر نہ کرنا چاہئے، تو یاد رکھو ایسی پابندی میں محض صورت عمل ہوتی ہے حقیقت نہیں ہوتی، کیونکہ اس وقت شریعت کا حکم ہے کہ معمول کو ترک کر کے ضروری پر اکتفاء کرو اور رفیقوں کو تکلیف نہ پہونچاؤ، حدیث میں جریج عابد کا قصہ آتا ہے کہ وہ اپنے صومعہ میں مشغول عبادت تھے، کہ نیچے سے ان کی ماں نے پکارا وہ دل میں کہنے لگے کہ اے اللہ ادھر میری ماں پکار رہی ہے اور ادھر میری نماز ہے میں کیا کروں، بالآخر وہ نماز ہی میں لگے رہے، ماں نے چند بار پکارا مگر انھوں نے جواب نہ دیا۔ اس وقت شریعت کا حکم یہ تھا کہ وہ بول پڑتے اور نماز کا بعد میں اعادہ کر لیتے، کیونکہ نماز فرض نہ تھی، نفل تھی، اور ماں کو اطلاع نہ تھی کہ یہ نماز میں مشغول ہیں، اس وقت جواب نہ دینے سے اس کو کلفت ہوتی تھی، چنانچہ اس نے دو تین بار آواز دینے کے بعد دعاء کی، جس کا لمبا قصہ حدیثوں میں آتا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کو نقل کر کے فرمایا
لَوْکَانَ فَقِیْہًا لَاَجَابَ اُمَّہٗ یعنی اگر جریج فقیہ ہوتے تو اپنی ماں کو ضرور جواب دیتے خاموش ۱۱
نہ رہتے، دیکھئے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز توڑ دینے کو افضل قرار دیا، حضرت جریجؒ کو یہ شبہ ہوا تھا کہ نماز حق اللہ ہے اور ماں کو جواب دینا حق العبد ہے اور حق اللہ حق العبد سے مقدم ہے، اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ دوسرا مقدمہ تو صحیح ہے کہ حق اللہ حق العبد سے مقدم ہے۔ مگر پہلا مقدمہ غلط ہے کہ اس وقت ماں کو جواب دینا محض حق العبد ہی تھا ان کو بوجہ عدم تفقہ کے یہ خبر نہ تھی کہ اس وقت نماز کا توڑنا اور ماں کو جواب دینا حق اللہ بھی ہے، کیونکہ اس وقت اسی کا امر تھا اور جس چیز کا جس وقت امر ہو وہ حق اللہ بھی ہے محض حق العبد نہیں، گو ظاہر میں بندہ سے اس فعل کا تعلق ہو، اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں کہ جس فعل کا تعلق عبد سے دیکھتے ہیں اس کو حق العبد ہی سمجھتے ہیں حالانکہ جب وہ شرعاً مامور بہ ہے تو حق اللہ بھی ہے اور حقوق العباد سب کے سب مامور بہا ہیں تو وہ حق اللہ سے خالی نہیں۔ پس کسی بندہ کے واسطے نماز توڑ دینا درحقیقت حق اللہ کی رعایت ہی، کیونکہ اس وقت خدا تعالیٰ کا یہی حکم ہے۔ ابھی کل پرسوں کا واقعہ ہے کہ میں

صبح کی سنتیں پڑھ رہا تھا کہ بڑے گھر سے آدمی دوڑا ہوا یہ خبر لایا کہ گھر میں سے کوٹھے کے اوپر سے گر گئیں ہیں، میں نے خبر سنتے ہی فوراً نماز توڑ دی، یہاں تو سب سمجھدار لوگ ہیں، مگر شاید بعض ناواقف اپنے دل میں اس وقت یہ کہتے ہوں گے کہ ہائے بیوی کے واسطے نماز توڑ دی، بیوی سے اتنا تعلق ہے کہ خدا کی عبادت کو اس کے لئے قطع کر دیا، بیشک اس وقت اگر کوئی دوکاندار پیر ہوتا وہ ہرگز نماز نہ توڑتا، کیونکہ اس سے جاہل مریدوں کے نظروں میں ہیٹی ہوتی، مگر الحمد للہ مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کوئی کیا کہے گا۔ اگر کسی کی نظر میں اس فعل سے میری ہیٹی ہوئی وہ شوق سے کوئی دوسرا شیخ تلاش کر لیں جب خدا کا حکم تھا کہ اس وقت نماز کو توڑ دو تو میں کیا کرتا، کیا اس وقت جاہلوں کی نظر میں بڑا بننے کے لئے میں حکمِ خداوندی کو چھوڑ دیتا اور جریج عابد کی طرح نماز ہی میں مشغول رہتا، وہ تو اس حکم سے ناواقف تھے، اس لئے معذور تھے، مگر میں تو بحمد اللہ اس حکم سے ناواقف نہ تھا ظاہر ہے کہ جب بیوی کوٹھے پر سے گری، تو اس کی چوٹ کو شوہر ہی ہلکا کر سکتا
۱۲ ہے، اور وہی دریافت کر سکتا ہے کہ چوٹ کہاں لگی کہاں نہیں لگی بخصوص ایسی حالت میں کہ گھر کے اندر بجز ایک ناسمجھ بچی کے اور ایک معذور بڑھیا کے کوئی امداد کرنے والا بھی نہ تھا، اور امداد کرنے والے ہوں بھی تو کوٹھے سے گر جانا بعض دفعہ ہلاکت کا سبب ہو جاتا ہے، فوراً ہی کوئی تدبیر ہو جائے تو زندگی کی آس ہو سکتی ہے، اس لئے بھی مجھ کو فوراً جانا ضروری تھا، اس لئے میں نے شرعاً اس وقت نماز کا توڑ دینا اور فوراً جا کر انکی خبر گیری کرنا ضروری سمجھا، حدیث میں آتا ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ فرما رہے تھے کہ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما میں سے کوئی ایک صاحبزادے مسجد میں آ گئے اس وقت وہ چھوٹے بچے تھے چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ توڑ کر ان کو دور ہی سے گود میں اٹھا لیا، حالانکہ خطبہ بحکم صلوٰۃ ہے جو بدون کسی سخت عذر کے قطع نہیں ہو سکتا، تو جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نواسوں کے لئے خطبہ توڑ دیا تو میں کیا چیز تھا، اتنے بڑے حادثہ کے وقت سنتوں کی نسبت نہ توڑتا، اس میں بیوی کی رعایت نہ تھی بلکہ حق اللہ کی رعایت تھی، کیونکہ اس وقت خدا کا حکم یہی تھا، خدا کے حکم کے سامنے بیوی

کیا چیز ہے، اگر حق تعالیٰ کسی وقت بیوی کے قتل کا حکم دیں تو سچا مسلمان ایسا بھی کردے گا، اور جہاں وہ اس کی خبرگیری کا حکم دیں وہاں وہ اس کے لئے نماز بھی توڑ دے گا، اور دونوں صورتوں میں دونوں فعلوں کا سبب حق اللہ ہی ہوگا، پس جس جگہ شریعت ترک معمولات کا امر کرتی ہو جیسے سفر میں رفقاء کی رعایت سے فرائض وسنن مؤکدہ پر اکتفاء کرنا یا جس جگہ نماز توڑنے کا امر کرتی ہو جیسے کسی مسلمان کی حفاظت وخبرگیری کے لئے ایسا کرنا۔ وہاں معمولات کی پابندی کرنا غلو فی الدین اور تقویٰ کا ہیضہ ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص ایک دانہ گیہوں کی تعریف یعنی تشہیر کرتا پھرے کہ یہ دانہ کس کا ہے اس پر تعزیر جاری کی جائے، آخر کیوں، اسی لئے تو کہ یہ ورع نہیں بلکہ ورع کا ہیضہ ہے،

پس ہمارے اندر بعض لوگ تو وہ ہیں جو پریشانی کے وقت طریق کو بالکل ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں اور بعض وہ ہیں جو اپنی وضع بنانے کے لئے طریق پر غلو کے ساتھ جمے رہتے ہیں، لیکن مقصود کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، کیونکہ ان کی نیت اس وقت معمولات کی پابندی سے امتثالِ
۱۲ امر اور طلبِ رضاء حق نہیں، بلکہ محض اپنی وضع کو قائم رکھنا ہے اور یہ طریق ایسا نہیں جو بلا قصد کے بھی موصل ہوسکے، یہاں تو ہر وقت ارادہ امتثالِ امر کی ضرورت ہے، جس عمل میں امتثالِ امر کی نیت نہ ہوگی وہ عمل موصل نہ ہوگا، پس جہاں شریعت تھوڑی دیر کے لئے ترکِ معمولات کا امر کرتی ہو وہاں بھی معمولات پر جما رہنا یہ پابندیٔ طریق محض صوری ہے جس میں مقصود کا پتہ بھی نہیں۔ پس میں نے جو پہلے بیان میں مصائب کے وقت پابندیٔ اعمال کی ضرورت کو ظاہر کیا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک شریعت ترکِ معمولات کا امر نہ کرے اس وقت تک تو معمولات کو ترک نہ کرے اور جس وقت جتنی دیر تک ترکِ معمولات کا امر کرے اس وقت اتنی دیر تک معمول کو ترک کردے، اور اس حالت میں معمول کو ترک کر دینا بھی پابندیٔ طریق میں داخل ہے۔ کیونکہ اس وقت اس میں امتثالِ امر ہے، اور پابندیٔ طریق امتثالِ امر ونہی کا نام ہے۔ مثلاً سفر میں قصر کا امر ہے وہاں اتمام کرنا گو ظاہر میں پابندیٔ طریق مگر حقیقت میں پابندی نہیں کیونکہ خلافِ امر ہے، خلاصہ یہ کہ پابندیٔ طریق کی حقیقت مامور بہ کو بجالانا ہے اور یہی ما علیہ الصبر ہے۔

باقی یہ بات کہ کہاں ترکِ معمول ماموربہ ہے کہاں نہیں، اور جہاں ترکِ معمول کا امر ہے وہ کتنی دیر کے لئے ہے علمِ شریعت اور محققین کی صحبت سے معلوم ہو سکتی ہے، کیونکہ شریعت ترکِ معمولات کا امر کسی ضرورت شدیدہ ہی سے کرتی ہے، اور قاعدہ ہے کہ اَلضَّرُوْرِیُّ یَتَقَدَّرُ بِقَدْرِ الضَّرُوْرَۃِ (ضروری کام ضرورت کے وقت سے پہلے بھی کرلیا جاتا ہی) اِس لئے ضرورت سے زیادہ معمول کو ترک کرنا صبر کے خلاف ہوگا اور اس وقت یہ ترک ماعلیہ الصبر میں داخل نہ ہوگا، خوب سمجھ لو، لیکن یہاں بعض ناواقفوں کو ایک دھوکہ ہوتا ہے میں اسکو بھی رفع کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ اہلِ علم کو معلوم ہے کہ اعمال تین قسم کے ہیں، ایک وہ جو دین میں نافع ہیں ان کا تو کرنا ماموربہ ہے خواہ وہ درجۂ فرضیت و وجوب میں ہو یا درجۂ سنت واستحباب میں، اور بعض وہ ہیں جو دین میں مضر ہیں ان کا ترک ماموربہ ہے خواہ درجۂ حرمت میں ہو یا کراہت میں، اور بعض وہ ہیں کہ جن کے فعل یا ترک کا امر نہیں، وہ مباحات ہیں، پہلی دو قسموں کا ماعلیہ الصبر میں داخل ہونا تو ظاہر ہی کیونکہ وہ ماموربہ ہیں، خواہ فعلاً ہو یا ترکاً لیکن مباحات کو اکثر ماموربہ سے خارج سمجھتے ہیں ۱۴
ہیں کیونکہ ظاہر میں وہ ماموربہ فعلاً یا ترکاً نہیں ہیں، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری قسم بھی پہلی ہی دو قسموں میں داخل ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ اپنے اثر کے لحاظ سے مباحات دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ دین کے لئے نافع ہیں، جیسے بغرضِ حفظِ صحت چلنا پھرنا ورزش کرنا، یا نافع نہیں۔ اگر دین میں نافع ہے تو وہ فعلاً ماموربہ ہے گو درجۂ وجوب میں نہ ہو، مگر جب مباح نافع فی الدین کو اچھی نیت کیا جائے تو وہ مستحب ضرور

ع۵ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ضرورت کے وقت اگر ایک معمول نہ ہو سکے مثلاً سفر میں تہجد واشراق کی پابندی نہ ہو سکے تو ان اعمال کے وقت ذکر اللہ ہو سکتا ہی لہٰذا اس وقت کو ذکر سے خالی نہ چھوڑے خواہ تلاوتِ قرآن کرلے یا ذکر لسانی جہر یا اخفاء کے ساتھ کرے غرض اس وقت کو یادِ خدا سے خالی نہ جانے دے تاکہ دل کو اس وقت خاص میں معمول کا خیال رہے یہ بھی پابندی کا قائم مقام ہی فقہاء نے لکھا ہی کہ حائضہ کو نماز کے وقت میں وضو کرکے مصلّے پر بیٹھ کر کچھ دیر سبحان اللہ والحمد للہ کی تسبیحیں پڑھ لینا چاہئے تاکہ نماز کی عادت باقی رہے۔ فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہی، لہٰذا یہ غلطی ہے کہ سفر یا مرض میں اوقاتِ عبادت کو سہل ذکر میں بھی مشغول نہ کیا جائے ۱۲ جامع

ہو جاتا ہے اور اس میں ثواب بھی ملتا ہے، یا وہ دین میں نافع نہیں تو فضول ہے اور فضولیات کا ترک کر دینا مامور بہ شرعاً ہے، چنانچہ حدیث میں ہے مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ اسلام کی خوبی اور کمال یہ ہے کہ مالایعنی کو ترک کر دیا جائے، جب فضولیات کے ترک کو حُسنِ اسلام میں دخل ہے اور حُسنِ اسلام مامور بہ اور مطلوب ہے، تو ان فضولیات کا ترک بھی مامور بہ ہو گیا گو ان کو حرام نہ کہا جائے مگر فضولیات میں اشتغال کراہت سے خالی نہیں، پس مباحات کا مامور بہ سے خارج ہونا اس لحاظ سے ہے کہ اس کی ذات مِنْ حَیْثُ ہِیَ ذات دین کے لئے نافع یا مضر نہیں لیکن اثر کے لحاظ سے مباح یا نافع ہے یا فضول ہے اور فضول کا حسن اسلام کے لئے مضر ہونا حدیث سے معلوم ہو چکا ہے تو یوں کہنا چاہئے کہ مباح بھی یا نافع ہے یا مضر تو مآل کے اعتبار سے وہ بھی مامور بہ میں داخل ہے جس کے بعض افراد فعلاً مامور بہ ہوتے ہیں، اور بعض ترکاً، لہذا یہ بھی ماعلیہ الصبر سے خارج نہیں، تو ہم کو مصائب میں جس طرح حرام اور مکروہ سے بچنا ضروری ہے اسی طرح فضولیات سے بچنا بھی ضروری ہے۔ لوگوں کو فضولیات سے بچنے کا بہت ہی کم اہتمام ہے، اسی لئے مصائب کے وقت بیکار تذکروں میں وقت گذارتے ہیں اور اس کو صبر کے خلاف نہیں سمجھتے، حالانکہ جب صبر کی حقیقت امتثالِ امر ہے تو فضولیات میں مشغول ہونا خلافِ صبر کیوں نہ ہوگا، جب کہ شارع علیہ السلام ترک مالایعنی کا امر ترغیب کے صیغہ سے فرما رہے ہیں، اہل اللہ کو اس کا اس قدر اہتمام ہوتا ہے کہ ایک بزرگ ایک فضول بات زبان سے نکلنے پر تیس برس تک روئے تھے، مگر بعض لوگ اس میں بھی غلو کرتے ہیں کہ جب وہ فضولیات سے بچنے کا اہتمام کرتے ہیں تو خشک بنکر بیٹھ جاتے ہیں، کوئی انکے پاس آئے تو مزاج پرسی کو بھی فضول سمجھتے ہیں، اور جو دوسرا ان کی مزاج پرسی کرے تو ناک منہ چڑھاتے ہیں، اور جب وہ کسی کامل کو ہنستے دوڑتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ کیسا کامل ہے جو فضول افعال میں مبتلا ہے دوڑتا بھی ہنستا بھی ہے اس غلطی کا منشا یہ ہے کہ ان لوگوں نے بعض مباحات کی ذات کو فضول قرار دے لیا ہے ان کے نزدیک دوڑنا، ہنسنا دیر تک کسی سے باتیں کرنا مطلقاً فضول ہے، حالانکہ کوئی

مباح اپنی ذات سے فضول نہیں بلکہ مباح کا نافع یا فضول ہونا اکثر کے تابع ہے جس مباح پر کوئی نفع دینی مرتب نہ ہو اور نہ اس میں نفع دینی کا قصد ہو وہ فضول ہے، اور جس پر نفع مرتب ہو یا اس میں کسی دینی نفع کا قصد ہو وہ فضول نہیں، بلکہ نافع ہے اور مامور بہ کی فرد ہو، پس ناقص کا کامل کے دوڑنے ہنسنے اور بہت باتیں کرنے پر اعتراض کرنا اس کے فہم کا قصور ہے، کامل محض نفس کے لئے یہ کام نہیں کرتا بلکہ وہ ان افعال میں دینی نفع کا قصد کرتا ہے، اس لئے اس کے حق میں یہ افعال فضول نہیں۔ خبر بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہے صحابہؓ سے مزاح فرمایا کرتے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کی ہے، تو کیا تمہارے نزدیک معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ کام فضول کئے ہیں! معلوم ہوا کہ کوئی مباح اپنی ذات سے فضول نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ جن کاموں کو تم فضول سمجھتے ہو ان میں بھی کوئی دینی حکمت ہو، چنانچہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں ایک حکمت مناسب نبوت تھی، وہ یہ کہ
۱۶ آپ کا جلال خداداد بہت بڑھا ہوا تھا جو صحابہ کو آپ کے سامنے دل کھول کر بات کرنے سے مانع تھا، اس لئے آپ نے اُن کو اپنے سے بے تکلف کرنے کے لئے مزاح شروع فرمایا، کیونکہ افادہ واستفادہ کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ طرفین کے دل کھلے ہوئے ہوں کسی کو انقباض نہ ہو، انقباض مانع فیض ہوتا ہے خواہ طالب کی طرف سے ہو یا مربی کی طرف سے ہو، اسی طرح ہر کامل کے ہنسی اور مزاح میں اس کے مناسب حال کوئی حکمت ضرور ہوتی ہے جس پر ناقص کی نظر نہیں پہنچتی، اس لئے وہ اعتراض کرتا ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے جو حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ کی ہے اس میں یہ حکمت تھی کہ آپ نے امت کو تعلیم دی ہے کہ اگر زیادہ عمر والا کمسن لڑکی سے شادی کرے تو اس کو یہ نہ چاہئے کہ اپنی طرح اس بچی کو بھی دانا بنا کر رکھے، بلکہ اس کے جذبات کی بھی رعایت کرے، بچیوں کی طبیعت کھیل کود کو چاہا کرتی ہے تو اس کو اس کا موقع دینا چاہئے اور اگر وہ شوہر کے لحاظ وادب سے کھیل کود میں شرم کرتی ہو تو اس کو صرف قولاً ہی نہیں بلکہ عملاً اجازت دینی چاہئے، اسی لئے آپ خود حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑے ہیں

اور بعض دفعہ آپؐ نے ان کو حبشی بچوں کا کھیل بھی دکھلایا جو مسجد کے فناء میں نیزوں سے کھیل رہے تھے ان کو گڑیوں سے کھیلنے کی بھی اجازت دی اور کبھی ایسا ہوتا کہ محلہ کی لڑکیاں حضور صلے اللہ علیہ وسلم کو گھر میں تشریف لاتے دیکھکر گڑیوں کے کھیل سے متفرق ہوجاتیں تو آپؐ ان کو جمع کرکے لاتے کہ میں کچھ نہیں کہتا تم اطمینان سے کھیلو، ان سب امور میں امت کو تعلیم دیگئی ہے کہ بوڑھا مرد کمسن لڑکی سے شادی کرکے اس کے ساتھ کیونکر معاشرت کرے، پس چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان افعال کو حسن معاشرت میں دخل ہے جو شرعاً مطلوب ہے. نیز امت کو بھی حسن معاشرت کی تعلیم ہے اس لئے یہ فضول نہیں ہیں مگر ناقصین کی نظر چونکہ صورت ہی پر پہنچتی ہے حکمت تک نہیں پہنچتی اس لئے وہ کامل پر اعتراض کردیتے ہیں اسی لئے کفار کہتے تھے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ۃ یہ کیسے رسول ہیں جو ہماری طرح کھاتے پیتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں انبیاء نے ایسے اعتراضوں کا یہ جواب دیا اِنْ نَّحْنُ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَمُنُّ
عَلٰی مَنْ يَّشَاءُ بیشک ہم تم جیسے ہی بشر ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جس پر چاہتے ہیں احسان 17
فرمادیتے ہیں. بس ہم میں اور تم میں اتنا فرق ہے کہ ہم پر خدا تعالیٰ کا خاص احسان ہے اور تم پر وہ احسان نہیں" غرض صورت میں کامل اور غیر کامل یکساں معلوم ہوتا ہے کامل کو مَنِّ الٰہی سے امتیاز ہوتا ہے اور مَنِّ خداوندی کی اطلاع کسی کو نہیں ہوسکتی بجز اس کے جس کے آنکھیں ہوں اس لئے کامل کا پہچاننا بڑا مشکل ہے مولانا فرماتے ہیں ؎

در نیابد حالِ پختہ ہیچ خام ۔ پس سخن کوتاہ باید والسلام

"ناقص کامل کی حالت کو نہیں سمجھ سکتا، پس کلام کوتاہ کرنا چاہئے"

یہ بڑی غلطی ہے کہ ناقص کامل کو اپنے اوپر قیاس کرنے لگے اور ان کو زیادہ باتیں کرتے ہوئے دیکھکر یہ سمجھنے لگے کہ وہ بھی اس کی طرح لایعنی میں مشغول ہیں، کیونکہ کاملین کو حق تعالیٰ ایک ایسا ذوق عطا فرمادیتے ہیں جس سے باتیں کرتے کرتے ان کو معلوم ہوجاتا ہے کہ اب خاموشی کی حد آگئی ہے اُس وقت وہ فوراً خاموش ہوجاتے ہیں، اور ناقص کو یہ ذوق حاصل نہیں وہ اگر زیادہ باتیں بنائے گا تو ضرور لایعنی میں مبتلا ہوگا اس لئے اس کو زیادہ باتیں

کرنا مضر ہے اور کامل کو مضر نہیں، کاملین کی باتیں بھی ذکر ہی ہوتی ہیں، اور جس کی کھلی دلیل یہ ہے کہ ان کی باتوں سے خواہ وہ دین کے متعلق ہوں یا دنیا کے اہل مجلس پر ذکر اللہ کا اثر غالب ہوتا ہے، اور جتنی دیر تک بھی کوئی ان کے پاس بیٹھا باتیں سنتا رہے حق تعالےٰ ہی کی طرف متوجہ رہیگا، اور ناقص کی باتوں میں یہ اثر نہیں ہوتا ۱۲

ایک دفعہ مولانا فتح محمد صاحب کو حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ کی خدمت میں زیادہ دیر لگ گئی، اور اٹھتے وقت بطور معذرت کے حضرت سے عرض کیا کہ آج حضرت کا بہت حرج ہوا کیونکہ یہ وقت عبادت کا تھا۔ فرمایا کہ میاں کیا تسبیح چلانا ہی عبادت ہے، دوستوں سے باتیں کرنا بھی تو عبادت ہے (کیونکہ اس میں تطییبِ قلبِ مسلم ہے ۱۲)

اور ایک بار میرا نام لے کر فرمایا کہ میاں اشرف علی جب ہم مجلس میں باتیں کرتے ہوں اس وقت بھی تم ہمارے باطن کی طرف متوجہ رہا کرو، یہ مت سمجھنا کہ اس وقت تو باتوں میں مشغول ہیں اس لئے باطن سے فیض نہ ہوگا، بھائی ہمارا باطن اس وقت بھی ذکر ہی میں مشغول ہوتا ہے تو بات کیا ہے، اس کا راز یہی ہے کہ کامل باتیں بھی عبادت ہی کی نیت سے کرتا ہے اس کا باطن اس وقت بھی مشغول بحق ہوتا ہے، اسی لئے اس کو معلوم ہوتا رہتا ہے کہ اب خاموشی کا وقت ہے اور اس وقت بولنے کی ضرورت ہے، اس وقت مزاح کی ضرورت ہے تو اس کا کوئی قول وفعل عبادت وذکر سے خالی نہیں ہوتا، اس لئے کامل کو ہنسی، مزاح اور زیادہ باتوں میں مشغول دیکھکر اپنے اوپر قیاس کرکے اس پر اعتراض نہ کرنا چاہئے، جن باتوں کو تم فضول سمجھتے ہو وہ کسی حکمت یا ضرورت کی وجہ سے ان میں مشغول ہوتا ہے، صوفیہ نے اس کو خوب سمجھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خلوتِ طویلہ سے طبیعت گھبرا جائے تو چند روز کے لئے خلوت کو چھوڑ کر لوگوں سے ملنا ملانا اور دوستوں سے باتیں کرنا اور ہنسی مزاح کرنا چاہیئے، یا کچھ دنوں کے لئے سفر کرکے کسی شہر میں سیر و تفریح کے لئے چلا جانا چاہیئے، بلکہ امام غزالیؒ نے تو اس حالت میں ان امور کے اختیار کرنے کو واجب لکھا ہے، جس کی وجہ سے انپر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا، کہ انھوں نے مباحات بلکہ بظاہر فضولیات کو واجب کہدیا

مگر امام کی رائے صحیح ہے، کیونکہ قاعدہ فقہیہ ہے مُقَدِّمَۃُ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ کہ واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے اور جب طبیعت اعمالِ طاعات سے گھبرانے لگے تو اسکو طاعات کی طرف مائل کرنا واجب ہے ورنہ یہ حالت بڑھتے بڑھتے تعطل کی طرف مفضی ہو جائے گی، اور جب کثرتِ اعمال سے طبیعت اُکتا جائے تو اس صورت میں انشراح وانبساط کے لئے اختلاط وسیر وتفریح ومزاح بھی مفید ہوتا ہے، اس راز کو محقق ہی سمجھ سکتا ہے، غیر محقق تو ایسے موقع میں یہ بتلائے گا کہ یَا بَاسِطُ کا وظیفہ پڑھو، یَا فَتَّاحُ کا ورد کرو، مگر محقق اس کی رائے پر ہنستا ہے اور کہتا ہے ؎

بے خبر بودند از حالِ دروں ۔ استعیذ اللہ مما یفترون

جن طبیبوں نے علاج کیا ان کو اندرونی بیماری کا پتہ نہ چلا، پناہ مانگتا ہوں اطباء کے اس افترا اور بہتان کی۔

اس جگہ مولانا نے طبیبِ الٰہی کا قول نقل فرمایا ہے کہ اس نے دوسرے اطباء کی رائے سُنکر یہ کہا ہے ؎

19 گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ۔ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

اطباء نے مرض پہچانا نہیں، علاج مرض کے خلاف ہونے سے بیماری اور بڑھ گئی۔

سو غیر محقق تو اس موقع پر ایک وظیفہ اور بڑھا دیتا ہے، یہ نہیں دیکھتا کہ وظیفوں ہی سے تو یہ حالت پیدا ہوئی، مگر وہ اُلٹا اور وظیفہ ہی بڑھاتا چلا جاتا ہے تو اس سے مرض کم ہوگا یا بڑھے گا، ظاہر ہے کہ جب سبب مرض میں اضافہ ہوگا تو مرض کی بھی ترقی ہوگی، محقق اس وقت علاج بالضد کرتا ہے، وظیفوں سے قبض ہوا ہو تو وہ ترکِ وظائف کی تعلیم کرتا ہے، خلوت سے انقباض ہو تو وہ ترکِ خلوت کا امر کرتا ہے، اور اس سے بہت جلد حالت میں افاقہ ہو جاتا ہے۔ میرے ایک دوست تھے مولوی صادق الیقین صاحب مرحوم، وہ بیعت تو حضرت حاجی صاحبؒ سے تھے، اور اجازت یافتہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے تھے، مجھ سے بھی ان کو محبت وعقیدت کا تعلق تھا، ایک دفعہ ان پر قبض شدید طاری ہوا، تو مجھے اطلاع کی، کیونکہ میں اس وقت ان کے وطن سے قریب کانپور میں تھا، میں نے لکھا کہ آپ کچھ دنوں کو ذکر وشغل اور

خلوت بالکل ترک کر دیجئے اور لکھنؤ جا کر چوک وغیرہ میں سیر و تفریح کیجئے۔ اول تو ان کو اس جواب سے بڑی وحشت ہوئی، مگر انھوں نے اس پر عمل کیا۔ اس طریق میں انقیاد و اتباع کی بہت ضرورت ہے خود رائی اس طریق میں سدِّ راہ ہے، چنانچہ انھوں نے انقیاد سے کام لے کر فوراً عمل کیا دو ہی تین دن میں سارا قبض جاتا رہا، اور شدت سے بسط طاری ہوا اب ایسا شخص اگر ہنسی مزاح میں مشغول ہو گا تو ظاہر ہے کہ وہ علاجاً ایسا کر رہا ہے اور ضرورت کی وجہ سے ان کو اختیار کر رہا ہے مگر ظاہر بین کو کیا خبر وہ تو صرف یہ دیکھ کر کہ یہ شخص زاہد و عابد ہو کر شیخ و صوفی ہو کر ہنسی مذاق کر رہا ہے اس کو یہ کیا معلوم ہے کہ اس وقت اس کا ہنسنا اور مزاح کرنا ہی عبادت ہے کیونکہ مقدمہ واجب ہے،

غرض جن امورِ مباحہ کو فضول کہا جاتا ہے وہ اسی وقت تک فضول ہیں جب ان سے دین میں کوئی نفع نہ ہو، اور اگر کوئی مباح دین میں نافع ہو تو وہ فضول نہیں، اس لئے بے ضرورت مباحات میں مشغول ہونا بھی بُرا اور ضرورت کے وقت مشغول نہ ہونا بھی بُرا ہے۔ پس ثابت ہو گیا کہ مباحات بھی اپنے اثر کے اعتبار سے مامور بہ میں داخل ہیں ۲۰
بحمد اللہ اس تقریر سے **مَا عَلَيْهِ الصَّبْرِ** کی تعیین بخوبی ہو گئی، اور صبر کی حقیقت بھی اچھی طرح واضح ہو گئی، شبہات کا ازالہ بھی ہو گیا،

خلاصہ یہ ہے کہ ناگوار واقعات کے وقت دو چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں ایک یہ کہ جو طریق حق تعالیٰ کی طرف پہونچنے کے لئے اختیار کیا گیا ہے اس میں تو خلل نہیں آیا، خواہ وہ واجبات ہوں یا مستحبات، کیونکہ مستحبات کی پابندی بھی خواص کے لئے ایک درجہ میں ضروری ہے۔ حدیث میں ہے أَحَبُّ الْأَعْمَالِ إِلَى اللّٰهِ أَدْوَمُهَا، کہ حق تعالیٰ کی طرف سب اعمال میں زیادہ محبوب وہ ہیں جن پر دوام کامل ہو، اس میں لفظ أَحَبُّ عاشق کی نظر میں دوام کی ضرورت کو بتلا رہا ہے، کیونکہ جب ایک چیز حق تعالیٰ کو محبوب ہے تو عاشق کو ان کے سامنے محبوب ہی چیزیں پیش کرنا چاہئے۔ لفظ أَحَبُّ سے دوام کی عدمِ ضرورت پر وہی استدلال کرے گا جس میں محبت و عشق نہ ہو ورنہ عاشق تو یہ سن کر کہ محبوب فلاں چیز سے خوش ہوتا ہے اس پر جان نثار کر دے گا،

اور جب تک محبوب ہی اس سے منع نہ کرے اس وقت تک اس کو اپنے ذمہ لازم کرلیگا، میں پوچھتا ہوں کہ آخر عبادت اور عمل سے مقصود کیا ہے، ظاہر ہے کہ رضائے حق مطلوب ہے، تو عامل کو ضروری ہے کہ عمل اس طرح کرے اور اس میں وہ طریق اختیار کرے جس سے محبوب خوش ہوتا ہو، اور حدیث سے معلوم ہو چکا کہ حق تعالیٰ دوام سے خوش ہوتے ہیں، تو دوام کا اہتمام ضروری ہوا، اور دوسری حدیث میں تو اس کی تصریح ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں یَا عَبْدَ اللّٰہِ لَا تَکُنْ مِثْلَ فُلَانٍ کَانَ یَقُوْمُ مِنَ اللَّیْلِ ثُمَّ تَرَکَ۔ اے عبد اللہ (بن عمر) تم فلاں شخص کی طرح نہ ہو جانا جو رات کو اٹھا کرتا تھا پھر قیام لیل ترک کر دیا، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک معمول مستحب کے ترک پر صراحۃً کراہت کا اظہار فرمایا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ مستحب کو معمول بنا کر بلا عذر ترک کر دینا ایک گونہ مکروہ ہے تو دوام ضروری ہوا، اسی لئے میں کہا کرتا ہوں کہ عمل تھوڑا سا اختیار کرو جس پر نباہ ہو سکے، اور کسی وقت زیادہ کا شوق ہو تو میں کہتا ہوں کہ اس وقت زیادہ کرلو، مگر اپنے ذمہ زائد کو لازم نہ کرو، معمول اسی مقدار کو سمجھو ۲۱
جس پر نباہ کر سکتے ہو، اور اسی کی پابندی کو لازم سمجھو، کبھی نشاط و سرور ہو تو زیادہ بھی کرلو مگر اس کی پابندی کو لازم نہ سمجھو، اس صورت میں اگر کبھی زیادہ نہ ہو سکا تو قلیل کو ادا کرکے تسلی ہو جائے گی کہ ہاں معمول پورا ہو گیا، کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ بغیر معمول پورا کئے تسلی نہیں ہوتی، (اور یہی حکمت ہے صوفیہ کے اس فعل کی کہ وہ طالبین کے لئے ذکر کی کوئی مقدار معین کر دیتے ہیں، حالانکہ ذکر ایسی چیز ہے کہ اس کے کوئی مقدار معین نہ ہونا چاہئے، جتنا بھی زیادہ ہو اچھا ہے، مگر بغیر تعیین مقدار کے ذاکر کی تسلی نہیں ہو سکتی وہ ہر دن اسی فکر میں رہیگا کہ نہ معلوم جتنا ذکر میں کر رہا ہوں یہ وصول الی المطلوب کے لئے کافی بھی ہے یا نہیں، اور جب شیخ نے ایک مقدار معین کر دی اب اس کو پورا کرکے تسلی ہو جاتی ہے ۱۲) اور اس طریق میں تسلی قلب و جمعیتِ خاطر کی رعایت بہت ضروری ہے اس لئے اپنے ذمہ عمل اتنا ہی لازم سمجھو جس کو نباہ سکو، زیادہ کو معمول نہ بناؤ تاکہ روزانہ قلب کو تسلی حاصل ہوتی رہے کہ کام پورا ہو گیا، اہل اللہ کو جمعیتِ قلب کا

بہت زیادہ اہتمام ہوتا ہے، کیونکہ اس طریق کا مدار اسی پر ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ نے اسی لئے حق تعالیٰ سے عرض کیا تھا کہ میرا عمر بھر کا رزق ایک دم سے دیدیا جائے، ارشاد ہوا کیا ہمارے اوپر اعتماد نہیں، عرض کیا اعتماد تو ہے مگر شیطان روز آکر مجھے پریشان کرتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا، میں جواب دیتا ہوں کہ اللہ دے گا وہ کہتا ہے کہ اللہ تو دے گا مگر یہ تو وعدہ نہیں کہ کب دے گا، ممکن ہے کہ تین چار روز بھوکا رکھکر دیں، پس یہاں آکر میں خاموش ہو جاتا ہوں، اگر آپ مجھے عمر بھر کا رزق ایک دم سے دیدیں تو میں اس کو اپنے گھر میں بھر کر قفل لگا دوں، اور جب شیطان کہے گا کہ کل کو کہاں سے کھاوے گا تو میں کہہ دوں گا کہ دیکھ اس کوٹھری میں سے کھاؤں گا۔ ان بزرگ نے جمع وطمع کے ذریعہ سے (مگر طمع من اللہ) جمعیتِ قلب کو حاصل کرنا چاہا، اور بعضے قناعت و توکل کے ذریعہ سے اس کو طلب کرتے ہیں، بہر حال کامل کا مطلوب رضا، وجمعیتِ قلب مع اللہ ہے خواہ طمع سے حاصل ہو یا توکل سے، جس میں خدا تعالیٰ نے طمع ہی کا مادہ رکھا ہے وہ توکل اور قناعت کو کیونکر اختیار کرے، وہ تو طمع ہی ظاہر کر کے جمعیت کا طالب ہوگا، اسی کو فرماتے ہیں ؎ ۲۲

چوں طمع خواہد زمن سلطانِ دیں ؎ خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

جب دین کا بادشاہ مجھ سے طمع کا اظہار کرے، تو پھر ایسی قناعت پر خاک پڑے۔

لیکن وہ مخلوق سے طمع ظاہر نہ کرے گا بلکہ محبوب سے ظاہر کرے گا، اسی طرح جس کو خدا تعالیٰ نے راحت کا عادی بنایا ہے وہ راحت ہی کے ذریعہ سے جمعیت طلب کرے گا، اچھے کپڑے پہنے گا، اچھا کھانا کھاوے گا، اور جب تک حق تعالیٰ ہی مشقت نہ بھیجیں اس وقت تک وہ اپنے اختیار سے طریقِ مشقت کو کبھی اختیار نہ کرے گا، اور جب حق تعالیٰ ہی اس کو مشقت میں ڈالتے ہیں تو اس میں دوسروں سے زیادہ رضا و تحمل ظاہر ہوتا ہے اور یوں کہتا ہے ؎

ناخوش تو خوش بود بر جانِ من ؎ دل فدائے یار دل رنجانِ من

تیرا رنجیدہ کرنا مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے، دل فدا ہو ایسے یار پر جو میرے دل کو رنجیدہ کرنے والا ہے۔

اور یوں کہتا ہے ؎

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت ٭ سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

دشمن کا ایسا نصیب نہ ہو کہ آپکی تیغ کا کشتہ بنے ، دوستوں کا سر ہی سلامت رہے کہ اس پر آپ کا خنجر چلے۔

اس کا مذاق تفویض کلی ہوتا ہے، حق تعالیٰ جس حال میں رکھتے ہیں اسی میں خوش رہتا ہے۔ بعض لوگ یہاں آئے اور کہنے لگے کہ یہاں تو فقیری معلوم نہیں ہوتی، اچھے کپڑے پہنتے ہیں، اچھا کھانا کھاتے ہیں، میں نے کہا جاؤ کسی لنگوٹ بند کے یہاں، بلکہ کسی ننگ دھڑنگ کے یہاں جس نے لنگوٹہ بھی اُتار پھینکا ہو، آجکل بہت لوگ اسی مذاق کے ہیں کہ ننگ دھڑنگ آدمی کے جلدی معتقد ہو جاتے ہیں، اور وہ انھیں گالیاں بھی دے تو راضی رہتے ہیں، بلکہ اگر کفریات بھی بکے جب بھی معتقد رہتے ہیں، حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب قدس اللہ سرہٗ کہیں چلے جاتے تھے، راستہ میں
۲۳ ایک مجمع دیکھا، معلوم ہوا کہ بیچ میں ایک ننگ دھڑنگ آدمی بیٹھا ہوا کمبخت کفریات بک رہا ہے، نالائق اپنے عضو کو ہلا ہلا کر کہتا ہے کہ توبہ توبہ یہ تو اللہ کا الف ہے۔ (نقل کفر کفر نباشد) اور بہت لوگ اس کے معتقد ہو رہے ہیں، شاہ صاحبؒ نے اپنے ایک ہمراہی شاگرد سے فرمایا کہ اس شخص کی کمر میں ایک لات مارو اور یہ کہو کہ نامعقول بے پیرا معلوم ہوتا ہے بھلا کہیں الف کے نیچے دو نقطے بھی ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب جامع فنون تھے، ننگوں کا جواب انہی کے مذاق میں دیا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور سارے معتقدین فَنَبرُدًا (جدا جدا) ہو گئے۔ اس طرح فتنہ فرو ہوا، اور یہ مذاق کچھ آج سے نہیں، پرانا مذاق ہے، لوگ ہمیشہ سے ایسے شخص کے کم معتقد ہوتے ہیں جو آدمیوں کی شکل میں ہو، عقل و تہذیب سے آراستہ ہو۔ چنانچہ کفار کو انبیاء پر یہی اعتراض تھا کہ یہ تو ہمارے جیسے آدمی ہیں، وہ بھی یہ چاہتے تھے کہ نبی آدمی نہ ہونا چاہئے۔ یہی مذاق آجکل ہے کہ آدمیت کو کمال کے منافی سمجھتے ہیں، چنانچہ جتنا کوئی آدمیت سے گذرا ہوا ہو اس کے جلدی معتقد ہو جاتے ہیں۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ مصیبت کے وقت معمولات میں کمی نہ کرو، اور طریق وصول کی طرف متوجہ رہو، ورنہ یاد رکھو اگر تم طلب میں کمی کردو گے تو اُدھر سے بھی عطاء میں کمی ہو جائے گی، حق تعالیٰ اس وقت تک اپنا برتاؤ بندہ کے ساتھ نہیں بدلتے، جب تک وہ خود اپنے برتاؤ کو نہ بدلے، إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ جب اِدھر سے برتاؤ بدلتا ہے تو اُدھر سے بھی معاملہ بدل جاتا ہے، صوفیہ کا ارشاد ہے مَنْ لَا وِرْدَ لَهٗ لَا وَارِدَ لَهٗ جس کا کچھ ورد نہ ہو اس پر وارد بھی نہیں ہوتا، اور اس طریق میں وارد بڑی نعمت ہے، جس سے جزئیات میں ہر دم الہام ہوتا رہے کہ اب یہ کرنا چاہیے، اس وقت بولنا چاہیے، اس وقت خاموش رہنا چاہیے۔ اس طریق کے علوم کتابی نہیں ہیں، جو کتاب سے جزئیات کے احکام معلوم ہوتے رہیں، یہاں تو ہر جزئی کے لئے الہام کی ضرورت ہے، چنانچہ کامل کو ہر وقت الہام پر الہام ہوتا رہتا ہے، اور یہ حالت وِرد کی پابندی ہی سے حاصل ہوتی ہے، بدون وِرد
۲۴ کے وارد نہیں ہو سکتا، دوسرے یہ تو نادانی کی بھی بات ہے کہ ایک نقصان تو غیر اختیاری ہوا تھا، یعنی مصیبت تکوینیہ دوسرا ضرر اپنے اختیار سے مول لیا جائے یعنی ترکِ معمولات، دنیا دار بھی ایسا نہیں کرتے، ان کا بھی یہ قاعدہ ہے کہ ایک مد میں نقصان ہوتا ہے تو وہ دوسری مد میں ترقی کی فکر کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے زمانۂ جاہلیت کے ایک حلیم کی حکایت بیان فرمائی تھی کہ اس کے بھتیجے نے اس کے بیٹے کو قتل کر دیا، لوگ قاتل کو پکڑ کر اس کے پاس لے گئے تو غایت حلم یہ تھا کہ اس نے اپنی نشست بھی نہیں بدلی جس طرح بیٹھا تھا اسی طرح بیٹھا رہا، اور یہ کہا اِحْدٰى يَدَيَّ قَطَعَتِ الْأُخْرٰى میرے ایک ہاتھ نے دوسرے ہاتھ کو کاٹ دیا ہے، اب یہ حماقت ہے کہ میں دوسرے ہاتھ کو بھی کاٹ دوں، ثُمَّ قَالَ وَلٰكِنْ أَدُّوْا إِلٰى امْرَأَتِيْ دِيَةَ ابْنِهَا مِنْ إِبِلِيْ فَإِنَّهَا لَا تَرْضٰى بِدُوْنِهَا۔ پھر کہا لیکن میری بیوی کو میرے اونٹوں میں سے اس کے بیٹے کی دِیت دیدو، کیونکہ وہ بدون دیت کے راضی نہ ہوگی۔"

دیکھئے یہ ایک کافر تھا جس نے ایک غیر اختیاری ضرر سے پریشان ہو کر اختیاری ضرر کو گوارا نہ کیا، تو کیا ہم کو مسلمان ہو کر ایسا نہ ہونا چاہئے! پس یہ بڑی حماقت ہے کہ ہم مصائب غیر اختیاریہ کی وجہ سے اپنے معمولات کو تباہ کر کے اختیاری ضرر میں مبتلا ہوں اس وقت اعمال پر جما رہنا یہی صبر ہے۔ ایک بات تو یہ قابل لحاظ ہے، دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ پابندیٔ طریق میں رضائے حق کا قصد کرو محض عادت کے طور پر پابندی نہ کرو۔ پس اگر کہیں ضرورت شدیدہ سے ترکِ معمول میں رضائے حق معلوم ہو تو وہاں ضرورت کے وقت تک معمول کو ترک کر دو لیکن ذکرِ خدا سے اس وقت کو بھی خالی نہ جانے دو، چاہے چلتے پھرتے ہی ہو یا آہستہ ہی ہو ۱۲ جامع) اور اس ضرورت کے ختم پر پھر پابندی شروع کر دو (ترکِ معمول سے جو بے برکتی ہوتی ہے وہ جب ہی ہے جب کہ ترک میں رضائے حق نہ ہو ورنہ رضائے حق کے ساتھ ہر حالت میں برکت ہی برکت ہے ۱۲) جب رضائے حق کا اہتمام ہوگا تو ہر حال میں وہی کام ہوگا جو امر کے موافق ہے، کسی حال میں مامور بہ ترک نہ ہوگا، اس سے قلب میں ایک حلاوت پیدا ہوگی، اور زبان و دل و گوش سب پابند ہو جائیں گے۔ جمعیت و سکون حاصل رہیگا، پریشانی کا نام بھی نہ رہے گا، اور جب امتثالِ امر میں خلل ہوتا ہے ۲۵
یا بلا وجہ معمولات ناغہ ہوتے ہیں تو خیالات میں تفرق ہو جاتا ہے اور خیالات کے تفرق سے رُوح بھی پریشان ہو جاتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

جاں ہمہ دم زیں لگدکوبِ خیال ۔ می شود مجروح و خستہ پائمال

انسان کا دل خیالات کی کش مکش سے ہر وقت زخمی اور بے حال و برباد رہا کرتا ہے۔

نے صفامی ماندش نے لطف و فر ۔ نے بسوئے آسماں راہِ سفر

نہ اس میں صفائی باقی رہتی ہے اور نہ زندگی کا لطف باقی رہتا ہے، نہ اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ باقی رہتا ہے۔

صاحبو! حق تعالیٰ نے ہر شخص کو آسمان کی طرف سفر کرنے کی قوت عطا فرمائی ہے، مگر تشتتِ اعمال سے ہم اس قوت کو خود ہی کمزور کر رہے ہیں، ذکر و طاعات د

امتثالِ امر کی پابندی اور التزام کرکے دیکھو انشاء اللہ خدا کے ساتھ دل لگا رہے گا اور چاروں طرف سے اطمینان نصیب ہوگا، اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوجاتا ہے) عارف کو مصائب میں بھی یہ اطمینان نصیب ہوتا ہے اور اس کا قلب چاروں طرف سے مطمئن ہوتا ہے، یہ تو دنیوی پریشانی کا حال تھا کہ اس کی وجہ سے اعمال و معمولات پر امتثالِ امر میں لوگ خلل ڈالتے ہیں۔

اب میں ایک باطنی پریشانی کا حال بتلانا چاہتا ہوں، جو بعض دفعہ پابندیٔ اعمال کے ساتھ پیش آتی ہے، وہ یہ کہ بعض لوگ اعمال و معمولات پر پابندی کرنا چاہتے ہیں مگر جب کام کرنے بیٹھتے ہیں فوراً شیطانی وساوس اور نفسانی خطرات آکر گھیر لیتے ہیں، اور بعض دفعہ ایسے واہیات کفریہ وسوسے آتے ہیں جن سے سالک پریشان ہوجاتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ میں طریق سے ہٹ گیا، اور خدا تعالیٰ کے یہاں سے مردود ہوگیا ہوں، اس حالت میں بہت لوگ کام کو چھوڑ بیٹھتے ہیں، کیونکہ یہ وسوسے
کام ہی کے وقت آتے ہیں، مگر یہ بڑی غلطی ہے، اس طرح تو تم نے شیطان کی مراد ۲۶
پوری کردی، وہ یہی تو چاہتا تھا، چنانچہ ایک صاحب نے اس حالت کی وجہ سے تلاوتِ قرآن بالکل چھوڑ دی تھی، کیونکہ جب وہ قرآن پڑھنے بیٹھتے ساتھ ہی ساتھ دل میں خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گالیوں کے خطرات آتے تھے، ایک تفسیر تو جلالین کی تھی ایک تفسیر وبالین کی خود بخود اُن کے ذہن میں آتی تھی، آخر وہ گھبرا گئے، اور تلاوت چھوڑ بیٹھے، مجھ سے یہ حال بیان کیا، میں نے کہا اس کا یہ علاج نہیں، اس کا یہ علاج ہے کہ خوب تلاوت کرو اور گالیاں ذہن میں آویں تو آنے دو یہ تو ویسا حال ہوگیا ہے

بحرِ تلخ و بحرِ شیریں ہمعناں ٭ درمیاں شاں برزخ لا یبغیاں

بحر تلخ اور بحر شیریں دونوں برابر برابر جاری ہیں مگر ان کے درمیان ایسا پردہ حائل ہے جس کی وجہ سے ایک دوسرے سے ملتے نہیں۔

کام کے ساتھ ان وساوس و خطرات سے کچھ بھی تنزل یا بُعد نہیں ہوتا، ہاں جب کام

چھوڑ دوگے تو بُعد کا اندیشہ ہے گو وساوس بھی نہ ہوں، اس لئے سالک کو طریق پر قائم ہو کر بے فکر رہنا چاہیئے، عارف فرماتے ہیں ؎

در طریقت ہر چہ پیشِ سالک آید خیر اوست ٭ بر صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

یعنی جب تک صراطِ مستقیم پر جما رہے، یعنی اعمالِ اختیاریہ میں خلل نہ ڈالے تو بیفکر رہے، اب اس کے بعد چاہے بلا اختیار کچھ ہی ہوتا رہے کفر کے وسوسے آویں، یا معصیت کے، سب بے ضرر ہیں، بلکہ بخدا صراطِ مستقیم پر رہ کر تمام ظلمتیں انوار ہیں جیسے نورِ عین کہ وہ منبع انوار ہیں مگر خود سیاہ ہے، اور صوفیہ نے فرمایا ہے کہ لطیفۂ اخفیٰ کا لون بھی سیاہ ہے، اور تجلی ذاتی اصطلاحی سیاہ رنگ میں بھی ظاہر ہوتی ہے پس اگر اعمالِ اختیاریہ میں خلل نہیں تو قلب میں کیسی ہی ظلمات ہوں وہ سب خیر و نور ہی ہیں چاہے وساوس کفریہ ہی کیوں نہ ہوں، لہٰذا اُن سے گھبرا کر کام میں ہرگز خلل نہ ڈالنا چاہیئے، اس طرح تو یہ قیامت تک کبھی پیچھا نہ چھوڑیں گے، اس کا علاج یہی ہے کہ کام میں لگا رہے اور اُن کی طرف التفات بھی نہ کرے۔ جب شیطان دیکھیگا ۲۷
کہ یہ تو خطرات سے گھبراتا ہی نہیں نہ کام میں کمی کرتا ہے تو وہ جھک مار کر خود ہی پیچھا چھوڑ دے گا۔ ایک دفعہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو وضو کے بعد شبہ ہو گیا کہ شاید خفین پر مسح نہیں کیا، حضرت نے دوبارہ پھر مسح کر لیا۔ بس دوبارہ مسح کرنا غضب ہو گیا، فرماتے تھے کہ پھر تو یہ حالت ہوئی کہ ہر دفعہ وضو کر کے جب نماز شروع کروں یہی وسوسہ آوے کہ مسح نہیں کیا، مہینہ بھر تک پریشان رہا، ایک مہینہ کے بعد جو مولانا مصلے پر نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہونے پھر وہی وسوسہ آیا، مولانا نے دوبارہ اعادۂ مسح نہیں کیا، اور نماز کی نیت باندھ لی، شیطان نے کہا کہ بے وضو نماز ہوگی، مولانا نے فرمایا کہ ہونے دے، تیری بلا سے، اس نے کہا بے وضو نماز پڑھ کر کافر ہو جاؤ گے، کیوں کہ تم عمداً ایسا کر رہے ہو، مولانا نے فرمایا کہ تیری بلا سے تو بڑا آدمیوں کو کافر ہونے سے بچانے والا نکلا ہے، اتنی دنیا کو تو کافر بنا رکھا ہے تجھے ان کی فکر نہ ہوئی، سب سے زیادہ میرے ہی کفر کی فکر ہوئی، جا، چاہے نماز ہو

یا نہ ہو، وضو سے ہو یا بے وضو ہو میں تو اب مسح کرتا نہیں، فرماتے تھے کہ بس اس دن کے بعد شیطان نے پھر یہ وسوسہ نہیں ڈالا، یہ بڑا ہوشیار ہے۔ بعض دفعہ خیر خواہ بنکر دھوکہ دیتا ہے، چنانچہ ایک بار حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو تہجد کی نماز کے لئے شیطان نے جگایا، پوچھا کون ہے؟ کہا میں ہوں ابلیس، فرمایا کیوں جگایا؟ کہا تہجد کا وقت ہے، نماز پڑھ لیجئے، فرمایا کہ تجھے اس سے کیا مطلب تو ایسا خیر خواہ کب سے بن گیا؟ کہا آخر کبھی تو میں بھی کام کرنے والا تھا ہی، وہ جوش آگیا، تو فرمایا کمبخت اس وقت تیرے اس جگانے میں بھی کوئی راز ہے، جب تک تو راز نہ بتلائیگا اس وقت تک محض تیرے کہنے سے پیچھا نہ چھوڑوں گا، کہا صاحب بات یہ ہے کہ میں نے کل آپ کا تہجد ناغہ کرا دیا تھا اور میں خوش ہوا تھا کہ آج ان کا نقصان کر دیا، مگر تم نے جو صبح اُٹھ کر تہجد کے فوت ہونے پر رنج وغم اور آہ وافسوس کیا اس سے تمہارے درجے اتنے بلند ہوگئے کہ تہجد سے بھی نہ ہوتے تو میں نے کہا اس سے تو
۲۸ ان کا تہجد پڑھنا ہی اچھا ہے، یہ تو ناغہ کر کے آرام سے نیند بھی لیتے ہیں اور درجہ بھی لیتے ہیں، تہجد میں کم از کم نیند تو خراب ہوگی، گو آخرت کا نقصان نہ ہوگا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ یہ راز سُن کر اٹھ بیٹھے اور تہجد کی نماز پڑھ لی، اس وقت اگر کوئی غالی صوفی ہوتا تو شاید تہجد پڑھتا ہی نا، اور یہ کہتا کہ اس وقت تہجد پڑھنے میں شیطان کی اطاعت ہے، حالانکہ اس کی تو مخالفت کرنا چاہئے، مگر اس کو بھی محقق ہی سمجھتا ہے کہ شیطان کی مخالفت کہاں کرنا چاہئے، اگر ہر بات میں مخالفت کی جائے اور شیطان دیکھ لے کہ اس کو میری مخالفت میں غلو ہے تو پھر وہ ہمیشہ نیک کاموں ہی کا امر کریگا، تاکہ یہ شخص مخالفت کر کے طاعات سے محروم رہے۔ اس لئے محقق مخالفت میں بھی غلو نہیں کیا کرتا، اگر اس وقت حضرت معاویہؓ تہجد نہ پڑھتے تو ظاہر ہے کہ یہ عمداً ناغہ ہوتا اور اس پر وہ رنج وافسوس بھی نہ ہوتا، جو غلبۂ نیند پر ناغہ ہونے پر ہوا کرتا ہے تو رنج وغم سے جو ترقی ہوتی وہ اب نہ ہوتی اور تہجد کا وقت پا کر اُسے بھی فوت کر دیتے تو نقصان ہی نقصان تھا، نفع کچھ نہ ہوتا، اس لئے انھوں نے تہجد پڑھ لیا یہی تو بات

ہیں جن کی وجہ سے حدیث میں آتا ہے فَقِیْہٌ وَاحِدٌ اَشَدُّ عَلَی الشَّیْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ
ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابدوں سے زیادہ بھاری ہے یہ مراد فقیہ النفس ہے جو احکام
کے ساتھ نفس و شیطان کے مکائد سے بھی عارف ہو، اور سلف کی اصطلاح میں فقہ
محض علم ظاہر کے ساتھ مختص نہ تھا، بلکہ علم باطن بھی اس میں داخل تھا۔ چنانچہ
امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے فقہ کی تعریف مَعْرِفَۃُ النَّفْسِ مَالَھَا وَمَا عَلَیْھَا منقول
ہے جس میں علم اخلاق و سلوک بھی داخل ہے کیونکہ معرفۃ النفس مالہا وما علیہا
اس کو بھی شامل ہے، پس حدیث میں فقہ کے وہی معنی ہیں جو سلف میں متعارف تھے
نہ وہ معنی جو متاخرین کی اصطلاح ہے۔ فقیہ ظاہر تو ہجوم وساوس سے ذکر اور تلاوت
قرآن کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس سے شیطان اپنے مقصود میں کامیاب ہو جاتا ہے، مگر فقیہ
باطن کہتا ہے کہ اس حالت میں کام کو ہرگز نہ چھوڑے بلکہ کام میں لگا رہے چاہے کتنے
ہی وسوسے آئیں، کچھ پروا نہ کرے، اور وساوس سے ہرگز پریشان نہ ہو، نہ اُن کے دفع
29 کی کوشش کرے، اور نہ از خود اُدھر متوجہ ہو بلکہ اپنی توجہ کو ہمت کے ساتھ ذکر وغیرہ
میں مشغول کرے اور وساوس سے بے توجہی اور بے التفاتی برتے، ان شاء اللہ چند
روز میں خود ہی سب وسوسے جاتے رہیں گے، اور شیطان اپنی مراد میں ناکام ہو کر خود ہی
پیچھا چھوڑ دے گا، بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر کسی وقت غیب سے بھی کوئی خطاب
پریشانی کا قلب پر وارد ہو اس سے بھی پریشان ہو کر کام کو نہ چھوڑے، کیوں کہ
کبھی غیب سے بطور امتحان کے کوئی بات کہدی جاتی ہے، کہ دیکھیں یہ شخص درجات
کے لئے عمل کر رہا ہے یا محض ہماری محبت میں کام کر رہا ہے، اس وقت کامیابی
کا طریقہ یہی ہے کہ عمل کو ہاتھ سے نہ دے، اور بدستور اپنے کام میں لگا رہے۔ چنانچہ
ایک بزرگ کو ذکر کے وقت غیب سے یہ آواز آتی تھی کہ تو کافر ہو کر مرے گا چاہے
کچھ ہی کر، وہ بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کیا معاملہ ہے، چونکہ یہ عارف تھے اس لئے
یہ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ آواز شیطان کی نہیں ہے بلکہ غیب ہی کی آواز ہے، اس
لئے پریشانی زیادہ تھی، قسمت سے اُن کے شیخ اس وقت زندہ تھے گھبرائے ہوئے شیخ

کے پاس گئے، واقعی شیخ بھی بڑی نعمت ہے سالک چاہے کتنا ہی کامل ہو جائے، مگر شیخ کی احتیاج فی الجملہ باقی رہتی ہے، کامل کو بھی بعض دفعہ ایسی حالت پیش آتی ہے جس کو وہ خود حل نہیں کر سکتا، اس وقت شیخ ہی امداد کرتا ہے، چنانچہ انھوں نے اپنے شیخ سے اس حالت کو بیان فرمایا، فرمایا کام میں لگے رہو اور اس آواز سے پریشان نہ ہو، یہ دشنامِ محبت ہے، معشوقوں کا قاعدہ ہے کہ عاشقوں کو بعض دفعہ نازو انداز سے یوں ہی پریشان اور تنگ کیا کرتے ہیں، سبحان اللہ واقعی شیخ محقق تھا، کیا قیمتی بات کہی کہ یہ دشنامِ محبت ہے، غور کیجئے کہ طالب کی اس جواب کو سنکر کیا حالت ہوئی ہوگی، بس اب تو وہ محبوب حقیقی سے یوں کہتا ہوگا ؂

بدم گفتی و خرسندم عفاک اللہ نکو گفتی ؎ جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعلِ شکر خارا

"تو نے مجھے برا کہا مگر میں خوش ہوں، تیرے لب کے لئے جواب تلخ تلخ ہی بہتر ہے"

اور شیخ کو اس طرح دعائیں دیتا ہوگا ؂

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی ؎ مرا با جانِ جاں ہمراز کردی ۳۰

"اللہ تعالیٰ تجھے جزائے خیر دے کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں اور میرا محبوب حقیقی سے تعلق پیدا کر دیا"

اور شیخ کے پاس سے یہ کہتا ہوا لوٹا ہوگا ؂

از درِ دوست چہ گویم بچہ عنواں رفتم ؎ ہمہ غم آمدہ بودم ہمہ شاداں رفتم

"دوست کے دروازہ پر ہم کس حال میں گئے تھے سب غمگین گئے تھے سب خوش و خرم واپس لوٹے"

اور یوں کہتا ہوگا ؂

دوش وقتِ سحر از غصہ نجاتم دادند ؎ واندراں ظلمتِ شب آبِ حیاتم دادند (جامی)

"کل رات صبح کے وقت غم و غصہ سے مجھ کو نجات دی، رات کی اندھیری میں مجھ کو حیات نو بخشی"

باقی یہ کہ دشنامِ محبت کذب تو نہ ہو اور خوش خاتمہ کو بدخاتمہ کہنا تو کذب جواب یہ ہے کہ قرآن میں مومن کو کافر بالطاغوت کہا گیا ہے، ممکن ہے کہ معنی اس وارد کے یہ ہوں گے کہ تو مومن ہو کر مرے گا خواہ تجھ سے کوئی معصیت صادر

ہو جاوے جیسے حدیث میں ہے اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ (جو عمل چاہو کرو، میں نے تمھیں بخش دیا) تو دیکھئے غیر محقق تو شیطانی خطرات سے بھی پریشان ہو جاتا ہے اور محقق عالمِ بالا کے دل شکن خطابات سے بھی پریشان نہیں ہوتا، وہ ان کو بھی دشنامِ محبت سمجھ کر اپنے کام میں لگا رہتا ہے، اور میں کہتا ہوں کہ اگر وہ دشنامِ محبت بھی نہ ہو بلکہ ظاہری پر محمول ہو تب بھی عمل کو ترک نہ کرنا چاہئے، کیونکہ اگر یہ عمل کی حالت میں کافر ہوگا تو بدون عمل کے تو اَکفر ہوگا، پھر ترکِ عمل سے فائدہ کیا، صاحب اگر وحیِ قطعی سے بھی کفر پر خاتمہ ہونے کا علم ہو جائے جب بھی عشق کا مقتضے یہ ہے کہ محبوب سے تعلق محبت کو ترک نہ کرے بلکہ محبت میں ثابت قدم رہے ؎

ورنہ شاید بدست رہ بردن ؏ شرطِ عشق است در طلب مُردن

عاشقانِ مجازی میں بھی جو سچے عاشق ہیں انھوں نے ایسا کر کے دکھلا دیا ہے، مجنوں کو لیلیٰ سے محبت تھی مگر لیلیٰ کے باپ نے اس کی شادی دوسرے شخص سے کر دی جب مجنوں کو یہ خبر پہونچی تو کہنے لگا ؎ ۳۱

وما اکثر الاخبار ان قد تزوجت ؏ فھل یاتینی بالطلاق بشیر

اور مرتے دم تک باوجود وصال سے ناامیدی کے محبت وعشق پر ثابت قدم رہا ۱۲ جامع)

بوستان میں ایک بزرگ کی حکایت لکھی ہے کہ ایک رات وہ تہجد کے لئے اٹھے، تو غیب سے آواز آئی کہ یہاں کچھ قبول نہیں چاہے کتنا ہی کر، اور یہ آواز اتنے زور سے آئی کہ ایک مُرید نے بھی سُن لی، مگر وہ بزرگ اللہ کے بندے وضو کر کے تہجد میں مشغول ہو گئے، اگلا دن ہوا تو پھر حسبِ معمول تہجد کو اٹھے، مرید نے کہا حضرت ایسی بھی کیا بے غیرتی ہے کہ وہ تو دھکے دیں اور آپ پھر بھی لپٹتے ہیں، جب وہاں کچھ قبول ہی نہیں تو آپ خواہ مخواہ اپنی راحت میں کیوں خلل ڈالتے ہیں؟ یہ سنکر بزرگ رونے لگے اور فرمایا بیٹا یہ تو بتلاؤ کہ اس دروازہ کو چھوڑ کر میں جاؤں کہاں، اس لئے کہ کوئی اور بھی تو نہیں جہاں ان کو چھوڑ کر چلا جاؤں، بس میرا تو یہی ایک در ہے اور اب یہ ہے، اس دیدوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں انھیں اختیار ہے سجدے کرتے ہوئے شیخ

توانی ازاں دل بپرداختن ٭ کہ دانی کہ بے او تواں ساختن

"اس شخص سے دل کیسے خالی کر سکتے ہو جس کے متعلق معلوم ہو کہ بغیر اس کے گذر کر سکتے ہو"

بس اس پر دریائے رحمت کو جوش آگیا، اور پھر آواز آئی ؎

قبول ست گرچہ ہنر نیستت ٭ کہ جز ما پناہے دگر نیستت

"قبول ہے اگرچہ کمال کی کوئی بات اس میں نہیں سوائے اس بات کے کہ تو نے یہ کہدیا کہ ہمارے سوا پناہ کی کوئی دوسری جگہ نہیں"

کہ جاؤ قبول کر لیا مگر اس کے ساتھ ایک جز کہ بھی لگادیا کہ گو ہنر تو کچھ نہیں مگر ہم کو رحم آتا ہے اس لئے قبول کر لیا کیونکہ تیرا ہمارے سوا کوئی ٹھکانا نہیں،

تو صاحبو! اہل اللہ تو اس حالت میں بھی کہ صاف صاف غیب سے مردود کر دیا جائے عمل کو نہیں چھوڑتے پھر حیرت ہے کہ ہم ذرا ذرا سی مصیبت یا ہجوم وساوس سے عمل کو ترک کر دیں، پس اب میں ختم کرتا ہوں، خلاصہ سارے بیان کا یہ ہوا کہ ناگوار واقعات میں جس صبر کی ہم کو تعلیم کی گئی ہے اس کی حقیقت امتثالِ امر ہے اور مامور بہ ماعلیہ الصبر ہے، ۴۲
پس ایسی حالت میں ہم کو احکام پر مستقیم رہنا چاہیے اور عمل میں خلل نہ ڈالنا چاہیے اور عمل میں مقصود پر نظر رکھنی چاہیے جو کہ رضا حق ہے، اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہماری مدد فرمائیں کیونکہ بدون ان کی امداد کے نرے علوم ومجاہدات سے کچھ نہیں ہو سکتا، جو کچھ ہوتا ہے ان کی عنایت ہی سے ہوتا ہے ؎ ایں ہمہ گفتیم لیک اندر بسیچ ٭ بے عنایاتِ خدا ہیچیم ہیچ

(یہ سب جو کچھ ہم نے کہا بغیر حکم خداوندی ہم ہیچ ہیں اور کچھ نہیں کہہ سکتے)

بے عنایاتِ حق وخاصانِ حق ٭ گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

"بغیر حکم خداوندی اور خاصانِ خدا کی عنایت کے اگر فرشتہ بھی ہو تو اس کا ورق بھی سیاہ ہے"

حق تعالیٰ ہم کو فہم سلیم عطا فرمائیں، اور عمل کی ہر حال میں توفیق دیں، آمین،

وَصَلَّى اللهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ٭ تمت